ذکرِ نبی ﷺ اُردو ادب میں

ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی

تہذیب و ترتیب
ڈاکٹر داؤد عثمانی

ذکرِ نبیؐ اردو ادب میں

ذکرِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اردو ادب میں

ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی

تہذیب و ترتیب

ڈاکٹر داؤد عثمانی

BOOKS GIVE US WINGS
NATIONAL BOOK FOUNDATION

نیشنل بک فاؤنڈیشن

اسلام آباد

NATIONAL BOOK FOUNDATION
کم قیمت اور معیاری علمی و ادبی و نصابی کتب کی اشاعت کا قومی ادارہ
BOOK REVOLUTION



نام کتاب : ذکرِ نبی اُردو ادب میں
ترتیب و تہذیب : ڈاکٹر داؤد عثمانی

اشاعت : جون، 2020ء
تعداد : 1000
کوڈ نمبر : GNU-787
آئی ایس بی این : 978-969-371176-9
طابع : نیلاب پرنٹرز، راولپنڈی
قیمت : -/220 روپے

نیشنل بک فاؤنڈیشن کی دیگر مطبوعات کے بارے میں معلومات کے لیے رابطہ:
ویب سائٹ: http/www.nbf.org.pk فون: 92-51-9261125
ای میل: books@nbf.org.pk

NBF

فہرست

سیرت کی نثری کتب پر مضامین

پیش گفتار

نیشنل بک فاؤنڈیشن کا موجودہ سلسلۂ اشاعتِ کتب نئی منصوبہ بندی کے تحت عوام الناس کے پسندیدہ موضوعات کی معیاری و مفید کتب قارئین کی استطاعت کے مطابق رکھی گئی قیمت پر فراہم کرنے میں کامیاب دکھائی دیتا ہے۔ زیرِ نظر کتاب ''ذکرِ نبی ﷺ اُردو ادب میں'' اسی سلسلے کی ایک اہم اور قابلِ توجہ کڑی ہے جو نامور استاد و محقق اور دانش ور ڈاکٹر ابوالخیر کشفی کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔

ڈاکٹر ابوالخیر کشفی کا شمار نام ور اساتذہ، محققین اور تجزیہ کاروں میں ہوتا ہے۔ نعت گوئی میں سیرت نگاری ایک اہم موضوع ہے اور اس موضوع پر دسترس انھیں اُن کے زمانۂ علمی سے ہی تحریروں، تقریروں اور تحقیق و تفریظات کی شکل میں حاصل رہی۔ اس کتاب میں سیرت النبیؐ کے حوالے سے ڈاکٹر ابوالخیر کشفی نے تحقیق و جستجو کے تمام حوالوں اور جہتوں کو کھنگالا ہے۔

امید ہے یہ کتاب ایک اہم موضوع، اپنے تحقیقی مواد اور سلیس و رواں اسلوبِ تحریر کے باعث اہلِ نظر، محققین اور اساتذہ و طلبہ کی توجہ حاصل کرے گی اور وہ اس سے بھرپور استفادہ کریں گے۔

مینیجنگ ڈائریکٹر

احوالِ واقعی

استادِ محترم ڈاکٹر سید محمد ابوالخیر کشفی کے وصال کے بعد راقم الحروف کو آپ کے تحریر کردہ نعتیہ مقدمات اور پیش لفظ کو کتابی صورت میں یک جا کرنے کا خیال آیا۔اس سلسلے میں جب تحریروں کی تلاش شروع کی تو استادِ محترم کے کاغذات میں سے کچھ کمپوز شدہ مقدمے اور پیش لفظ ملے جنھیں دیکھ کر مسرت ہوئی کہ آپ بھی ان تحریروں کو کتابی صورت میں لانا چاہتے تھے۔انھی کمپوز شدہ مضامین میں ایک تحریر ''پیش گفتار'' کے عنوان سے تھی جسے پڑھ کر اندازہ ہوا کہ یہ اِسی کتاب (ذکرِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اردو ادب میں) کا ابتدائیہ ہے جس کے یہ کمپوز شدہ صفحات ہیں۔''پیش گفتار'' میں اس بات کا بھی ذکر تھا کہ یہ کتاب ۱۹۹۳ء میں مکمل کر کے اشاعت کے لیے دی جا چکی تھی لیکن خدا جانے کیوں شائع نہ ہو سکی۔''پیش گفتار'' پڑھ کر ۱۹۹۹ء میں شائع ہونے والے استادِ محترم کے نعتیہ مجموعے ''نسبت'' کی پشت پر شائع کردہ وہ اشتہار یاد آ گیا۔جس میں تحریر تھا کہ:

''ذکرِ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

اردو ادب میں

سید ابوالخیر کشفی کی یہ کتاب

اردو میں نعت گوئی اور سیرت نگاری

کا تنقیدی جائزہ ہے

ان شاءاللہ ربیع الاول ۱۴۲۱ھ

میں شائع ہوگی۔''

''پیش گفتار'' کی روشنی میں یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ یہ کتاب دوسری بار

۱۴۲۱ھ میں اشاعتی مرحلے میں داخل ہو چکی تھی (اللہ بہتر جانے کیوں شائع نہ ہو سکی۔ ویسے اللہ تعالیٰ نے ہر کام کا وقت مقرر فرما دیا ہے)

اللہ کریم کا کرم ہے کہ آج پچیس سال بعد بیس برس پرانے ''پیش گفتار'' کے ساتھ ''ذکرِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اردو ادب میں'' ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ آج سے سات سال پہلے راقم الحروف نے اپنی مرتب کردہ کتاب ''نعت شناسی۔ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی'' کے ''پیش نامے'' میں ''پیش گفتار'' کو شامل کرتے ہوئے لکھا تھا کہ:

''گم شدہ صفحات مل گئے تو ان شاء اللہ اگلی کتاب استادِ محترم کے دیگر نعتیہ مقدموں، پیش لفظ اور تقاریظ کے ساتھ اسی پیش گفتار کے ساتھ شائع ہوگی۔''

سات سال بعد عاکف بھائی کو پرانے کاغذات میں سے نہ صرف کمپوز شدہ چند مقدمے اور پیش لفظ ملے بلکہ کتاب کا سرِ ورق بھی دستیاب ہوا جو اُس زمانے میں عاکف بھائی نے اس مجموعے کے لیے تیار کرایا تھا، اور جو اس وقت آپ کی نظروں کے سامنے ہے۔ ان مضامین کو از سرِ نو کمپوز کرانے کے بعد انھیں کتاب میں اسی ترتیب میں رکھا گیا ہے جس طرح کی ترتیب استادِ محترم چاہتے تھے۔ دورانِ ترتیب وہ تمام مقدمے، پیش لفظ و تقاریظ وغیرہ، جو استادِ محترم نے کبھی نعتیہ مجموعوں پر لکھی تھیں، تلاش کر کے (جہاں تک ممکن ہو سکا) انھیں بھی شاملِ کتاب کر دیا گیا ہے اور ممکنہ طور پر زمانی ترتیب کو مدِ نظر رکھا گیا ہے۔ اس کے علاوہ فہرست میں مضامین کے عنوانات کے سامنے قلابین [ ] میں اُن اہلِ قلم کے نام درج کر دیئے گئے ہیں جن کے بارے میں کشفی صاحب نے قلم اُٹھایا ہے۔ ترتیب میں اضافہ ہے تو صرف اتنا کہ سیرت کی نثری کتب پر آپ کے جو مضامین ہیں۔ انھیں بھی آخر میں شامل کر دیا ہے تا کہ سیرت کے حوالے سے نظم و نثر دونوں میں جو کام استادِ محترم کے پیشِ نظر رہا اس پر ان کے خیالات سے آگاہی حاصل ہو سکے۔

آخر میں ان دوست احباب کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گا جن کے ذریعے کتاب اشاعتی مرحلے تک پہنچی۔ ان میں بھائی صبیح رحمانی اور برادرِ عزیز ڈاکٹر سید عزیز الرحمٰن، جو ذریعہ بنے ان

کتابوں تک رسائی کا جن میں استادِ محترم کی تحریریں شامل تھیں ۔ بقول استادِ محترم ''پروف پڑھنا ایک بڑا کٹھن ...... بے رس اور تھکا دینے والا کام [ہے]'' اور اس کتاب کے لیے یہ کام بھائی ڈاکٹر محمد طاہر قریشی نے سرانجام دیا۔ کمپوزنگ کی خدمات عزیزی محمد فیصل کے ذمے رہیں ان کا شکریہ اور بھائی ڈاکٹر سہیل شفیق کا بھی شکریہ جو کتاب کی اشاعت کے لیے ہمیشہ فکر مند اور دعا گو رہے۔۔۔۔۔ اور امّی (بلقیس شاہین) کا خاص طور پر شکریہ کہ ان کی توجہ اور دعائیں ہر موڑ پر شاملِ کار رہیں۔ آخر میں جن کا شکریہ ادا کرنا ہے ان کا استادِ محترم بیس سال پہلے ان الفاظ میں ادا کر چکے ہیں:

''اپنے بیٹے سید ابو احمد عاکف سلمہٗ کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں، جس کے توجہ دلانے پر میں اپنے تحریری کام کو جمع کر رہا ہوں۔''

آج یہ کتاب انھی کی بدولت اشاعت کے مراحل طے کر کے ہمارے ہاتھوں میں ہے۔

اللہ ان سب کو اجرِ عظیم کے ساتھ ہمیشہ اپنی رحمتوں کے سائے میں رکھے۔ آمین!

ڈاکٹر داؤد عثمانی

دیباچہ

اردو میں نعت اور نعت گوئی کے بارے میں کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں، اگر چہ بیشتر کتابوں میں تاریخی ترتیب سے شعراء کا حال اور کلام جمع کر دیا گیا ہے اور ''رواں تبصرہ'' سے آگے بات نہیں بڑھی ہے، مگر یہ مقام شکر ہے کہ ہمارے شاعروں کے ساتھ ساتھ ہمارے نقاد بھی نعت کی طرف متوجہ ہوئے ہیں، ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو میں نعت گوئی کے رجحانات کا جائزہ لیا جائے اور عہد حاضر میں نعت گوئی کی مقبولیت کا تجزیہ کیا جائے۔

نعت گوئی کے علاوہ اردو میں سیرت نگاری بھی مطالعہ کا اہم موضوع ہے۔ راقم الحروف نے ۱۹۶۸ء میں اردو سیرت نگاری کا ایک مختصر جائزہ تحریر کیا تھا جو ڈاکٹر نثار احمد صاحب کی مرتب کردہ کتاب ''نقش سیرت'' میں شائع ہوا تھا۔ اس وقت تک میری نظر سے ایسا کوئی جائزہ نہیں گزرا تھا۔ ''سیارہ'' لاہور کے حالیہ شمارے سے معلوم ہوا کہ اب اس موضوع پر بھی ایک کتاب شائع ہو گئی ہے جو پی ایچ۔ ڈی۔ کا تحقیقی مقالہ ہے۔

الحمد للہ سیرت النبی رسول اکرم ﷺ سے متعلق میری تحریر و تقریر کا آغاز میرے بچپن ہی میں ہوا۔ اپنے اسکول کے علاوہ ربیع الاول کے موقع پر پریڈ گراؤنڈ کانپور میں ہزاروں کے مجمعے میں حضور سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حیات طیبہ پر تقریر کرتا، کبھی اردو میں، کبھی فارسی میں اور مقامی اخباروں میں مضامین لکھتا۔ لکھنے کے سلسلے میں مولانا محمد اسمٰعیل ذبیح، خواجہ عبدالسلام اور صہبائی صاحب کی حوصلہ افزائی کو میں تشکر کے جذبات کے ساتھ یاد کرتا ہوں۔ نعت پر میری تحریروں کا باضابطہ آغاز ۱۹۶۶ء میں ''نقش سعادت'' کے حرف آغاز سے ہوا اور الحمد للہ یہ سلسلہ پھر نہیں ٹوٹا۔ نقش سعادت اردو کی نعتیہ شاعری کا ایک مختصر انتخاب تھا جو ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا۔ میں نے

تاریخی ترتیب سے یہ مجموعہ مرتب کیا تھا اور اپنی نوعیت کا پہلا انتخاب تھا۔ پھر الحمدللہ ایسے انتخابات کا چلن عام ہو گیا اور اس سلسلے کا بہت مفصل، اچھا اور مقبول ترین مجموعۂ انتخاب شفیق بریلوی مرحوم کا ''ارمغان نعت'' ہے۔ اللہ مرحوم کے درجات کو بلند فرمائے۔

یہ اللہ کے احسانات میں سے ایک بڑا احسان ہے کہ اس نے اس فقیر کو ممتاز پاکستانی شعرا کے نعتیہ مجموعوں پر مقدمے اور پیش لفظ لکھنے کا موقع عطا فرمایا۔ یوں مجھے کائنات کے فصیح ترین انسان ﷺ کے ذکر مبارک میں شرکت کی سعادت حاصل ہوئی۔ اس کتاب میں ان مقدموں اور بعض مختصر تحریروں (تقریظوں) کو یکجا کیا گیا ہے۔ بعض مقدمے کتاب کی ترتیب کے وقت نہیں مل سکے۔ ان شاء اللہ انھیں اگلی کتاب میں ان دوسرے نعت گو شعرا کے مجموعوں پر مضامین کے ساتھ شائع کیا جائے گا جن پر لکھنا میری تمنا ہے۔ ایسے شعرا میں جناب عبدالعزیز خالد، جناب حفیظ تائب، جناب اقبال عظیم، جناب حافظ لدھیانوی، جناب عاصی کرنالی اور جناب مظفر وارثی شامل ہیں۔

اس مجموعے میں اردو سیرت نگاری سے متعلق میرا مضمون شامل ہے۔ مضمون کا ایک مختصر تکملہ بھی تحریر کر دیا ہے۔ جس میں ۱۹۶۸ء کے بعد سیرت پر شائع ہونے والی کتابوں کے نام درج کر دیئے گئے ہیں۔ مجھے احساس ہے کہ ان کتابوں کے ساتھ انصاف نہیں ہوا ہے اور بعض اہم کتابوں کے نام بھی شامل نہیں کیے جا سکے۔ میں اُنھی کتابوں کے نام شامل کر سکا جو میرے پاس موجود تھیں یا اپنے دوست اور بھائی پروفیسر حسنین کاظمی سے مل سکیں۔

اس کتاب میں اسلامی معاشرے میں شاعری کی حیثیت اور اردو میں نعت گوئی کی روایت ور جحانات کے بارے میں ایک مضمون بھی شامل ہے جو میری دو تقریروں کی بنیاد پر کاغذ پر منتقل کیا گیا ہے۔ ان تقریروں کو مضمون کی شکل میری نصف بہتر بلقیس شاہین نے دی ہے۔ اللہ انھیں اس کی جزا دے۔ اس مضمون سے ان شعرا کا قدرے تفصیلی ذکر اور کلام حذف کر دیا گیا ہے جن پر اس مجموعے میں مضامین شامل ہیں۔ ایسے شعرا کا نام اور حوالہ ضرور موجود ہے۔ میں اپنے بیٹے سید ابواحمد عاکف سلمہ، کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جس کے توجہ دلانے پر میں اپنے تحریری کام کو جمع کر رہا

ہوں۔ اس خاک داں میں اپنے قیام کے بارے میں کوئی بھی کچھ نہیں کہہ سکتا، مگر وہ شخص جو زندگی کے اٹھاون سال مکمل کر چکا ہو اس پر لازم ہے کہ آنے والی زندگی کی طرف زیادہ توجہ دے۔

ان مضامین اور مقدموں کو بلقیس نے جناب مسرور کیفی کے تعاون سے جمع کیا ہے۔ میرے پاس وہ سارے مجموعے نہیں جن کے ساتھ میری تحریریں شامل تھیں۔ مسرور بھائی نے نعتیہ مجموعوں کا اچھا ذخیرہ جمع کیا ہے۔ بلقیس نے کہیں کہیں، نظر ثانی کی ضرورت محسوس کی ہے لیکن میرا خیال یہی تھا کہ یہ مضامین جس طرح نعتیہ مجموعوں کے ساتھ شائع ہوئے اس کتاب میں اسی طرح چھاپے جائیں۔ اب مجھے نہیں معلوم کہ کتاب کو ترتیب دینے والی ذات نے یہ مشورہ کس حد تک مانا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ہر کام کا وقت مقرر فرما دیا ہے۔ اس کتاب کے مضامین کی کمپوزنگ لاہور میں کرائی گئی تھی مگر یہ سلسلہ ٹوٹ گیا۔ کمپوزنگ کے بعد تصحیح اور دوسرے کام نہ کرائے جا سکے۔

اور پھر ۱۹۹۲ء میں مشتاق احمد قریشی صاحب نے اس کام کو اپنے ذمے لیا۔ مضامین کی ازسرِنو کمپوزنگ کرائی، کاپیاں جوڑیں اور سارے کام کی تکمیل کر دی۔ اب دیکھیے کہ عزیز گرامی جناب فضل ربّی ندوی اس کی اشاعت میں کتنا وقت لیتے ہیں۔

ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی

(۸ ربیع الاول ۱۴۱۱ھ مطابق ۲۷ ستمبر ۱۹۹۰ء)

اردو میں سیرت نگاری

(۱)

''زبانوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ زبانیں انسان کی سماجی ضرورتوں کی پیداوار ہوتی ہیں۔'' یہ قول زبانوں کی پیدائش اور آغاز کے متعلق تو درست ہے۔ سماجی ضرورتوں کی حد تک بھی اسے تسلیم کرنے میں مضائقہ نہیں لیکن علمی سطح پر یہ بات نیم صداقت سے زیادہ نہیں۔ زبانیں مخصوص حالات، مذہبی اور سماجی تصورات اور تاریخ کے مخصوص ادوار میں علمی سطح تک پہنچتی ہیں اور اس عمل میں وہ کسی ایک یا زیادہ ادیان کے تصورات و افکار کی آئینہ دار اور ترجمان بن جاتی ہیں۔ آج انگریزی بین الاقوامی زبان ہونے کے باوجود عیسائیت کی روایات کی امین ہے۔ اچھے آدمی کی تصویر اس زبان میں ''کرسچین جنٹل مین'' کے الفاظ میں ملتی ہے۔ عبرانی صرف اسرائیل کی نام نہاد ریاست کی سرکاری زبان ہی نہیں بلکہ صیہونی تحریک کی علامت بھی ہے۔ سنسکرت اور اس کے عناصر کا پرچار ہندوستان کی ''سیکولرازم'' کی پردہ دری کرتا ہے۔ اسی طرح عربی زبان محض عرب ممالک تک ہی محدود نہیں بلکہ دنیائے اسلام کے درمیان ایک قوی اور زندہ رابطہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ قرآن حکیم اور احادیث کے مطالعہ کی ضرورت نے اسے سارے مسلمانوں کی زبان بنا دیا ہے۔

> اردو زبان برصغیر پاک و ہند میں پیدا ہوئی اس کی تعمیر و ترقی میں ہندوؤں اور دوسرے مذہب والوں کا بڑا حصہ ہے۔ ہماری ادب کی کوئی تاریخ رتن ناتھ سرشار، دیا شنکر نسیم، پریم چند، فراق، کرشن چندر اور بیدی وغیرہ جیسے فن کاروں کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔ اس کے باوجود اس حقیقت کو بھی نہیں جھٹلایا جا سکتا کہ اردو زبان مسلمانوں

کے ثقافت وتمدن اور دینی افکار کی امین ہے۔ان افکار کے اثرات غیر مسلم ادیبوں کے یہاں بھی بہت نمایاں ہیں جنھوں نے فکری اور تمدنی طور پر مسلمانوں کی فوقیت کو تسلیم کرلیا تھا۔ مثال اور ثبوت کے طور پر صرف فسانۂ آزاد کو پیش کردینا کافی ہے۔ اردو شاعری کے مزاج کے تعین میں ہمارے ایک نقاد نے ''دھرتی'' کو بڑی اہمیت دی ہے اور وہ یہ بھول گئے کہ اس دھرتی پر اردو کا بیج لگانے والی جس جماعت کو فریقِ غالب کی حیثیت حاصل ہے۔وہ اپنے تصورات وافکار کی ایک دنیا لے کر یہاں آئی تھی۔ ہمارے ادب میں گنگا کی موج کی نرم روی بھی ہے، لیکن گیسوئے دجلہ وفرات کی تابداری زیادہ نمایاں ہے۔ بسنت رت کا روپ ہے مگر بہار کی جلوہ سامانی اس پر غالب ہے۔انسانی وجود زبان میں ڈھل جاتا ہے زبان فرد کی ملکیت ہے لیکن اسی کے ساتھ ساتھ یہ وہ رشتہ اور سلک بھی ہے جو معاشرہ کو قائم کرتی ہے اور قائم رکھتی ہے۔ (۱)

دکن کے دور اول سے لے کر عہد حاضر تک اردو ادب کی تاریخ میں اسلامی افکار کی اہمیت واولیت ہر جگہ نمایاں ہے۔دکن کے ادیبوں اور شاعروں سے لے کر ہمارے دور تک اسلام سے متعلق بے شمار کتابوں کے ترجمے بھی اردو میں ہوئے اور لاتعداد تخلیقی اور طبع زاد کتابیں بھی لکھیں گئیں ،ان میں ایسی کتابیں بھی شامل ہیں جو صرف مذہبی ادب کے زیرِ عنوان ہی نہیں آئیں بلکہ ہمارے مجموعی ادب کا قیمتی حصہ ہیں۔ سرسید، حالی، شبلی، اور نذیر احمد اردو کے اکابر اور معمار ہیں۔ان کی بیشتر تحریریں مذہبی جذبہ کی تخلیق ہیں۔شاعری میں حالی واقبال اور ان کے مقلدوں نے مذہبی حساسات کو شاعرانہ جذبہ کی معراج تک پہنچادیا۔اردو میں قرآن حکیم کے تراجم کا جو سلسلہ حضرت شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین صاحبان سے شروع ہوا، وہ آج بھی جاری ہے۔احادیث کے تمام معتبر مجموعوں اور تاریخ اسلام کی قابلِ ذکر کتابوں کو اردو میں منتقل کیا جاچکا ہے۔انیسویں صدی کے نصف آخر سے اسلام کے مختلف پہلوؤں پر جتنا کام اردو زبان میں ہوا ہے اور عہدِ حاضر کے تقاضوں کو جس طرح اسلام کی تعلیمات کی روشنی میں پورا کرنے کی کوشش ہمارے اربابِ فکر وقلم نے کی ہے اس پر

خود عربی زبان بھی رشک کرتی ہے۔

حضور ختم المرسلین ﷺ کی حیاتِ طیبہ اور پیغام پر اردو زبان میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان کا اندازہ قاموس الکتب کی جلد اول (مرتبہ مفتی انتظام اللہ شہابی مطبوعہ انجمن ترقی اردو پاکستان) سے ہوسکتا ہے، اگر چہ یہ فہرست بھی مکمل نہیں ہے۔ اس قاموس کے مطابق ۱۹۶۱ء تک اردو میں سیرت النبی پر ۴۰۵ کتابیں، میلاد النبی پر ۲۳۴ کتابیں مبشرات پر ۱۸ کتابیں، حضور کے نسب پر ۶ کتابیں، شمائل پر ۳۰ کتابیں، خصائص وفضائل پر ۱۴ کتابیں، اخلاق النبی پر ۱۶ کتابیں، معجزات پر ۴۴ کتابیں اور صلوٰۃ وسلام سے متعلق ۱۳ کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ اس فہرست اور تقسیم سے سیرت نگاری کے دائروں اور بدلتے ہوئے رجحانات کا بھی اندازہ ہوسکتا ہے۔ اگر چہ اس تقسیم سے متفق ہونا ضروری نہیں۔ اردو میں سیرت النبی اور رحمۃ للعالمین جیسی مفصل کتابیں بھی ہیں اور کسی ایک موضوع کے متعلق مختصر کتابچے بھی جیسے ''آنحضرتؐ اور جوانی'' ایسی کتابیں بھی ہیں جن میں سیرتِ رسول اللہ کے سارے بنیادی مباحث پر گفتگو کی گئی، خواہ ان سے مکمل طور پر اتفاق نہ کیا جائے، مثلاً معراج اور ایسے جائزے جن میں حضور ﷺ کے کردار اور حسیت انسانی کے لیے اس کی اہمیت کے نقوش کو ابھارا گیا ہے۔ ''خطباتِ مدارس'' کو اپنی ترتیب اختصار اور تکمیل کے لحاظ سے ایسے جائزوں کی نمائندگی کے لیے چنا جاسکتا ہے۔ بعض اہل قلم نے افسانوی اور تخلیقی انداز میں حضور ﷺ کی سیرت کو پیش کیا ہے۔ اس طبقہ میں مولانا عبدالحلیم شرر، احسان بی۔ اے اور ماہر القادری کے نام ممتاز ہیں۔

اس مختصر سے جائزے میں موضوع کے ساتھ پورا انصاف نہیں کیا جاسکتا، اس کی وجہ صفحات کی تنگ دامانی کے علاوہ یہ بھی ہے کہ جملہ کتابیں راقم الحروف کی نظر سے نہیں گزری ہیں۔ اس صورت میں مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اہم کتابوں کی فہرست دینے کے بعد اہم تر اور زیادہ مقبول کتابوں کے بارے میں اختصار کے ساتھ کچھ عرض کر دیا جائے۔ کتابوں کے سلسلے میں مصنفین کے دور یا سالِ اشاعت کی تقدیم وتاخیر کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ اس فہرست سے یہ اندازہ بھی ہوسکے گا کہ

نبی اکرم ﷺ کے عقیدت مندوں میں ہندو اور سکھ مصنف بھی شریک ہیں۔اس جائزے کا آغاز ہم نے دورِ سرسید سے کیا ہے۔ایک مصنف کی کتابیں ایک ساتھ درج کی گئی ہیں:

۱۔ سرسید احمد خان: جلاء القلوب بذکر المحبوب، خطباتِ احمدیہ ۱۸۸۷ء

۲۔ مولانا حالی: مولود شریف (۱۸۶۴)

۳۔ عبدالحلیم شرر: جویائے حق اور تاریخِ اسلام حصہ اول کا نصف اوّل

۴۔ شبلی نعمانی: سیرت النبی جلد اول و دوم حیات النبی ﷺ

۵۔ سید سلیمان ندوی: سیرت النبی ﷺ جلد سوم تا ششم، رحمتِ عالم ﷺ، رسول اکرم ﷺ، خطباتِ مدارس

۶۔ قاضی محمد سلیمان منصور پوری: مُہرِ نبوت۔سید البشر۔رحمۃ للعالمین

۷۔ مولانا راشد الخیری: آمنہ کا لال

۸۔ خواجہ حسن نظامی: اسلامی رسول (رسالہ منادی کا سالنامہ ۱۹۲۴ء) سیرت النبی ﷺ

۹۔ مولانا اشرف علی تھانوی: نشر الطیب فی ذکر النبی الحبیب (حبیب خدا)

۱۰۔ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی: ذکرِ مبارک۔ذکر حبیب۔ذکر جمیل

۱۱۔ مولانا ابوالکلام آزاد: ذکریٰ۔رسول عربی ﷺ

۱۲۔ میرزا حیرت دہلوی: سیرت الرسول ﷺ۔سیرت محمدیہ ﷺ۔دنیا کا آخری پیغمبر ﷺ

۱۳۔ سیماب اکبر آبادی: زنانہ میلاد۔سیرت نبوی ﷺ

۱۴۔ مولانا اسلم جیراج پوری: تاریخ الامت (حصہ اوّل)

۱۵۔ مولانا مناظر احسن گیلانی: النبی الخاتم ﷺ

۱۶۔ مولانا معین الدین احمد ندوی: تاریخ اسلام جلد اول

۱۷۔ مولانا عبدالشکور لکھنوی: تحفۂ عنبریہ۔غزوات النبی ﷺ

۱۸۔ مولانا عبدالعلیم صدیقی: ذکرِ حبیب

۱۹۔ قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی۔ نبی عربی ﷺ

۲۰۔ عبدالمجید سالک: رسول پاک ﷺ

۲۱۔ چراغ حسن حسرت: سرکارِ مدینہ

۲۲۔ چودھری افضل حق: محبوبِ خدا

۲۳۔ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی: قصص القرآن (جلد چہارم)

۲۴۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی: سیرتِ محمدی کا پیغام

۲۵۔ عبدالماجد دریا آبادی: مُردوں کی مسیحائی

۲۶۔ ڈاکٹر حمید اللہ: آنحضرت ﷺ اور جوانی۔ رسول اکرم ﷺ کی سیاسی زندگی۔ عہد نبوی میں نظامِ حکمرانی۔ عہد نبوی کے میدانِ جنگ، وغیرہ

۲۷۔ ملّا واحدی: حیاتِ سرور کائنات ﷺ

۲۸۔ پروفیسر سید نواب علی: ہمارے نبی: سیرتِ رسول اللہ۔ تذکرۃ المصطفیٰ۔ رسولِ رحمت ﷺ

۲۹۔ نصیر الدین ہاشمی: ذکر نبی ﷺ

۳۰۔ رئیس احمد جعفری: رسالت ماب ﷺ

۳۱۔ اجمل خاں: سیرت قرآنیہ

۳۲۔ غلام احمد پرویز: معراجِ انسانیت

۳۳۔ ابراہیم عمادی: خاتم النبیین ﷺ

۳۴۔ محمد طاہر فاروقی: سید البشر ﷺ۔ سرکار دو عالم ﷺ

۳۵۔ ماہر القادری: دُرِ یتیم

غیر مسلم اربابِ قلم نے سیرت نبی اکرم ﷺ پر اردو میں جو کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں سے مندرجہ ذیل ہمارے نزدیک بے تعصبی اور علمی انداز کی مثالیں ہیں:

۱۔ پنڈت سندر لال: حضرت محمد ﷺ اور اسلام

۲۔ سوامی لکشمی جی: آفتابِ حقانیت

۳۔ سردار گورودت سنگھ: محمد ﷺ کی سرکار۔ رسولِ عربی ﷺ

۴۔ گنج لال: حضرت محمد ﷺ اور اسلام

اس منتخب فہرست کے آخر میں یہ کہنا غیر مناسب نہ ہوگا کہ بعض رسالوں کے ''رسول نمبر'' سیرت کے لٹریچر میں مستقل کتابوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ رسالہ ''منادی'' دہلی اور رسالہ ''مولوی''، دہلی نے کئی ایسے سیرت نمبر شائع کیے تھے۔ پاکستانی رسالوں میں یہ اعزاز رسالہ ''فاران'' اور ''خاتون پاکستان'' کو حاصل ہوا۔

(۲)

اردو میں سیرت نگاری کے دور کا حقیقی آغاز سر سید اور ان کے رفقاء سے ہوا۔ ان کے دینی افکار سے کسی کو لاکھ اختلاف ہو مگر یہ حقیقت ہے کہ اسلام ان کے فکر شخصیت اور تحریک کی اساس ہے۔ اس عہد میں جو میلاد نامے ہماری محفلوں میں پڑھے جاتے تھے، ان میں بے حد ضعیف اور کمزور روایتیں جگہ پا چکی تھیں۔ یہ صورتِ حال بڑی تکلیف دہ تھی۔ سر سید احمد خاں اور حالی نے اسے وقت کی اہم ضرورت سمجھا کہ میلاد کی مجلسوں کے لیے سیرت کی ایسی مختصر کتابیں لکھی جائیں جن میں ثابت شدہ روایات ہوں اور موضوعی روایات واحادیث سے دامن بچایا جائے۔ سر سید کی ''جلاء القلوب بذکر المحبوب'' اور حالی کے ''مولود شریف'' سے اس سلسلہ کا آغاز ہوتا ہے۔ بعد میں اسی نمونہ پر مولانا راشد الخیری نے ''آمنہ کا لال'' اور سیماب اکبر آبادی نے ''زنانہ میلاد'' لکھا۔ ہم نے اپنی فہرست میں مقبولِ عام میلاد ناموں کو شامل نہیں کیا ہے جو نثر و نظم دونوں کا مجموعہ ہیں۔ ''مولودِ اکبری'' اور ''مولودِ سعیدی'' کا موازنہ ان کتابوں سے کیجیے جن کا ابھی ذکر کیا گیا تو ان کتابوں کی تصنیف کی اہمیت اور سبب واضح ہو جائے گا۔

اس عہد کی پہلی اہم کتاب، جسے آج بھی سنگِ میل کی حیثیت حاصل ہے، سر سید احمد خاں

کی ''الخطبات الاحمدیہ فی العرب والسیرت المحمدیہ'' ہے، جسے خطبات احمدیہ کے نام سے شہرت حاصل ہوئی۔ سیرت نبی اکرم ﷺ سے متعلق عیسائی مصنفین کی معاندانہ تصانیف کا سلسلہ کافی پہلے شروع ہو چکا تھا لیکن ان کتابوں کا لہجہ ان کے موضوعات اور ماخذ سب ہی علمی معیار سے پست تھے اور ان کا تعصب روشن تھا۔ ان کتابوں کی علمی کمزوریوں کے پیش نظر پادری پی۔ فنڈر نے سر ولیم میور سے چار جلدوں میں ''لائف آف محمد'' لکھوائی۔ بظاہر سر ولیم میور نے مسلمانوں کے مستند ماخذ پر اپنی کتاب اور اپنے استدلال کی بنیاد رکھی تھی۔ یہ کتاب ۱۸۶۱ء میں شائع ہوئی اور اُس شخص کی روح کو مجروح کر گئی جو عشقِ مصطفیٰ کو اپنے ایمان کی سند سمجھتا تھا۔

خدا دارم، دل بریاں زعشقِ مصطفیٰ دارم
نہ دارد ہیچ کافر، سازوسامانے کہ من دارم

(سر سید)

سر سید نے اس کے جواب کو اپنے اوپر فرض قرار دے لیا۔ حوالہ کی کتنی ہی کتابیں جمع کیں، کتنے ہی حوالوں کے ترجمے کرائے اور اپنے قیام لندن میں اپنے آپ کو اسی کام کے لیے وقف کر دیا۔ اخراجات کا یہ عالم تھا کہ گھر کے نقرئی برتن تک بک گئے۔ محسن الملک کے نام اپنے خط میں سر سید نے لکھا:

''مصمم ارادہ کیا کہ آنحضرت ﷺ کی سیرت میں، جیسا کہ پہلے سے ارادہ تھا، کتاب لکھ دی جائے۔ اگر تمام روپیہ خرچ ہو جائے اور میں فقیر، بھیک مانگنے کے لائق ہو جاؤں تو بلا سے۔''(۲)

اس کتاب میں سر سید نے عیسائی پادریوں کی طرح مناظرہ یا مخاصمانہ انداز کی جگہ اُس لب ولہجہ کو اختیار کیا جو ''قول معروف'' اور ''قول سدید'' کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔ اس طرح کتاب کا انداز خود ہی سیرت رسول ﷺ کی دل آویزی کا دیباچہ بن گیا۔ سر سید نے الزامی جوابات سے بھی گریز کیا اور محدثین اسلام کے وضع کردہ اصولوں کے مطابق احادیث کا انتخاب کیا اور انھیں

بنیادی، آخذ کے طور پر استعمال کیا۔

''پس وہی حدیث کی کتابیں ہیں جن سے کم وبیش آنحضرت ﷺ کی زندگی کے حالات صحیح صحیح دریافت ہوسکتے ہیں اور جن کو معقول طرح پر ترتیب دینے سے اور صحیح کو غلط سے تمیز کرنے سے ایک مستند تذکرہ آپ کی زندگی کا جمع ہوسکتا ہے۔'' (۳)

خطبات احمدیہ میں بارہ خطبات ہیں جن میں جغرافیہ عرب، عرب کی اقوام، رسومات و عادات، عرب قبل اسلام جیسے موضوعات پر روشنی ڈالنے کے بعد اسلام کی رحمت اور متعلقہ مسائل مثلاً جہاد پر بحث کی گئی ہے۔ کتب احادیث، کتب سیر وتفسیر وفقہ سے متعلق خطبہ (پانچواں خطبہ) ماخذ پر بحث کا درجہ رکھتا ہے۔ گیارھواں خطبہ ''شق صدر کی حقیقت اور معراج کی ماہیت کے بیان میں'' ہے۔ معراج کے متعلق سرسید احمد خان کا نقطۂ نظر یہ ہے۔

''معلوم ہوتا ہے کہ رسول خدا ﷺ نے خواب میں دیکھا تھا کہ وہ مکہ سے بیت المقدس گئے ہیں۔'' (۴)

انھوں نے بخاری، قتادہ اور تفسیر کبیر کے حوالوں سے اس نقطۂ نظر کو مستحکم بنانے کی کوشش کی ہے، لیکن سورہ بنی اسرائیل کی پہلی ہی آیت میں لفظ ''عبد'' معراج کے جسمانی ہونے کی محکم دلیل ہے۔ رہی بات خواب کی، تو ایسا سفر کوئی بھی کرسکتا ہے۔ بارھویں خطبہ میں سرسید نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زندگی بارہ برس کی عمر تک پیش کی ہے۔ اس طرح یہ کتاب اپنی تمام تر اہمیت کے باوجود نا تمام اور تشنہ ہے۔ سرسید اپنے ارادہ کے باوجود اس کا دوسرا حصہ نہ لکھ سکے۔ اردو میں خطبات احمدیہ پہلی بار ۱۸۸۷ء میں شائع ہوئی لیکن اس کا انگریزی خلاصہ ۱۸۷۰ء میں لندن سے Essays on The Life of Mohammad کے نام سے شائع ہوگیا تھا، کیونکہ اس کا خطاب مغربی دنیا ہی سے تھا اور

حیف بر جانِ سخن گر بسخن داں نہ رسد

سرسید کی نیک نیتی اور عشق رسول میں ہمیں مطلق شبہ نہیں لیکن خطباتِ احمدیہ سے اس

سلسلہ کا آغاز ہوتا ہے جسے ہم ''اعتذاری ادب'' کہہ سکتے ہیں۔

خطبات احمدیہ کے بعد شبلی و سلیمان کی سیرت النبی ﷺ جیسی کتاب ہمارے سامنے آتی ہے۔ جو آج بھی سیرت رسول ﷺ پر بہترین جامع ترین کاوشوں میں سے ایک ہے۔ ہمارے دور میں دنیائے عرب کے نئے سیرت نگاروں کی کتابوں کے جو ترجمے شائع ہوئے ہیں ان کی اہمیت مسلم ہے، مگر یہ تصانیف سیرت النبی ﷺ کے دامن کمال کے حاشیہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ پہلی دو جلدیں جو علامہ شبلی نعمانی کی لکھی ہوئی ہیں حضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ کا احاطہ کرلیتی ہے۔ باقی پانچ جلدیں سید سلیمان ندوی نے تحریر فرمائی ہیں۔ سید صاحب کو اقبال جیسے صاحب فکر و نظر نے ''علوم اسلامیہ کی جوئے شیر کا فرہاد'' قرار دیا ہے۔ تیسری جلد دلائل و معجزات، چوتھی جلد، منصبِ نبوت، پانچویں جلد عبادات اور چھٹی جلد تعلیمات اخلاقی اور ساتویں جلد نظامِ حکومت سے متعلق ہے۔ سیرت النبی ﷺ کی پہلی جلد کے مقدمہ میں فن روایت، فنِ سیرت اور سیرت پر مغربی تصانیف کے موضوعات پر بڑی سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ اس جلد میں ۹ھ تک کے اہم ابواب ''اسلام کی زندگی، وفودِ عرب، تاسیس حکومت، حجتہ الوداع، وفات نبی کریم اور حضور کے شمائل، معمولات، مجالس، عبادات، اخلاق، ازواج واولاد'' سے متعلق ہیں۔ ان دونوں جلدوں میں سید سلیمان ندوی کے حواشی بھی موجود ہیں۔ سید صاحب نے بعض مقامات پر اپنے استاد سے اختلاف کیا ہے، کہیں کسی واقعہ کے اجمال کی تفصیل حاشیہ میں دے دی ہے اور بعض تسامحات کو دور کیا ہے یا ''فروتر حوالہ'' کی جگہ بالاتر حوالہ'' دیا ہے۔

سیرت النبی ﷺ مباحث کی اہمیت اور عالمانہ طریق کار کے ساتھ تاریخ نویسی اور فکری موضوعات کی پیش کش کے اسلوب اور زبان کی ایک نہایت اعلیٰ مثال ہے۔ اس کی نثر میں بڑا ٹھہراؤ اور ٹھہراؤ کے ساتھ شگفتگی بھی ہے۔ حضور ﷺ کی پیدائش کا بیان شاعرانہ آہنگ اور آراستگیٔ بزم کا متقاضی تھا۔ ''ظہور قدسی'' اردو نثر کے بہترین ٹکڑوں میں سے ایک ہے:

''آج کی تاریخ وہ تاریخ ہے جس کے انتظار میں پیر کہن سال دہر نے کروڑوں برس صرف کردیے۔ سیارگانِ فلک اسی دن کے شوق میں ازل سے چشمِ براہ تھے، چرخ کہن مدت

ہائے دراز سے اسی صبح جاں نواز کے لیے لیل ونہار کی کروٹیں بدل رہا تھا۔ کارکنانِ قضاوقدر کی بزم آرائیاں، عناصر کی جدت طرازیاں، ماہ وخورشید کی فروغ انگیزیاں، ابروباد کی تردستیاں، عالمِ قدس کے انفاسِ پاک، توحیدِ ابراہیم علیہ السلام، جمالِ یوسف علیہ السلام، معجز طرازئ موسیٰ علیہ السلام، جاں نوازئ مسیح علیہ السلام سب اسی لیے تھے کہ یہ متاعِ ہائے گراں ارزشہنشاہ کونین (ﷺ) کے دربار میں کام آئیں گے۔''(۵)

سیرت النبی ﷺ اور خطباتِ احمدیہ کے مخاطبین میں فرق ہے۔ یہ فرق ہمیں مختلف موضوعات اور خاص طور پر معجزات کے باب میں زیادہ نمایاں نظر آتا ہے۔ سرسید کے نزدیک معراج محض ایک واقعہ ہے اور وہ بھی خواب کا۔ سیرت النبی ﷺ میں معراج کے ''اسرار وحقائق، نتائج وعبر اور احکام واعلانات'' پر تفصیلی بحث ہے۔ سید صاحب نے واقعہ معراج پر نہایت سلیس زبان میں ایسی عالمانہ بحث کی ہے جس سے منصب نبوت کا ایک اہم گوشہ واضح ترین صورت میں سامنے آجاتا ہے اور وہ گوشہ یہ ہے کہ نبی کے معجزات اپنی کیفیت اور نوعیت میں انفرادی ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے نتائج کے اعتبار سے امت کے لیے کیا معانی رکھتے ہیں۔ سید صاحب کے نزدیک معراج کا ذکر سورہ الاسراء کی صرف ابتدائی تین چار آیات میں نہیں (جیسا کہ عام خیال ہے) بلکہ یہ پوری سورہ اسی واقعہ کے نکات کی وضاحت کرتی ہے۔ معراج اس حقیقت کا اعلان ہے کہ حضور ﷺ نبی القبلتین ہیں اور بیت المقدس سے یہود کی تولیت کی مدت ختم ہوگئی۔ پھر نماز پنجگانہ کی فرضیت بھی اس کا ایک پہلو ہے۔ رہا معراج کی نوعیت کا مسئلہ، سو سید سلیمان ندوی نے اس کی کوئی عقلی اور ''سائنسی'' تاویل نہیں پیش کی۔ بلکہ معراج کے روحانی مناظر کو ایک مومن کی طرح قرآن کی شہادت میں اس طرح قبول کیا ہے کہ:

''سورہ الاسراء کے آغاز میں اللہ تعالیٰ نے معراج کے روحانی مناظر کا بیان صرف دو لفظوں میں ختم کردیا ہے۔۔۔۔۔۔۔من آیتنا۔۔۔۔ یہ نشانیاں کیا تھیں؟ کیا ان کی تفصیل کے لیے عاجز درماندہ کی زبان میں کچھ الفاظ ہیں؟ ہاں ہیں، مگر ناتمام۔ ہماری فہم، ہمارا علم، ہمارا خیال،

ہمارا قیاس اس غرض جو کچھ ہمارے پاس ہے اس کا دائرہ ہمارے محسوسات اور ہمارے تعقلات سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔"(۶)

سیرت النبی ﷺ کی ہم عصر کتاب رحمۃ للعالمین ہے۔ جس کے مصنف قاضی محمد سلیمان منصور پوری مرحوم ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کتابوں کے مصنفین کو عشقِ رسول کا صلہ کتابوں کے قبول عام کی صورت میں اسی دنیا میں عطا کر دیا"رحمۃ للعالمین اور اس کا مصنف مرحوم" کے عنوان سے اس کتاب کی تیسری جلد کے مقدمہ میں سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے:

"آج سے بیس سال پہلے کا واقعہ ہے کہ مولانا شبلی مرحوم نے اپنی سیرتِ نبوی ﷺ کی تجویز اہلِ ملّت کے سامنے پیش کی تھی۔ اس کے جواب میں ہر طرف سے تائید کی آوازیں بلند ہوئیں، صرف ایک آواز مخالفت میں اٹھی یہ مولوی انشاء اللہ خاں مرحوم ایڈیٹر "وطن" کی آواز تھی۔ انھوں نے لکھا کہ قاضی محمد سلیمان صاحب چونکہ اس کے لکھنے کا ارادہ کر رہے تھے اس لیے مولانا شبلی کو تکلیف کی ضرورت نہیں۔ اس کے بعد خاموشی سے بیس برس گزر گئے اور دونوں مصنفوں کی تصنیفوں کی کئی جلدیں اربابِ شوق کے سامنے پیش ہوئیں اور دونوں نے قبولیت کی عزت پائی۔ پھر کس کو یہ خیال ہو سکتا تھا کہ یہ دونوں مصنف آگے پیچھے اس دنیا کو خیر باد کہیں گے اور ان دونوں کے بعد ایک تیسرا شخص آئے گا جو فیوض و برکات کے ان دو مختلف سوتوں کو ملا کر ایک چشمہ بنا دے گا۔ خدا کے سامنے میں اس کی دی ہوئی اس عزت پر نازاں ہوں کہ اس نے بزرگوں کے متروکات کی تکمیل کی سعادت میرے حصے میں رکھی۔"(۷)

خط کشیدہ ٹکڑے سے سیرۃ النبی ﷺ اور رحمۃ للعالمین ﷺ کا باہمی معنوی رشتہ ہی اجاگر نہیں ہوتا بلکہ قاضی صاحب مرحوم کی علمی حیثیت بھی ہمارے سامنے آجاتی ہیں۔ شبلی اور قاضی صاحب دونوں نے اسلام کا عملی محور ذاتِ رسالت مآب کو قرار دیتے ہوئے اسلام کے نظام کی تشریح کی ہے۔ رحمۃ للعالمین کی پہلی جلد کا آغاز حضرت ابراہیمؑ کے حالات اور عرب قبل اسلام کے ذکر

سے ہوا ہے۔ یہ پس منظر سیرت کو سمجھنے کے لیے لازم ہے۔ اسی جلد میں حضور ﷺ کی پوری زندگی بیان کی گئی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ آپ کے خُلق پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ دوسری جلد سرکار دو عالم کے نسب، امہات المومنین، غزواۃ و سرایا، فضیلت حب نبی ﷺ اور سنین وحساب سے متعلق ہے۔ چھٹا باب حضور اکرم ﷺ کی رحمۃ للعالمینی کے باب میں ہے۔ جو اس کتاب کا عنوان ہے۔ یہ باب حضور ﷺ کی اس نمایاں صفت کی حسین وتفسیر ہے۔ آپ ﷺ کی تعلیمات قومی امتیازات سے بلند اور آپ ﷺ کی رحمت اقوام وطبقات کی تقسیم سے بالاتر تھی۔ تیسری جلد کے موضوعات خصائص وخصوصیاتِ نبویہ، خصائصِ اسلام کا احاطہ کرتے ہیں۔

مولوی عبدالحلیم شرر نے جامعہ عثمانیہ کے لیے تاریخ اسلام لکھی، جس کی پہلی جلد کا ابتدائی حصہ، سیرتِ رسولِ اکرم ﷺ سے متعلق ہے۔ شرر اختصار کے ساتھ حضور ﷺ کی زندگی، اخلاق وشمائل اور کارناموں کو پیش کرنے میں کامیاب رہے ہیں، لیکن سیرت کے میدان میں شرر نے جہاں اپنے فن ناول نگاری کا سہارا لیا ہے وہ کامیاب تر ہیں۔ سیرتِ رسول ﷺ کا موضوع اتنا نازک ہے کہ مورخ کے بھی پر اس وادی میں جل اٹھتے ہیں نہ کہ اسے کہانی کے پیرائے میں بیان کرنا۔ شرر کے فنی شعور نے اس وادیٔ بے راہ میں ان کی رہنمائی کی اور انھوں نے ''جویائے حق'' کا ہیرو ایک ایسے راہب کو بنایا جسے اس کے دور کی عیسائیت کچھ نہ دے سکی تھی۔ اس کے روحانی اور مادّی سفر میں بڑا کرب ہے۔ عیسائیوں کے معتقدات، ان کی خانقاہوں کے مرقعے اور بعض افراد کی تلاشِ حق اور اس حقیقت تک پہنچنے کی کہانی بڑی دل آویز ہے۔

سیرۃ النبی ﷺ اور رحمۃ للعالمین، محض کتابیں ہی نہیں یہ بعد کے لکھنے والوں کے لیے ایک نمونہ بن گئیں۔ ان لکھنے والوں نے انھی کے پیشِ نظر نقوشِ سیرت اپنے اپنے انداز میں اُبھارے ہیں اور سیرت نگاری کو مالا مال کیا ہے۔ ملا واحدی صاحب کی کتاب حیاتِ سرورِ کائنات کے ماخذ میں ان دونوں کتابوں کو نمایاں اہمیت حاصل ہے۔ اسی ساتھ ساتھ ملا واحدی صاحب کے اسلوب تحریر میں جمال ہم نشیں کا عکس بھی نمایاں ہے۔ اس سے میری مراد سیرتِ رسول پر خواجہ حسن

نظامی مرحوم کی کتابیں ہیں۔خواجہ حسن نظامی اردو کے البیلے انشاء پرداز بھی تھے اور عاشقِ رسول بھی۔ان دونوں عناصر کی آمیزش سے ان کے قلم نے جادو جگایا ہے۔ملا واحدی صاحب نے خواجہ صاحب کی نسبت زیادہ وسعت کے ساتھ اپنی کتاب لکھی ہے۔ہمارے خیال میں یہ کتاب آج کے پڑھنے والوں کے ذوقِ دین اور ذوقِ ادب دونوں کو سیراب کرتی ہے۔اسی طرح جناب غلام رسول لیکچرار گورنمنٹ کالج علی پور کی کتاب ''سیرت سید البشر'' سیرۃ النبی اور رحمۃ للعالمین کے آثار میں سے ہے۔کتاب کی پہلی جلد ہماری نظر سے گزری ہے۔مصنف نے اہم ماخذ سے براہ راست استفادہ کیا ہے۔ترمذی، الفہرست، بخاری، کتاب المعارف اور طبری وغیرہ کے حوالوں کے ساتھ مغربی مصنفین کے حوالے بھی دیے گئے ہیں۔مگر کتاب کی ترتیب پر انھیں دو کتابوں کا عکس نظر آتا ہے۔پہلی جلد میں حضور ﷺ کی زندگی، خصائص، اخلاق اور معجزات کو پیش کیا گیا ہے۔مصنف نے کتاب لکھنے کی اغراض بتاتے ہوئے بتایا ہے کہ کتاب کے پانچ حصے ہوں گے۔دوسرا حصہ قرآن مجید سے متعلق ہوگا۔تیسرا حصہ اسلام کے روحانی نظام پر مشتمل ہوگا.......(۸) افسوس اس امر کا ہے کہ کتابوں کے حوالے نامکمل ہیں۔سال اشاعت اور ایڈیشن کا تو ذکر کیا۔اکثر مقامات پر مصنف، مرتب یا مترجم کا نام بھی نہیں ہے۔کتاب کی زبان بھی مزید محنت اور توجہ کی طالب ہے۔

سیرت نبی کریم ﷺ سے متعلق بعض کتابیں خاص نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہیں۔نقطۂ نظر سے ہماری مراد مصنف کا زاویۂ نگاہ و خیال نہیں بلکہ کتاب کی ترتیب میں بعض حدود کا تعین ہے۔محمد اجمل خاں صاحب نے ''سیرت قرآنیہ'' اور جناب غلام احمد پرویز نے ''معراج انسانیت'' (معارف القرآن کا ایک حصہ) میں یہ التزام کیا ہے کہ حضور ﷺ کی سیرت قرآن کریم کی روشنی میں مرتب کی جائے۔معراج انسانیت کا ابتدائی حصہ، جس میں اسلام سے پہلے دنیا کے مذاہب وتمدن کو پیش کیا گیا ہے، خود ایک مستقل کتاب کی حیثیت رکھتا ہے اور اردو میں تقابل ادیان کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔اسی طرح حضور ﷺ کی پیدائش (ظہور قدسی) کا تذکرہ اس آہنگ اور ادبی شان سے کیا گیا ہے کہ اس کا مقابلہ صرف سیرۃ النبی سے کیا جاسکتا ہے۔اس کتاب میں جو بات کھٹکتی ہے وہ

اس کی ترتیب ہے۔ کئی جداگانہ (اگرچہ بنیادی) مباحث پر بحثیں حضور علیہ السلام کی حیاتِ طیبہ کے درمیان آکر تسلسل کو مجروح کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ معراج انسانیت کو محض قرآن کی روشنی میں سیرتِ نبوی علیہ السلام کا مرقع کہنا درست نہیں کیونکہ مصنف و مرتب نے احادیث نبوی کا سہارا ہر باب میں لیا ہے۔ مزید برآں معجزات کے سلسلے میں پرویز صاحب، سرسید احمد خان کے مقلد ہیں۔ وہ شق القمر کے قائل نہیں اور معراج کے تذکرے سے بھی گریزاں ہیں۔ یہ عقلیت پرستی کسی شخص کو بھی نبوت کے مقامات کو سمجھنے سے محروم رکھتی ہے۔

سیرت کی چند کتابیں اردو میں ایسی لکھی گئی ہیں جن کی بنیاد احادیثِ رسول علیہ السلام ہیں۔ مولانا ابوالبرکات عبدالرؤف دانا پوری کی تالیف ''اصح السّیر'' اس اعتبار سے حد درجہ قابل قدر ہے۔ حضور علیہ السلام کے حالات کے ساتھ ساتھ مولانائے موصوف نے کتاب المغازی، کتاب الاموال کو مکمل طور پر اپنی تالیف میں شامل فرمالیا ہے۔ اس کے علاوہ حضور کے مکاتیب کتاب الوفود اور امہات المومنین کے تذکرے بھی شامل ہیں۔ مولانا کا اصل کارنامہ کتاب المغازی کی ترتیب ہے اور وہ یہ دعویٰ کرنے میں حق بجانب ہیں کہ ''جو ترتیب مغازی کی میں نے اس کتاب میں رکھی ہے غالباً وہ اصح ترین ترتیب ہے۔''(۹)

مولانا دانا پوری علامہ شبلی کی سیرت النبی کو اردو میں سیرت پر ''سب سے بہتر کتاب'' قرار دیتے ہیں لیکن ان کی رائے میں شبلی نے مغازی پر جو کچھ لکھا ہے اس میں خامیاں ہیں اور غزوۂ بدر کے سلسلے میں تو شبلی نے ''تمام واقعات کو پلٹ دیا ہے۔''(۱۰)

مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کی کتاب ''نشر الطیب فی ذکر النبی الحبیب علیہ السلام'' بھی بنیادی طور پر احادیث کی بنیاد پر لکھی گئی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ انھوں نے تاریخ کی مستند کتابوں اور قصائد و منظومات کو بھی سامنے رکھا ہے۔ بالخصوص قصیدہ بردہ اور الروض النظیف کو۔ حضور علیہ السلام کی صفات و مکارم، خصائص، عصمت، طرز معاشرت خشیت مجاہدہ، اور پاکیزگی طبیعت وغیرہ کے بیان میں مولانائے مرحوم نے احادیث و روایات عربی میں درج کی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ ان کا ترجمہ

پیش فرمایا ہے۔ اس طرح یہ کتاب ان کتابوں میں سے ہے، جنھوں نے اردو کے قارئین کو اصل متن اور ماخذ سے قریب تر کر دیا ہے۔

''سیرت المصطفیٰ ﷺ'' مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ہے جو تین جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کا پاکستانی ایڈیشن اکتوبر ۱۹۸۵ء (۱۴۰۶ھ) میں شائع ہوا لیکن اس میں کتاب کی اولین اشاعت کی تاریخ موجود نہیں بہر حال اس کی پہلی جلد میں حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کے ''کلمات بابرکات'' کے آخر میں ۹ شوال ۱۳۵۸ھ (۱۹۳۹ء) کی تاریخ تحریر ہے۔ یوں اس سال کو تاریخِ اشاعت بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ مولانا تھانوی نے اپنے اس مختصر مقدمہ میں کتاب کے بعض مقامات کی سماعت کا ذکر کیا ہے اور یہ بھی فرمایا ہے کہ ''کسی کسی جگہ احقر نے خفیف مشورے بھی دیے ہیں جن کو فاضل مؤلف (نے) بشاشت سے قبول کیا جو ان کے انصاف اور اخلاص کی واضح دلیل ہے۔ مولانا تھانوی نے اس کتاب کے بارے میں فرمایا ہے کہ:

> ''عام مشورہ جس کے مخاطب عام ناظرین ہیں، یہ ہے۔ (چاہے) کہ کوئی شخص جو اردو کی بھی ضروری استعداد رکھتا ہو کتاب مذکورہ کے درس یا مطالعہ سے محروم نہ رہے جس کا ایک ایک اجمل اور اسہل فائدہ یہ ہے کہ اس سے اپنا آقا ﷺ کی ضروری معرفت ہوگی۔''

اس کتاب میں نبی کریم ﷺ کے اجداد کا ذکر، نبوت سے پہلے کے حالات کے علاوہ آپ کی پاک زندگی کی جزئیات بھی موجود ہیں، اور ایسی معلومات بھی ہیں جو عام طور پر اردو کی کتب سیرت میں نہیں ملتیں۔ مزید برآں اس کتاب میں کئی اصولی مباحث بھی شامل ہیں رسول کریم ﷺ کی وفات کے بعد خلافت صدیقی، اور بیعت صدیقی کے بارے میں اہم معلومات شاملِ کتاب ہیں۔ انبیاء کی میراث پر اصولی گفتگو بھی بہت مدلل ہے۔ نبی کریم ﷺ کے معجزات کی تعداد اور اقسام پر بھی عالمانہ گفتگو کی گئی ہے۔ اس طرح سرورِ کائنات ﷺ کی بشارات اس سیرت کا مستقل جز ہیں۔ کتاب کی اندازِ بیان میں وضاحت ہے علمائے طرزِ قدیم کی کتابوں میں عموماً ایسی وضاحت اور ادبیت نہیں ہوتی۔

اردو میں سیرت نبوی ﷺ پر مستقل تصانیف کے علاوہ مقالات وخطبات کے مجموعے بھی موجود ہیں۔ ہماری مراد یہاں ان مجموعوں سے ہے جو کسی ایک مصنف کے لکھے ہوئے ہیں اور جس کے مقالات وخطبات میں سیرت رسول اللہ کے مختلف پہلو پیش کیے گئے ہیں ۔ان مجموعوں کو دو قسم میں تقسیم کیا جاسکتا ہے ایک تو وہ مجموعے ہیں جن کے خطبات ومقالات میں ایسی ترتیب وحدت ہے کہ انھیں مستقل تصنیف قرار دیا جاسکتا ہے۔سید سلیمان ندوی کی کتاب ''خطباتِ مدراس'' اسی قسم کی کتابوں کی نمائندگی کرتی ہے۔دوسری قسم ان مجموعوں کی ہے جن کے مقالات اس طرح ایک دوسرے سے منسلک نہیں۔مولانا عبدالماجد دریا آبادی کی کتاب ''مُردوں کی مسیحائی'' ان کتابوں کی نمائندہ مثال ہے۔

خطباتِ مدراس آٹھ خطبوں کا مجموعہ ہے جو اکتوبر اور نومبر ۱۹۲۵ء میں دیے گئے۔یہ خطبات پہلے پہل ۱۹۲۶ء میں کتابی صورت میں شائع کیے گئے۔پہلے خطبہ میں انسانیت کی تکمیل کے سلسلہ میں انبیائے کرام کی سیرت کی اہمیت کو واضح کیا گیا ہے اور دوسرے خطبہ میں سید صاحب نے علمی سطح پر یہ بات ثابت کی ہے کہ ''عالمگیر اور دائمی نمونۂ عمل صرف محمد رسول اللہ ﷺ کی سیرت ہے۔'' باقی چھے خطبے سیرتِ محمدی ﷺ کے تاریخی پہلو، تکمیلی پہلو، جامعیت، عملیت اور حضور ﷺ کے پیغام سے متعلق ہیں۔ہماری رائے میں اپنی حدود میں یہ اردو زبان میں سیرت کی بہترین کتاب ہے۔حضور کی زندگی کی جامعیت اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا عجیب تابناک معجزہ ہے۔جس سے یہ نکتہ ہمارے سامنے آتا ہے کہ رسول وحی کی روشنی میں افرادِ ملت کی صلاحیتوں کو کچلتا نہیں بلکہ انھیں ایک بامقصد سمت عطا کر دیتا ہے۔حضور ﷺ کے صحابہ مختلف صلاحیتوں کے مالک تھے۔جن کی صلاحیتیں نبی اکرم ﷺ کی عملی تقلید میں انسانیت کی فلاح و بہبود کا وسیلہ بن گئیں۔حضور ﷺ کی زندگی کے مختلف پہلو اور آپ ﷺ کے صحابہ کے کارنامے سید صاحب کے فکر ونظر کے سامنے اس طرح روشن ہیں جیسے تاریخ نے اپنے صفحات پلٹ دیے ہیں اور سید صاحب اس نورانی دور کے نقشے خود دیکھ رہے ہوں اور ہمیں دکھا رہے ہوں۔ (۱۱)

عہد حاضر کے تقاضوں نے سیرت نگاری کے اسلوب کو متاثر کیا ہے۔ حضور کی دعوت اور عالم انسانیت کے لیے آپ ﷺ کی سیرت کی اہمیت پر سید سلیمان ندوی تک ہمارے ارباب قلم نے بہت کچھ لکھا ہے۔ جن بزرگوں کی تصانیف کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ ان کے علاوہ پروفیسر سید نواب علی مرحوم کا نام اس باب میں خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ لیکن ہمارے دور میں قیامِ نظامِ اسلامی کے لیے جو عملی جدو جہد کی جارہی ہے اس کی وجہ سے اسلامی تحریکوں کے وابستگانِ دامن کے لیے سیرت رسول ﷺ ایک تسلی اور ایک تشفی بلکہ ایک بشارت بن گئی ہے۔ اسلامی تحریکوں میں جماعت اسلامی کے متعلقین نے لکھنے پڑھنے پر سب سے زیادہ توجہ دی ہے۔ سرسید تحریک کے بعد اس اعتبار سے جماعتِ اسلامی کی تحریک ہمارے ادب میں بڑی اہمیت رکھتی ہے اور اختلافات کے باوجود سرسید کی تحریک کی جانشین ہے۔ نعیم صدیقی نے اپنی کتاب ''محسن انسانیت'' کی وضاحت ہی ان الفاظ میں کی ہے۔ ''سیرتِ پاک کا مطالعہ اسلام کے تحریکی شعور کے ساتھ۔'' نعیم صدیقی جماعتِ اسلامی کے ان لکھنے والوں میں سے ہیں جو تخلیقی مزاج رکھتے ہیں اور اکثر تجزیہ ان کے یہاں جذباتیت کا تابع بن جاتا ہے۔ مگر محسنِ انسانیت میں یہ عیب کہیں نہیں ملتا۔ انھوں نے محسنِ انسانیت کی جلد دوئم میں صرف غزوات کا حال ہی نہیں لکھا ہے بلکہ جہاد اور غزوات کی اہمیت کا علمی اسلامی اور نفسیاتی زاویہ سے تجزیہ بھی کیا ہے:

''اصلاح و تعمیر کے کام میں قوت بجائے خود ایک اہم ضرورت ہے۔ لیکن اجتماعی دائرے میں کوئی انقلاب آج تک بجز اس صورت کے نہیں آیا کہ اس کے علم بردار اپنے آپ کو مضبوط اور غالب و برتر ثابت کردیں۔ مجرد مذہب جسے انسانی زندگی کے صرف ایک چھوٹے سے خانے سے واسطہ ہوتا ہے، اسے لے کے چلیے تو وعظ اور فیضانِ نظر سے بڑھ کر کسی سرگرمی کی ضرورت نہیں پڑتی...... بدترین تمدن کے اندر چھوٹا سا گوشۂ عافیت نکال لینے والے مذاہب بھی درحقیقت انسان کے ذوقِ فراریت کی تخلیق ہیں...... لیکن جو دین غیر الٰہی نظام زندگی کے گاڑھے میں یادِ خدا کے مخمل کا ذرا سا پیوند لگا کر مطمئن نہ ہوتا ہو بلکہ جسے پوری زندگی

کو اپنے ہی رنگ میں رنگنا ہو اس کا کام نرے لجاجت آمیز وعظوں، خلوت پسندانہ ریاضتوں اور خدمت خلق کے محدود جذبوں سے نہیں چل سکتا۔''(۱۲)

محمد عبدالحیٔ صاحب کی کتاب ''حیاتِ طیبہ'' اسی نوعیت کی کتاب ہے، لیکن ہمیں اسلام کی جگہ ہر مقام پر ''تحریک اسلامی'' کی اصطلاح کے استعمال سے بنیادی طور پر اختلاف ہے۔ اگر اسلام کو محض تحریک ہی قرار دے دیا جائے (ویسے یہ لفظ جس طرح ہماری زبان میں مستعمل ہے، اس کے پیش نظر اسلام کے جسم کے لیے قبائے مختصر کا درجہ رکھتا ہے) تو بھی اس تحریک کو اسلام اور صرف اسلام ہی کہنا مناسب بلکہ ضروری ہے۔ اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے ہمیں یہی لفظ عطا فرمایا ہے اور کسی دُم چھلے کے اضافہ سے اس میں وسعت پیدا نہیں ہوسکتی۔ ''حیات طیبہ'' ہمارے دور کی مصروف زندگی میں گھرے ہوئے انسانوں کے لیے ایک اچھا تحفہ ہے جو اس مختصر سی کتاب میں سیرتِ طیبہ کا اجمالی مطالعہ کر سکتے ہیں۔ پھر ایسا مطالعہ جس میں ''تحریک'' اور داعی دونوں کے نقوشِ جمیل واضح اور نمایاں ہیں۔

ان عالمانہ تاریخی اور تحقیقی کتابوں کے علاوہ سیرتِ نبی کریم ﷺ کو قصہ کے انداز میں بھی پیش کیا گیا ہے۔ عبدالحلیم شرر کی جویائے حق کے سلسلہ میں یہ بات عرض کی جا چکی ہے کہ یہ راستہ نہایت نازک اور تلوار کی دھار کی طرح تیز اور باریک ہے۔ قصہ کے اس پلِ صراط سے شرر مرحوم کے علاوہ جو لوگ ایمان کے ساتھ گزر گئے ان میں احسان بی۔ اے۔ اور ماہر القادری کے نام میرے ذہن میں ہمیشہ تازہ رہتے ہیں۔ ماہر القادری کی کتاب ''دُرِ یتیم'' میں تاریخ کے اہم ترین دور کی ایسی تصویر نظر آتی ہے، جس کے کردار ہم سے بہت دور ہوتے ہوئے بھی ہماری شہ رگ کے آس پاس ہی موجود ہیں (حبل الورید سے قریب تر تو صرف ذاتِ باری ہے)

اردو میں سیرت نگاری کا یہ اجمالی مطالعہ اس حقیقت کے اثبات کے لیے کافی ہے کہ اردو اس صنفِ خاص میں کسی اور زبان سے پیچھے نہیں (ماخذ اور دینی ضروریات کے لیے عربی سے انکار بھلا کون کرے گا؟)

حواشی

۱۔ جان لوٹز (Jhon Lot) مضمون مشمولہ: درسائیکو لسٹکس (Psycholinguustics) مطبوعہ نیویارک، ۱۹۶۱ء

۲۔ حالی، حیات جاوید، مطبوعہ اکادمی پنجاب، لاہور، ۱۹۷۵ء، ص ۴۹۳

۳۔ سرسید، خطباتِ احمدیہ، دیباچہ، مطبوعہ نفیس اکیڈمی، کراچی، ص ۲۴

۴۔ سرسید، خطباتِ احمدیہ، ص ۴۶۹، ظاہر ہے یہ امت مُسلمہ کے عام نظریے کے خلاف ہے۔

۵۔ شبلی، سیرت النبی، دارالمصنفین اعظم گڑھ، طبع پنجم، جلد اوّل، ص ۱۷۰

۶۔ طبع چہارم، ص ۴۸۱

۷۔ سید سلیمان ندوی، رحمۃ للعالمین، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، بار دہم، جلد سوم، ص ۷

۸۔ غلام رسول، سیرت سید البشر، سلطان القلم اکیڈمی، لاہور، ۱۹۶۴ء، ص ۲

۹۔ مولانا عبدالرؤف داناپوری، اصح السیر، نور محمد کارخانہ تجارت کتب، کراچی، ص ۵

۱۰۔ ایضاً ص ۵۔۶

۱۱۔ اس کتاب کی تحقیقی اور جیتی جاگتی نثر کا اندازہ کرنے کے لیے دیکھیے: مکتبہ الشرق، کراچی، نومبر ۱۹۵۴ء، ص ۹۹۔۱۰۰

۱۲۔ نعیم صدیقی، محسن انسانیت، مکتبۂ رحمانیہ سرگودھا، ۱۹۶۰ء، حصہ اوّل، جلد ۲، ص ۲۴۹۔۲۵۰

اردو میں سیرت نگاری

تکملہ

۱۹۶۸ء کے بعد اردو میں سیرت نگاری کی رفتار تیز ہوگئی ہے۔اس کے کئی اسباب ہیں۔ مایوسی کے حالات میں امید کی وہ کرن تابندہ تر ہو جاتی ہے جس کی شہادت اور صداقت پر ہمارے ایمان کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ مکہ، طائف، مدینہ، بدر، حنین ...... یہ سب صرف مقامات اور معرکے نہیں ہیں بلکہ انسانی زندگی کے مختلف اور گونا گوں تجربات ،امتحانات اور آزمائشوں کے اشارے اور علامتیں ہیں جن سے انسان، بالخصوص مسلمانوں کو حوصلہ ملتا ہے۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ مغربی درس گاہوں کے اساتذہ وطلبہ اور دینی درسگاہوں کے معلم اور دانش جو سیرت نگاری کی طرف زیادہ بڑی تعداد میں متوجہ ہوئے۔ دونوں نے اپنے اپنے علمی پس منظر، علمی سرمایہ اور طریقِ کار کے مطابق سیرتِ محمد عربی علیہ التحیۃ والسلام پر لکھا اور نقطہ نظر اور طریقہ کار کے اختلافات کے باوجود نتیجہ یکساں مرتب ہوا۔ سرورِ کائنات ﷺ کی عظمت مختلف پہلوؤں سے اور زیادہ ابھر کر سامنے آئی۔ ایک قوی خارجی سبب ۱۹۷۷ء کے بعد ملک کے بدلے ہوئے حالات ہیں۔ جنرل محمد ضیاالحق کے عہد میں اگرچہ اسلامی نظام بنیادی طور پر نافذ نہیں کیا جاسکا، لیکن ملک کی فضا سراسر بدل گئی۔ عوامی ذرائع ابلاغ نے بنیادی طور پر اپنا کردار تو نہ بدلا، لیکن حمد و نعت کی صدائیں ملک کی فضاؤں میں سنائی جانے لگیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ سیرت نگاری کے سلسلہ میں کئی قومی اور بین الاقوامی انعامات شروع کیے گئے۔ انگریزی اور اردو کے علاوہ علاقائی پاکستانی زبانوں میں بھی سیرت نگاری نے فروغ پایا۔ ہمدرد فاؤنڈیشن نے بھی اس سلسلہ میں اہم کردار انجام دیا۔ سیرت کانفرنسیں منعقد کیں، ان کے

مقالے شائع کیے اور سیرت پر بچوں کی کتابوں کی اشاعت کی طرف خصوصی توجہ دی۔ بعض دوسرے ادارے بھی اس کارِ خیر میں شریک ہو گئے۔ دادا بھائی فاؤنڈیشن نے سیرت پر انعامات کا سلسلہ شروع کیا۔ پی۔ ایس۔ او۔ کے مجلّہ نے سیرت کے ایک سلسلہ کی اشاعت کا آغاز کیا۔

اس دوران سیرت محمدﷺ پر جو کتابیں شائع ہوئیں ان میں خاصا تنوع ہے۔ ایسی متوسط اور مختصر کتابیں شائع ہوئیں جن میں رسولﷺ کی حیات پاک بیان کی گئی ہے اور آپﷺ کے پیغام اور شخصیت کے کمالات وفضائل کو پیش کیا گیا ہے۔ بعض کتابوں میں حالات پر کم توجہ دی گئی ہے اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ بعض نہایت ممتاز اہلِ قلم کے مضامین سیرت کو کتابی شکل میں ترتیب دیا گیا ہے۔ کچھ لکھنے والوں نے مختلف پہلوؤں پر کتابیں لکھی ہیں۔ بعض کتابیں کسی مقرر کردہ دائرے میں رہ کر لکھی گئی ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ سیرت کے متعلق مضامین ومقالات کے مجموعے بھی منظرِ عام پر آئے ہیں۔ بعض رسالوں کے رسول نمبروں کا ذکر مقالہ میں کیا جا چکا ہے۔ اس دور میں ''نقوش'' نے ایسا رسول نمبر شائع کیا کہ جس سے ایک طرف ہماری ادبی صحافت ایک نئی بلندی تک پہنچی اور دوسری طرف اس کے مدیر کی بخشش کا سامان ہو گیا۔ ہم نے ترجمہ شدہ کتابوں کو اپنے دائرہ مطالعہ میں شامل نہیں کیا تھا۔ اس زمانہ (۱۹۶۹ء تا ۱۹۹۰ء) میں بہت سی کتابوں کے عربی، انگریزی اور دوسری زبانوں سے ترجمے ہوئے۔ انھیں اس تکملہ میں شامل نہیں کیا جا رہا، لیکن اگر مصنف اردو دنیا ہی کا باشندہ ہے اور کتاب کے ترجمے میں کسی بھی اعتبار سے شامل رہا ہے تو اس کی کتاب کو شامل کرنا مناسب جانا۔

ہم سب سے پہلے سیرت وحیات محمدیﷺ کی ان کتابوں کا ذکر کریں گے جن میں آپﷺ کی حیات کو ازاول تا آخر بیان کیا گیا ہے، یا اسے مرکزی حیثیت حاصل ہے۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی کتاب ''نبی رحمت'' دو حصوں میں ۱۹۷۸ء (۱۳۹۸ھ) میں شائع ہوئی۔ مولانا کی اس عربی کتاب کا ترجمہ ان کے فاضل بھانجے سید محمد الحسنی نے اس طرح کیا کہ اس ترجمہ کا اسلوب، مولانا کے انداز نگارش سے بہت قریب ہے۔ اس کتاب کی بنیادی

خصوصیت مولانا علی میاں کی دوسری کتابوں کی طرح یہ ہے کہ یہ عام قاری کے لیے بھی ہے اور صاحبانِ فکر وعمل کے لیے بھی۔اس کے مطالعے سے عام پڑھنے والے کو زمانہ بعثت کی دنیا اور اس کے ثقافتی وتمدنی پس منظر سے آگہی حاصل ہوتی ہے اور حضور ﷺ کی حیات طیبہ نئی اور پرانی معلومات کی روشنی میں اس کے سامنے آجاتی ہے۔ اربابِ فکر کے لیے اس میں ایسے اشارات ہیں جن سے حیات نبوی ﷺ کے ایک ایک واقعہ کا رشتہ دوسرے واقعات سے قائم کرنے میں مدد ملتی ہے۔ یہ زندگی ایک جوئے نور وہدایت ہے اور اسے موجوں میں تقسیم کرنا ممکن نہیں۔ اس کتاب کی ترتیب کے وقت وہ فکری کانٹے بھی علی میاں کے سامنے تھے جو مغرب نے مسلم ذہن میں بوئے ہیں۔ کتاب کے مطالعے سے کتنے ہی اندیشے نوجوان ذہنوں سے دور ہو جائیں گے۔

میاں محمد سعید کی کتاب ''حیات النبی ﷺ'' ۱۹۸۲ء میں شائع ہوئی۔ یہ ان کی ایک طویل کتاب کا جز ہے۔ اس کتاب میں نبی کریم ﷺ کے سلسلۂ نسب کو زیادہ وضاحت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اس کتاب کا رشتہ حضور ﷺ کی سیرت سے نہیں بلکہ واقعات حیات اور بعض نزاعی اور تحقیق طلب امور سے ہے مثلاً نکاح کے وقت حضرت خدیجہؓ کی عمر۔ بنات النبی ﷺ (حضور ﷺ کی بیٹیوں) کے مسئلہ پر اس کتاب میں اچھی گفتگو ملتی ہے جس کو قرآن کی سند حاصل ہے۔ میاں صاحب کی تحقیق کے مطابق جناب ابوطالب نے نہیں بلکہ زبیر بن عبدالمطلب نے حضور ﷺ کی کفالت کی تھی۔ یہ بات مزید حوالوں اور ثبوتوں کی محتاج ہے۔

جناب محمد ولی رازی کی کتاب ''ہادیٔ عالم'' ۱۹۸۲ء میں شائع ہوئی اردو میں سیرت کے ادب میں ''ہادیٔ عالم'' اسلوب کے اعتبار سے منفرد کتاب ہے۔ یہ صنعتِ غیر منقوط میں لکھی گئی ہے، اگر ''یے'' کو حرف غیر منقوط قرار دیا جائے۔ بہر حال محمد ولی رازی صاحب نے اتنی پابندی کے ساتھ جو نثر لکھی ہے اس میں کہیں کہیں غرابت پیدا ہوئی ہے لیکن کتاب کے بیشتر مقامات میں نثر کا حسن اور قوت دونوں کا احساس ہوتا ہے۔ کتاب کے نازک ترین حصے وہ ہیں جن میں حضور ﷺ کے کلام اور احادیث کا ترجمہ پیش کیا گیا ہے۔ خطبۂ حجۃ الوداع کے ترجمہ کا ایک ٹکڑا دیکھیے:

''اے لوگو! سارے کے سارے آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے مولود ہوئے۔ اس لیے سارے عالم کے لوگ گورے ہوں کہ کالے، مالک ہوں کہ مملوک، اس ملک کے ہوں کہ کسی دوسرے ملک کے، اللہ کے لیے مساوی ہوئے۔ اس لیے وہی آدمی سرداری کا اہل ہوگا کہ اس کا دل اللہ کے ڈر سے معمور ہوگا۔''

سلیم یزدانی کی کتاب ''نبی کریم ﷺ'' جنوری ۱۹۸۴ء میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب صرف ہجرت تک کے دور کا احاطہ کرتی ہے۔ یہ کتاب عام قارئین کے لیے اپنے دامن میں بہت کچھ رکھتی ہے۔ اس کی کتابت میں بھی صفحہ کی لمبائی میں حاشیہ چھوڑا گیا ہے اور ہر جگہ حاشیہ میں عنوانات درج کردیے گئے ہیں۔ انداز بیان میں افسانوی انداز ہے مگر بے حد احتیاط کے ساتھ۔ اس کتاب کا آغاز حضرت ام سعد کے ذکر اور ان کی زبانی حضور ﷺ کے حلیۂ مبارک کے بیان سے ہوتا ہے۔ کتاب کا دوسرا حصہ غالباً ابھی تک شائع نہیں ہوا ہے۔

''پیغام اور پیغام بر'' ڈاکٹر محمد عزیر صاحب سابق استاد شعبۂ اردو، مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کی کتاب ہے۔ یہ ایک جلد میں ایک اچھی اور پڑھی جانے والی کتاب ہے۔ حضور ﷺ کی سیرت کے ساتھ ساتھ آپ ﷺ کے پیغام پر بھی مصنف کی نظر رہی ہے اور انھوں نے کامیابی کے ساتھ حضور ﷺ کے پیغام کو پڑھنے والوں تک پہنچا دیا ہے۔ خطبۂ حجتہ الوداع کے بعد پروفیسر محمد عزیر صاحب نے مدنی دور میں ان آیات قرآنی کو پیش کردیا ہے جن میں مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے لیے ہدایات ہیں۔ بعض اہم مسائل کو سرکار دوعالم ﷺ کی وفات کے بیان کے بعد کتاب کے آخر میں شامل کرلیا ہے مثلاً واقعۂ قرطاس، رسول ﷺ کے تعدد ازواج کا مسئلہ۔

''سیرت مبارکہ محمد ﷺ...... قرآن اور تاریخ کے آئینہ میں'' جناب مولانا سید محمد میاں مرحوم کی کتاب ہے۔ اس میں حضور کی حیات طیبہ بھی ہے اور آپ ﷺ کے انداز تبلیغ کو زیادہ نمایاں کیا گیا ہے کتاب کے مقدمہ میں سرگزشت انسان وانبیاء کو پیش کیا گیا ہے۔ دیباچۂ کتاب عرب قبل اسلام سے متعلق ہے۔ اس کی ترتیب شاید آج کے قاری کے لیے اجنبی ہو۔ کتاب کا پہلا حصہ

ہمارے سامنے ہے جو ۱۹۸۶ء میں شائع ہوا جلد دوم کی اشاعت کا علم نہ ہو سکا۔

''حیات پیغمبر اعظم ﷺ'' جناب مولانا عبدالصمد رحمانی کی تالیف ہے جو ۱۹۷۸ء میں شائع ہوئی اس میں واقعات کے ساتھ ساتھ ان کا تجزیہ بھی ہے۔ نبی اکرم ﷺ کے مکتوبات پر خاصا کام ہو چکا ہے اور کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں محمد عبدالشہید نعمانی صاحب کا مرتبہ مجموعہ ''فرامین نبوی ﷺ'' ممتاز ہے، لیکن سیرت کی کسی نئی اردو کتاب میں شاید مکتوبات نبوی ﷺ کو اس طرح یکجا نہیں کیا گیا ہے جیسا کہ اس کتاب میں۔

اس جائزے کی تاریخی ترتیب کو مجروح کرتے ہوئے ہم جناب خالد علوی کی کتاب ''انسان کامل'' کا ذکر اس حصہ کی کتابوں میں سب سے آخر میں کر رہے ہیں۔ اس کتاب میں خاتم الانبیا ﷺ کی حیات طیبہ صرف ۷۱ صفحات میں نہایت اختصار کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔ اس کے بعد حضور سرور کائنات کی شخصیت و سیرت کے مختلف پہلوؤں پیش کیے گئے ہیں کہ پڑھنے والے کے ذہن اور قلب پر اس ذات اکمل و اعظم کی جامعیت اور کاملیت کا نقش مرتب ہو جاتا ہے۔ یہ ایسی کتاب ہے کہ ہماری جامعات کے طلبہ کے ساتھ ساتھ عام قارئین کو ضرور پڑھنی چاہیے۔ جن پہلوؤں کو پیش کیا گیا ہے وہ درج ذیل ہیں:

ذی وقار شہری، صادق و امین تاجر، افصح العرب خطیب، الوالعزم مبلغ و داعی، معلم انسانیت، کامیاب ترین داعیٔ انقلاب، سپہ سالارِ اعظم، عظیم مدبر و منتظم، بے نظیر مقنن و منصف، حیات طیبہ کا معاشی و معاشرتی پہلو، سربراہِ خاندان، رسول رحمت۔

یہ کتاب جولائی ۱۹۷۴ء میں شائع ہوئی تھی۔

جناب عبدالعزیز عرفی کی تالیف ''جمالِ مصطفیٰ ﷺ'' چار جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔ یہ جلدیں ۱۹۷۸ء سے ۱۹۸۲ء کی درمیانی مدت میں شائع ہوئی ہیں۔ اس میں قرآنی سورتوں کی روشنی میں سیدِ آدم و عالم ﷺ کی حیات و سیرت مبارکہ پیش کی گئی ہے۔ قرآن حکیم کی روشنی میں اس سے پہلے بھی بعض اہل قلم نے سیرت محمدی ﷺ تحریر کی ہے مگر عرفی صاحب نے ترتیب نزولی

کا التزام کیا ہے اور مجموعی طور پر کامیابی کے ساتھ، مگر اس ضمن میں دو باتیں لائق توجہ ہیں۔ قرآن وہ ہے جو ہمیں اپنی موجودہ شکل میں نبی کریم ﷺ نے عطا فرمایا۔ دوسری بات یہ کہ مکی سورتوں میں مدنی آیات اور مدنی سورتوں میں مکی آیات اکثر مقامات پر موجود ہیں مثلاً سورۃ المزمل (مکی) میں زکوٰۃ کا تذکرہ۔ زکوٰۃ کی آیت یقیناً مدنی ہے۔ اس کے علاوہ کتاب میں ترتیب نہ ہونے کا احساس ہوتا ہے کیونکہ سیاق و سباق قائم کیے بغیر پوری پوری سورتیں نقل کر دی گئی ہیں۔

بعض ایسی کتابیں اس عرصہ میں سامنے آئی ہیں جن میں حیات نبی کریم ﷺ کی جگہ آپ ﷺ کی سیرت کے منتخب پہلوؤں کو پیش کیا گیا ہے یا اسلام کے بعض بنیادی مسائل و عقائد کی وضاحت سیرت نبوی ﷺ کی روشنی میں کی گئی ہے۔ جناب عبیداللہ قدسی نے ''رحمت للعالمین'' (مطبوعہ ۱۹۷۹ء) میں عرب قبل اسلام اور نزول وحی پر لکھنے کے بعد عقیدہ توحید، عبادات اور اسلام کے سیاسی، اقتصادی اور قانونی و اخلاقی نظاموں کو سیرت کے حوالے سے پیش کیا ہے اور اخلاقی نظام پر گفتگو سے پہلے حضور ﷺ کے مکارم اخلاق سے گفتگو کی ہے۔

ڈاکٹر محمد عبدالحیؒ (خلیفہ مجاز حکیم تھانوی) تالیف ''اسوۂ رسول اکرم ﷺ'' کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ ۱۹۷۵ء سے اب تک اس کتاب کے بہت سے ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اس کتاب میں مضامین اختتامیہ کے بعد مکارم اخلاق، خصوصیات انداز زندگی، تعلیمات دینی و عبادات، معاملات، اخلاقیات اور مرض و علاج سے متعلق سرور کائنات ﷺ کے معمولات اور احادیث کو جمع کر دیا گیا ہے۔ یہ کتاب تالیف و تحریر کے اصولوں کے تابع نہیں لیکن یہ مؤلف علیہ الرحمۃ کے نفسِ گرم کی تاثیر ہے کہ اس سے پڑھنے والا حضور ﷺ سے قریب تر ہو جاتا ہے۔ انداز تالیف ایسا ہے کہ یہ کتاب کہیں سے بھی پڑھی جا سکتی ہے اور لطف و افادہ کے ساتھ۔

میاں عابد احمد کی تالیف ''شانِ محمد'' بھی اسوۂ اکرم ﷺ کے انداز کی تالیف ہے۔ اگرچہ اس کی ایک فہرست بھی ہے مگر کتاب اس میں مقید نہیں۔ ذاتِ رسالت مآب ﷺ کے بارے میں پہلے تو اقوال جمع کیے گئے ہیں اور پھر سیرت کے واقعات کا ایک آئینہ خانہ سجایا گیا ہے۔ حیات طیبہ بھی

اس کتاب میں شامل ہے مگر کتاب کی ترتیب منطق کے تابع نہیں، عشق کے تابع ہے۔ یہ کتاب ۱۹۸۸ء میں شائع ہوئی۔

ڈاکٹر سید حامد حسن بلگرامی کی کتاب ''نورِ مبین'' ۱۹۹۱ء میں شائع ہوئی۔ یہ سات ابواب میں ''ابتدائے آفرینش سے مقامِ محمود تک'' نبی کریم ﷺ کے انوارِ ذات وصفات کا تذکرہ ہے۔ نبی آخر الزماں ﷺ کی رسالت قیامِ قیامت تک کے لیے ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی کتاب کا موضوع یہ ہے کہ انوارِ رشد وہدایت کس طرح مختلف ذرائع سے عام ہوئے۔

خلفائے راشدین رسول اللہ ﷺ کے انوارِ صدق وعدل وعلم اور ارادۂ قدرت کے نمائندے تھے۔ اہلِ بیتِ نبوی کے ذریعہ انوارِ سمع وبصر وکلام عام ہوئے اور جادۂ حق کا تعین ہوا۔ مفسرین ومحدثین اور فقہ کے ائمۂ اربعہ نے ایمان، عقل، قلم اور فروغِ اسلام کے انوار کو عام کیا۔ اولیائے کرام، علمائے راسخین نے قلب ونظر تک فیضانِ رسالت ﷺ کو پہنچایا اور آج بھی یہ سلسلہ مفکرین ومحققین اور اولیائے کرام کے ذریعے جاری ہے۔ ''نورِ مبین'' اردو میں اپنے طرز کی پہلی کتاب ہے اور اسے بھی پرتوئے انوارِ رسالت ﷺ میں شمار کرنا چاہیے۔

ہمارے بعض ممتاز علما اور اہلِ قلم نے سیرت وحیات رسول ﷺ مکی ومدنی پر مسلسل لکھا، لیکن وہ اسے اپنی زندگی میں کتابی شکل نہ دے سکے۔ بعد میں ان تحریروں کو ترتیب کے ساتھ کسی مؤلف نے کتابی شکل دی۔ ایسی کتابوں کو ''انتخابی تالیف'' کہا جاسکتا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے مضامینِ سیرت کو ترتیب اور ''اضافۂ مطالب'' کے ساتھ مولانا غلام رسول مہر نے ''رسولِ رحمت'' کے نام سے کتابی صورت دی ہے۔ یہ تالیف ۱۹۷۰ء میں شائع ہوئی اور متوسط سائز کے آٹھ سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ اس میں حضرت رسولِ رحمت ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے تمام اہم باب آگئے ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ اسوۂ محمدی ﷺ پر پانچ ابواب اور آپ ﷺ کی رحمۃ للعالمین پر سات ابواب شامل ہیں۔ اس کتاب میں اسلوب کے حسن کے ساتھ فکر کے لیے بھی سامان موجود ہے۔

اس سلسلہ میں دوسری اہم تالیف ''سیرتِ سرورِ عالم ﷺ'' ہے۔ یہ مولانا سید ابوالاعلیٰ

مودودی کی نگارشات کا مجموعہ ہے جسے دو جلدوں میں مولانا نعیم صدیقی اور جناب عبدالوکیل علوی نے مُرتب کیا ہے۔ یہ دونوں جلدیں متوسط سائز کے پندرہ سو سے زیادہ صفحات پر مشتمل ہیں۔ مولانا مودودی اور سید ابوالحسن علی ندوی بلاشبہ ہمارے عہد کے سب سے اہم دینی اور فکری مصنف ہیں۔ پہلی جلد میں نبوت، وحی اور ختم نبوت کے ساتھ ساتھ اتباع واطاعت رسول ﷺ پر فکر کو تحریک دینے والی تحریریں ہیں۔ مثلاً شفاعت، احادیث وقرآن کی پیش گوئیاں، اقوام سابقہ، عرب قبل اسلام کے موضوعات بھی اس جلد میں شامل ہیں۔ دوسری جلد میں سوانحی مضامین کے ساتھ ساتھ تعلیمات اسلامی اور دعوتِ محمدی ﷺ پر تحریریں شامل ہیں۔ ''سیرت سرور عالم ﷺ'' کی ترتیب زیادہ بہتر ہوسکتی تھی، مگر غالباً مؤلفین نے پہلی جلد کے مضامین کو دیباچہ حیات وسیرت محمدی ﷺ قرار دیا اور اس نقطۂ نظر کو بھی قبول کیا جاسکتا ہے۔ یہ ہمارے عہد کی ایک اہم تالیف ہے اور اصحابِ علم اس کے مطالعے سے بہت کچھ حاصل کر سکتے ہیں۔

اس مدت میں نبی اکرم ﷺ کی حیات وسیرت سے متعلق ایسی کتابیں شائع ہوئی ہیں جن کا آپ ﷺ کی زندگی، سیرت اور کارناموں کے کسی ایک پہلو سے تعلق ہے۔ احادیث کے مجموعوں کی ترتیب میں بھی ہمارے بزرگوں نے اس نکتہ کو پیش نظر رکھا تھا جس کا اندازہ کتاب ''المغازی'' اور کتاب ''الشمائل'' سے ہوسکتا ہے۔

مخصوص پہلوؤں سے متعلق اردو میں تصنیف وتالیف کا آغاز کرنے والوں میں ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب شامل ہیں۔ ان کی کتاب کا تذکرہ ہمارے مقالہ میں شامل ہے۔ یہ کتاب اول اول ۱۹۴۴ء میں شامل ہوئی۔ اس کا نیا ایڈیشن ۱۹۸۱ء میں اضافوں اور نظر ثانی کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ اس میں ڈاکٹر صاحب نے اپنے ایک اور کتابچے ''دنیا کا پہلا تحریری دستور'' کو بھی شامل کر دیا ہے یہ کتاب مختلف مضامین کا مجموعہ ہے اور اس میں کتاب کی وحدت نہیں ہے۔

ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے خلوص کے ساتھ یہ کام کیا تھا اور اس کا نتیجہ یہ مرتب ہوا کہ اس موضوع پر ڈاکٹر نثار احمد اور ڈاکٹر محمد یاسین مظہر صدیقی نے اعلیٰ درجہ کا تحقیقی کام کیا ہے۔ یہ دونوں

تحقیقی مقالے ''نقوش'' کے سیرت نمبر کی پانچویں جلد میں دسمبر ۱۹۸۳ء میں شائع ہوئے۔ ڈاکٹر محمد یاسین مظہر صدیقی کا مقالہ ''عہد نبوی ﷺ میں تنظیم ریاست وحکومت'' (صفحہ ۳۴۳ تا ۴۴۷) ابھی تک ہمارے علم کے مطابق الگ سے کتابی شکل میں پیش نہیں کیا گیا ہے۔ اس میں اسلامی ریاست کے ارتقا کے دس مرحلوں کو عرب کے مختلف جغرافیائی خطوں کے تناظر میں پیش کیا گیا اور فوجی تنظیم، شہری نظم ونسق، ریاست کے مالی ومذہبی نظام کو اردو میں پہلی بار تمام جزئیات کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر نثار احمد صاحب کا مقالہ ''عہد نبوی ﷺ میں ریاست کا نشو وارتقا'' ۱۹۸۲ء میں کتابی صورت میں بھی آ گیا ہے۔ اپنی ترتیب اور خاکہ بندی کے اعتبار سے یہ کتاب ڈاکٹر محمد یاسین مظہر کے کام سے مختلف ہے اگرچہ کئی مباحث مشترک ہیں۔ ان دونوں علمی کاموں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ختمی مرتبت ﷺ کے کارناموں اور حیات کی تفہیم کا سلسلہ یوں ہی جاری رہے گا، کیونکہ یہ نبوت قیامِ قیامت تک کے لیے ہے۔

ڈاکٹر نثار احمد صاحب نے اپنے مطالعہ کا آغاز بعثتِ نبوی ﷺ کے وقت دنیا کے سیاسی نظاموں کے جائزے سے کیا ہے۔ روم وفارس، چین، ہندوستان اس عہد کے سب سے ترقی یافتہ معاشرے تھے، لیکن وہ صدیوں کے سفر میں اس مقامِ ارتقا تک نہ پہنچ سکے تھے جہاں ایک اُمی لقب حاملِ وحی الٰہی کے وسیلے اور رہنمائی سے عرب والے دس سال میں پہنچ گئے۔ اس کے بعد نثار احمد صاحب نے تاسیسِ ریاست اسلامی کو فکری بنیادوں کو پیش کیا ہے اور ایمان باللہ، ایمانِ بالملائکہ، ایمانِ بالرسالت، ایمانِ بالکتب اور ایمانِ بالآخرت کو عقائد کی دنیا کے ساتھ ریاست کی اساس سے متعلق کر دیا۔ ڈاکٹر نثار صاحب نے علمی انداز میں مکمل حوالوں کے ساتھ توسیع استحکام انتظام ریاست نبوی ﷺ کو پیش کیا ہے۔

جناب شمس بریلوی ایک کہنہ مشق صاحب قلم ہیں۔ عربی اور فارسی دونوں زبانوں اور ان کے ادب پر اچھی نظر رکھتے ہیں۔ انھوں نے دو کتابیں سیرت سے متعلق لکھی ہیں۔ ''سرورِ کونین ﷺ کی فصاحت'' اور ''نظامِ مصطفی ﷺ''۔ ''سرور کونین'' ۱۹۸۴ء میں شائع ہوئی۔ فصاحتِ نبی اکرم ﷺ

کا ایک معجزہ ہے۔ سرکار ﷺ افصح العرب تھے کتاب کے ابتدائی ۷۰ اصفحات میں قدیم اقوام عرب کی تاریخ، مختلف قبائل کی زبانوں اور ان کی لغات پر گفتگو کی گئی ہے۔ قرآنِ حکیم میں دوسری قوموں کے الفاظ کی نشان دہی کی گئی ہے۔ اس کے بعد عربی تحریر، مختلف خطوں اور قرآن حکیم کی فصاحت و اعجاز پر گفتگو کی گئی ہے۔ اس کے بعد نبی اکرم ﷺ کی فصاحت، آپ ﷺ کے جوامع الکلم، مکتوبات گرامی اور معاہدوں اور خطبات کے ادبی پہلوؤں کی سلیقے سے نشان دہی کی گئی ہے۔ اگر چہ کتاب کے کم وبیش ابتدائی پونے دوسو صفحات کا اس کے موضوع سے کوئی راست رشتہ نہیں لیکن علمی کساد بازاری کے اس عہد میں یہ مواد بھی اپنے دامن میں افادیت رکھتا ہے۔

''نظام مصطفی ﷺ'' میں بھی جناب شمس نے اقوامِ سابقہ کے نظاموں، عہدِ جاہلیت کے معاشرے کی خصوصیات کو پوری تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ نبی اکرم ﷺ کے اصلاحی دستور العمل، نظام حقوق ومعیشت واخلاق پر گفتگو صفحہ ۲۸۰ سے شروع ہوتی ہے اور بقیہ دوسو صفحات انھی مباحث سے عبارت ہیں۔ کتاب کے ابتدائی صفحات کو نظام مصطفی ﷺ کا پس منظر قرار دیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ حضور ﷺ پر سلسلۂ نبوت ختم ہوا اور انبیائے سابقین کی کوششیں اور پیغام اس سلسلے کی ابتدائی کڑی ہیں۔ شمس صاحب کی دونوں کتابوں میں نہایت قیمتی مواد جمع کیا گیا ہے جس سے سیرتِ نبوی ﷺ پر کام کرنے والے استفادہ کر سکتے ہیں۔

غزوات، نبی اکرم ﷺ کی زندگی کا وہ باب ہیں جو آپ ﷺ کے خون مبارک کی سرخی سے تا قیامت روشن اور آپ ﷺ کی ضربت سے ہمیشہ مستحکم رہے گا۔ اردو میں مولانا ابوالبرکات عبدالروف داناپوری نے اپنی کتاب ''اصح السیر'' میں مغازی کی ترتیب میں بڑی محنت کی اور مقالے میں ہم اس کی طرف اشارہ کر چکے ہیں۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب نے ''عہد نبوی ﷺ کے میدان جنگ'' میں غزوات سے بحث کی ہے۔ ہمارے عہد میں بریگیڈیر گلزار احمد صاحب نے غزوات پر کئی اہم کتابیں لکھی ہیں۔ ایک ایسے تجربہ کار سپاہی نے لکھی ہیں جو جنگ کی حکمت عملی سے پوری طرح آگاہ ہے اور جدید فنِ حرب کے تناظر میں نبی برحق کی اس عسکری بصیرت کو سمجھنے اور سمجھانے کے

موقف میں ہے جس کا سرچشمہ وحی الٰہی ہے۔ افسوس یہ ہے کہ ہم اس وقت ان کتابوں کا تفصیلی جائزہ نہیں لے سکتے۔ غزوات کے موضوع پر عربی کتابوں کے ترجمے بھی ہوئے ہیں۔ نبی اکرم ﷺ کے بیشتر سفر غزوات کے لیے ہی کیے گئے۔ اگرچہ ان میں سفر تجارت، تبلیغی سفر اور عمرہ و حج کے سفر بھی شامل ہیں۔ جناب محمد کلیم آرائیں کی کتاب ''سرورِ عالم ﷺ کے سفر مبارک'' آپ ﷺ کے سفروں کا احاطہ کرتی ہے۔ اس کتاب میں آپ ﷺ کے سفروں کی تفصیلات کے ساتھ ساتھ معمولات کو بھی پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ کتاب کے آخر میں کچھ نقشوں کی مدد سے راستوں کی نشان دہی کی گئی ہے۔

اللہ نے کائنات عدل کے ساتھ تخلیق کی اور انبیاء کی بعثت کا ایک بڑا مقصد احکامِ الٰہی کے تحت شریعت اور عدل و احسان کا اجراء اور قیام ہے۔ جناب سید مشتاق علی کی کتاب ''شریعت اور عدل و احسان اور نبی آخر الزمان ﷺ'' کا یہی موضوع ہے۔ انھوں نے نبوت و رسالت، احکام و شریعت کا جائزہ لیے بغیر شریعت یہود اور شریعت مسیح کو پیش کیا ہے اور اس کے بعد شریعت اسلام اور نبی اکرم ﷺ کی تعلیمات پر روشنی ڈالی ہے۔ ایک سو چوراسی صفحے کی اس کتاب کے پہلے اٹھاسی صفحے پس منظر کا درجہ رکھتے ہیں، اور ہمارے خیال میں اس سے کتاب کا توازن اور تناسب متاثر ہوا ہے۔ مجموعی طور پر یہ اپنے موضوع پر ایسی کتاب ہے جس سے اسلام کے تصورِ عدل و انصاف کو سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے اور نبی اکرم ﷺ کے عہد کے معاشرے کو بھی۔ اگر اس کتاب کے اگلے ایڈیشن میں اسلام کے تصورِ نظام عدل کو علمی طور پر ابھارا جائے تو اس کی افادیت اور بڑھ جائے گی۔

نبی اکرم ﷺ نے اپنی ذات گرامی کے بارے میں فرمایا تھا کہ بُعِثتُ مُعلِماً یعنی مجھے معلم بنا کر مبعوث کیا گیا۔ جناب محمد یاسین شیخ نے ''عہد نبوی کا تعلیمی نظام'' (مطبوعہ ۱۹۸۹ء) میں حضور ﷺ کی اس حیثیت اور آپ کے قائم کردہ نظامِ تعلیم کو پیش کیا ہے اور اس کتاب کے مطالعہ سے عام قاری پر بھی یہ نکتہ واضح ہو جائے گا کہ آج بھی (اور کل بھی) ہم اپنے نظام تعلیم کو انھیں خطوط پر متشکل کر سکتے ہیں۔

سیرت نبوی ﷺ سے متعلق مضامین کو کتابی صورت میں پیش کرنے کی رسم خاصی پرانی

ہے اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔

سیرت پر مضامین کے مجموعوں میں ایک اہم مجموعہ ڈاکٹر آصف قدوائی کا ''مقالاتِ سیرت'' بھی ہے۔ اس مجموعے کے آٹھوں مقالات میں ایک ایسا ربط ہے کہ اسے سیرت پر ایک منظم کتاب قرار دیا جاسکتا ہے۔ پہلا مقالہ اسلام میں نبوت کے تصور سے متعلق ہے۔ اس کے بعد دو مقالوں میں نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حیاتِ طیبہ کو یوں پیش کیا گیا ہے کہ واقعات کے آئینے میں نبوت اور عظمت و کردار کے پہلو بھی پڑھنے والے کے سامنے آجائیں۔ دوسرے مقالوں کے موضوعات درج ذیل ہیں:

معجزے، خلقِ عظیم، پیغمبرِ اسلام اور تلوار، کامیاب ترین پیغمبر اور سرورِ کائنات۔

ان مقالوں کے بعد تین ضمیمے بھی ہیں جن میں نبیٔ آخر الزماں ﷺ کے منتخب خطبے، حدیثیں اور دعائیں پیش کی گئی ہیں۔ یوں اس کتاب کا رشتہ قارئین کی عام زندگی سے قائم ہوجاتا ہے۔

مولانا سید ابوالحسن ندوی مدظلہ نے اس کتاب کے پیش لفظ میں اسے ''سیرتِ محمدی ﷺ کا خلاصہ وعطر'' قرار دیا ہے جس سے پڑھنے والوں کو یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ سیرت محمدی کا ''انسانی زندگی کی تشکیل اور سیرت و کردار کی تعمیر میں کیا محل و مقام ہے'' علی میاں کی رائے میں اس مجموعے میں ''علم کی سنجیدگی، ادب کی شگفتگی، مطالعے کی وسعت، دلائل کا وزن، محبت کی چاشنی یہ سب خصوصیات موجود ہیں۔ اس رائے میں مبالغہ بھی نہیں۔

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب ایک تحریک کے بانی اور سربراہ ہیں۔ قرآن حکیم اور سیرت کا مطالعہ وہ اکثر اسی علمی نقطۂ نظر سے کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب آج کے ان اہل فکر صاحبان میں شامل ہیں جو لوگوں کے ذہن کو متاثر کر رہے ہیں۔ ''رسول کامل ﷺ'' کے عنوان سے ان کی بارہ نشری تقاریر کو پاکستان ٹیلی ویژن کارپوریشن نے ۱۴۰۱ھ میں شائع کیا۔ ان تقاریر میں انھوں نے مقصد نبوت، ختم نبوت اور امتِ مسلمہ کی تاریخ کے خدوخال جیسے موضوعات پر اظہار خیال کیا ہے۔ اس مجموعۂ تقاریر کا بنیادی موضوع ''انقلاب محمدی ﷺ'' ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد کے انداز تقریر و تحریر

میں وضاحت کا عنصر سلیقہ کے ساتھ ملتا ہے۔ ''میلاد''، ''میلاد نامہ'' اور ''مولود'' سیرت نگاری کی ایک مستقل اور قدیم شکل ہے۔ ان میلادوں کا رواج آج بھی خواتین کی محفلوں میں ہے۔ ''میلاد اکبر''، ''مولود شہیدی'' اور ''میلاد گوہر'' ربیع الاول کی مجلسوں میں پڑھے جاتے ہیں۔ ان میں روایات اور ''بیان'' کے ساتھ نعتیں اور سلام بھی ہوتے ہیں۔ مولانا راشد الخیری کی کتاب ''آمنہ کا لال'' دراصل میلاد کی کتاب ہے۔ جناب محمد رحیم دہلوی نے ''میلادِ رحیم'' کے نام سے ایک نیا میلاد لکھا ہے۔ اس میں مروجہ میلادوں کی ضعیف روایات نہیں۔ نعتیہ کلام کا انتخاب بھی اچھا ہے۔ سب سے اہم عنصر رحیم صاحب کی خوبصورت، آسان اور دلکش زبان ہے جس میں دلّی کا رنگ و آہنگ ہے۔ رحیم صاحب ''آسان سیرت النبی ﷺ'' کا سلسلہ تحریر کر رہے ہیں۔ اس سلسلہ کی کتابوں میں ''تاجدارِ عالم''، ''ہاشم کے تجارتی کارواں''، ''تاجدار دو عالم کے والدین''، ''شب معراج'' اور ''دائی حلیمہ'' شائع ہو چکی ہیں، اور یہ سلسلہ جاری ہے۔

بچوں کے لیے سیرت رسول عالم ﷺ پر کتابوں کی تصنیف و تالیف کا سلسلہ عرصہ سے جاری ہے۔ ان سب کتابوں کا تذکرہ ممکن نہیں۔ بعض اہل قلم نے حیات نبوی ﷺ کو اپنا موضوع بنایا ہے، یعنی تاریخ اور سنین کے التزام کے ساتھ واقعات و سوانح بیان کیے گئے ہیں۔ ہمارے خیال میں ابتدائی مدارس کے طلبہ کے لیے واقعات کی پیش کش مفید تر ہے۔ حکیم محمد سعید صاحب نے ''نقوش سیرت'' کے عنوان سے پانچ بہت اچھی کتابیں مرتب کی ہیں۔ ان کی طباعت بھی بہت خوبصورت اور بچوں کے ذوق کے مطابق ہے۔ یہ کتابیں ہیں ''سب کے پیارے''، ''اللہ سے محبت''، ''اچھے اخلاق''، ''صحابہ کی تربیت'' اور ''مبارک ہستی''۔ ہر کتاب کے واقعات کتاب کے موضوع سے ہم آہنگ ہیں۔ زبان میں سادگی کے ساتھ تخلیقی رنگ ہے اور واقعات میں صداقت کو افسانوی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ سلسلہ بچوں کی تعمیرِ اخلاق و سیرت میں موثر کردار عطا کرے گا۔

بلقیس شاہین کی چھوٹی سی کتاب ''کھجور کا درخت'' میں سیرت سے متعلق پانچ ''کہانیاں'' شامل ہیں۔ لکھنے والی کے حسنِ تحریر کا تقاضا ہے کہ وہ سیرتِ طیبہ پر بچوں کے لیے لکھیں

اور خوب لکھیں۔

ہمارے بعض رسالے ہر سال ربیع الاول کے موقع پر سیرت نمبر شائع کرتے رہتے ہیں۔ یہ سلسلہ قیام پاکستان سے پہلے شروع ہوا۔ رسالہ ''مولوی'' دہلی کے رسول نمبر پابندی کے ساتھ شائع ہوتے تھے اور کتابوں کی طرح احتیاط سے رکھے جاتے تھے۔ پاکستان میں ''خاتون پاکستان'' کراچی نے کئی اچھے رسول نمبر شائع کیے۔ ''سیارہ ڈائجسٹ'' لاہور کے رسول نمبر میں نئے مضامین کے ساتھ اچھے مضامین کا انتخاب بھی شائع کیا گیا ہے۔ حکومت پاکستان کے رسالہ ''ماہ نو'' اور صوبہ سندھ کی حکومت کے رسالہ ''اظہار'' نے رسول ﷺ نمبر شائع کرنے کا ہر سال اہتمام کیا ہے۔ پاکستان آئل کا رسالہ ''پاکستان اسٹیٹ آئل ریویو'' ہر سال ربیع الاول کے موقع پر شاہ مصباح الدین شکیل کی لکھی ہوئی سیرت ''احمد مجتبیٰ ﷺ'' کا ایک حصہ شائع کرتا ہے مثلاً ربیع الاول ۱۴۰۸ھ میں ''مسجدِ قبا سے میدانِ بدر تک''، ربیع الاول ۱۴۰۹ھ میں ''غزوہ خندق سے فتح مکہ تک۔''

لیکن ۱۳ جلدوں میں ''نقوش'' لاہور کا رسول نمبر، صرف محمد طفیل مرحوم ہی کا کارنامہ نہیں بلکہ بارگاہِ رسول عربی ﷺ میں اردو زبان کا نذرانہ ہے۔ تیرہ جلدوں میں کئی مکمل کتابیں بھی شائع کی گئی ہیں۔ بعض کتابیں پہلی بار نقوش کے ذریعہ ہی اردو زبان میں منتقل ہوئی ہیں۔ یہ جنوں کا کام ہے جو رسول اللہ ﷺ (ان پر ہمارے ماں باپ قربان ہوں) کے ایک امتی نے کر دکھایا۔ بارھویں جلد میں طفیل مرحوم نے لکھا تھا کہ یہ سیرت پر میری آخری جلد ہے اور تیرھویں جلد خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم سے متعلق ہے۔ لیکن محمد طفیل بہت مضطرب تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ دو اور جلدیں شائع ہوں۔ ایک جلد میں زندہ پاکستانی شعرا کا نعتیہ کلام ہو اس کے لیے غالباً انھوں نے جناب حفیظ تائب کو آمادہ کیا تھا اور مجھے بھی دونوں جلدوں میں شریک سفر کرنا چاہتے تھے) اور دوسری جلد میں دیارِ نبی ﷺ کے سفرنامے ہوں۔ ان دو مزید جلدوں کی اشاعت کے علاوہ وہ ان ساری جلدوں کو موضوعات کی نئی ترتیب سے شائع کرنے کا ارادہ رکھتے تھے تا کہ اس نمبر کو کتاب کی وحدت مل سکے۔

نقوش کی تیرہ جلدیں نو ہزار سے زائد صفحات پر مشتمل ہیں۔ ان جلدوں کی قدر و قیمت

کا اندازہ منتخب مندرجات سے ہو سکے گا۔

پہلی جلد: سیرت نبی ﷺ قرآن میں، اولین سیرت نگار، اولین کتب سیرت۔

دوسری جلد: توقیت، رسالت نبویہ، سیرت النبی جلد ہفتم، (سید سلیمان ندوی) محمد رسول اللہ (ڈاکٹر محمد حمید اللہ)

تیسری جلد: سیاسی نظام پر اثرات (اقبال احمد نوری) اور اصلاحِ معاشرہ، اقتصادی نظام اور حضور ﷺ کی سیرت کے پہلوؤں پر مضامین

چوتھی جلد: غزوات

پانچویں جلد: ریاست اسلامی و نبوی ﷺ پر ڈاکٹر نثار احمد اور محمد یٰسین مظہر صدیقی کی کتابیں

چھٹی جلد: فن حدیث، کتاب التفسیر، جہاد، اخلاقیات

ساتویں جلد: کاتبان وحی، عہد نبوی ﷺ کے سپہ سالار، وفود

آٹھویں جلد: خطبات نبوی (مرتبہ محمد رفیع الدین ہاشمی)

نویں جلد: آثار و متعلقات سیرت

دسویں جلد: عربی، فارسی اور اردو نعت کا انتخاب اور تنقیدی مقالات

گیارھویں جلد: سیرۃ ابنِ اسحاق (دریافت اور پہلی بار اردو میں اشاعت)

بارھویں جلد: تنظیم ریاست (پانچویں جلد کا تکملہ اور چوتھی جلد کا اشاریہ)

تیرھویں جلد: خلفائے راشدین

سیرت النبی ﷺ پر کسی بھی کام کو ''جامع'' نہیں کہا جا سکتا، لیکن ''نقوش'' کے سیرت نمبر کو سرکارِ دوعالم ﷺ کے سلسلہ میں ایک انسائی کلوپیڈیا کہا جا سکتا ہے۔ سیرت النبی ﷺ کی اشاعت سے اردو زبان میں سیرت کا پہلا سنگ میل ثبت ہوا تھا، اور ''نقوش'' کا رسول نمبر اسی شاہراہِ سیرت پر ایک ایوان حرف ہے۔

اسلامی معاشرے میں شاعری کی حیثیت

اور

اُردو نعت کی روایات ور جحانات

(کشفی صاحب نے ۱۹۸۸ء میں، ہندوستان کے دورانِ قیام لکھنؤ اور کانپور کے دو تین نعتیہ مشاعروں میں شرکت کی اور اپنے نعتیہ کلام کے علاوہ پاکستان کے نعت گو شعراٗ کے شعر بھی سنائے۔ احباب نے اصرار کیا کہ وہ نعت گوئی اور بالخصوص اردو نعت کی روایات اور رجحانات پر الگ محفلوں میں اظہارِ خیال کریں۔ ذیل کا مضمون ان کی دو تقاریر پر مبنی ہے۔ بلقیس)

لغوی طور پر کسی چیز کے وصف اور تحسین کے بیان کو نعت کہتے تھے اور ایسے بیان میں مبالغہ تو آ ہی جاتا ہے، مگر جب یہ لفظ اُس ذاتِ اقدس واکمل کی تعریف کے لیے فنی طور پر مختص ہو گیا جسے اس کے بھیجنے والے نے نور، مبشر، بشیر، نذیر، رحمۃ للعالمین، داعی الی اللہ اور سراجِ منیر کہہ کر یاد کیا، جسے مزمل، مُدثر اور یٰسین کہہ کر مخاطب کیا تو یہ لفظ مبالغہ کی جگہ حقیقت کے اظہار کا آئینہ بن گیا کیونکہ اس ذات کے اوصاف کا اظہار ہی نہیں بلکہ پورا ادراک اور تفہیم بھی ہمارے لیے ممکن نہیں۔

غالب ثنائے خواجہ بہ یزداں گزا شتیم
کاں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمد ﷺ است

اور پاکستان کے ایک ممتاز شاعر امید فاضلی کے الفاظ میں:

ایک بھی حرف نہیں عرصۂ گویائی میں
آپ کی شان کے شایان رسولِ عربی

محمد ﷺ کا رب ان کا ناعت ہے اور اسی نے قرآن حکیم کی آیات کے ذریعہ ہمیں نعت گوئی کے آداب اور شرائط عطا کی ہیں۔ خود نبی اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے جو شعر منسوب ہے وہ نعتیہ شعر ہے:

انا النبی لاکذِب

انا ابن عبدالمطلب

اور یہ شعر زبانِ رسالت پر غزوۂ حنین کے موقع پر جاری تھا جب قبیلۂ ہوازن کے تیراندازوں کے سامنے ٹھہرنا شجاعت کا معیار اور امتحان قرار پایا۔ شاعری نبی کے شایانِ شان مشغلہ نہیں اور اس کے مرتبے سے فروتر ہے لیکن حضور ﷺ کی عملی مثال اور نمونہ سے مسلم معاشرے میں شاعری کی حیثیت، اہمیت اور جہت کا تعین ہو گیا۔

دہلی، لکھنؤ اور کانپور میں کئی صاحبان نے مجھ سے کہا کہ شاعری تو اسلام میں ایک مغضوب اور ناپسندیدہ چیز ہے اور ان صاحبوں نے سورۃ الشعراء کا حوالہ دیا۔ سورۃ الشعراء کی آخری چار آیات شاعروں کے بارے میں ہیں۔ بدنصیبی سے شاعری کو اسلام میں ناپسندیدہ سمجھنے والے تین آیات یعنی آیات نمبر ۲۲۴ تا ۲۲۶ کو سامنے رکھتے ہیں اور اس سورت کی آخری آیت کو نظر انداز کر دیتے ہیں، یعنی آخری آیت کا سیاق و سباق اس سے پہلے کی تین آیتوں سے قائم نہیں کرتے۔ قرآنِ حکیم میں جو فرمایا ہے اس کا مفہوم درج ذیل ہے:

> ''اور شاعروں کا اتباع گمراہ لوگ کرتے ہیں۔ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ یہ ہر وادی میں سرگرداں پھرتے ہیں۔ یہ وہ کہتے ہیں جو کرتے نہیں، مگر وہ (شاعر) اس حکم اور تبصرے سے مستثنیٰ ہیں جو ایمان لائے، جنھوں نے اعمالِ صالحہ کو اپنایا جو اللہ کا ذکر کثرت سے کرتے رہے اور اپنے اوپر ظلم ہونے کے بعد اس کا انتقام لیا اور ظالم عنقریب جان لیں گے کہ کس جگہ لوٹ کر جانا ہے۔''

اس ارشادِ ربانی سے معلوم ہوا کہ اسلامی معاشرہ میں وہ شاعری قابلِ قبول نہیں جس کا

گمرہی سے علاقہ ہو، جو حقائق سے گریزاں ہو، جو بے راہ وادیوں میں بھٹکنے سے عبارت ہو، لیکن اہل ایمان زندگی کے حقائق اور تعمیری افکار و خیالات کے لیے شعر کو وسیلۂ ابلاغ بنا سکتے ہیں بلکہ کبھی تو شعر حسنات کے درجہ تک پہنچ جاتا ہے۔ جب کافر شعرا ہجو کو اپنائیں تو مسلمان شاعر کا فرض ہے کہ وہ ہجو کو کفر اور کافروں کی طرف لوٹا دے اور اسلامی فکر کو حسن کے ساتھ شعر کا پیراہن عطا کرے۔ جب مشرکین مکہ نے شمشیر و سناں کے ساتھ ساتھ ہجو و دُشنام کا سلسلہ شروع کیا تو نبی آخرالزماں ﷺ نے فرمایا کہ اپنی تلوار اور قوتِ بازو سے میری نصرت کرنے والے تو بہت سے ہیں۔ تم میں سے کون ہے جو اس ہجو کے مقابل میرا دفاع کرے، اور اُس وقت حضرتِ حسان بن ثابتؓ آگے بڑھے اور عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ یہ خدمت میں انجام دوں گا[1] تاریخ شاہد ہے کہ حسان بن ثابتؓ نے شاعرِ دربارِ رسول بن کر کیا سعادتیں حاصل کیں۔ حضرتِ حسان رضی اللہ عنہ کی اس علوئے شان پر صحابۂ کرام نے کیا کچھ رشک نہیں کیا ہوگا کہ وہ منبر پر نعتِ ختم المرسلین ﷺ پڑھ رہے ہیں اور سامعین میں وہ ذات بھی شامل ہے جس کی ثنا میں شعر کہے گئے ہیں۔ بنو تمیم اگرچہ وفد کی صورت میں اسلام قبول کرنے آئے تھے مگر عہدِ جاہلیت کا اثر اس درجہ باقی تھا کہ مفاخرہ کے لیے اپنا خطیب اور شاعر ساتھ لائے تھے۔ بنو تمیم کے خطیب کے بعد خطیبِ مدینہ نے جواب دیا، اور بنو تمیم کے شاعر زبرقان ابنِ بدر کے قصیدہ کے جواب میں حضرتِ حسان بن ثابت نے اپنا قصیدۂ نعتیہ سنایا اور خود بنو تمیم کے حَکَم اقرع بن حابس اور اہل وفد نے اعتراف کیا کہ محمد ﷺ کا خطیب ہمارے خطیب سے اور ان کا شاعر ہمارے شاعر سے بہتر ہے اور پھر وہ اسلام لائے۔

عہد نبوی ﷺ میں شاعری معاشرہ میں ایک تعمیری قوت کا درجہ رکھتی تھی اور کاروبارِ زندگی کو سہل بناتی تھی۔ باہمی رشتوں کا وسیلۂ اظہار تھی۔ مدینہ کے معاشرے میں شاعری کا یہ رول اور کردار ''طلع البدر علینا'' کے استقبالیہ نعتیہ نغمہ سے شروع ہوا اور پھر ہم ہر جگہ شاعری کو زندگی کا ساتھ دیتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ صحابۂ کرام مسجد کی تعمیر میں مشغول ہیں اور شعر ان کے لبوں پر ہیں۔ خندق کھود رہے ہیں اور شعر خوانی کر رہے ہیں۔ رسول ﷺ کی محفلوں میں بھی شعر کو دخل حاصل تھا۔ حضور

نبی کریم ﷺ کبھی عبداللہ بن رواحہؓ کا شعر پڑھتے اور کبھی لبیدؓ بن ربیعہ کا شعر دُہراتے۔ حضرتِ عائشہؓ کی ایک روایت میں طرفہ کا نام بھی ملتا ہے۔

لبیدؓ کے نام پر ایک بات یاد آئی۔ لبید کو شاعر کی حیثیت سے بڑی شہرت حاصل تھی۔ مسلمان ہونے کے بعد شعر گوئی ترک کردی۔ اسلام میں شعر و سخن کی گنجائش کے جو صاحبان قائل نہیں وہ لبید سے یہ قول منسوب کرتے ہیں کہ مسلمان ہونے کے بعد شعر کی کیا گنجائش اور طنزاً کہتے ہیں کہ اسلامی معاشرہ میں شعر کا دَم گھٹتا ہے۔

ان معترضین نے لبیدؓ کے قول کو مسخ کردیا ہے۔ انھوں نے فرمایا تھا کہ اللہ نے مجھے شاعری کا نعم البدل عطا کردیا ہے۔ بات یہ ہے کہ لبید نے قرآن کے نغمہ کو سمجھنے اور رسول ﷺ کی فصاحت سے لطف اندوز ہونے کو شعر کہنے پر ترجیح دی، ورنہ جیسا کہ عرض کیا گیا کہ محفلِ نبوت میں بھی شعر کو باریابی کا شرف حاصل تھا۔ جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: ''میں رسول ﷺ کی سو سے زیادہ مجلسوں میں بیٹھا ہوں جن میں صحابہ نے شعر پڑھے اور جاہلیت کے عہد کی باتیں اور قصے سنائے اور آپ خاموش رہے، بلکہ آپ نے صحابہ کے ساتھ تبسم میں حصہ لیا۔''

اُس عہد کی شاعری میں واقعات کے ذکر کے ساتھ نبی کریم ﷺ کی مدح ملتی ہے۔ صحابہ زندگی کو حضور ﷺ کے حوالے سے دیکھتے تھے اور حضور ﷺ کو زندگی کے حوالہ سے یاد کرتے تھے۔ اس نکتہ کی مزید وضاحت اقبال کی اردو نعتیہ شاعری کے سلسلہ میں کی جائے گی ان شاءاللہ۔ عربوں کے لیے شاعری ویسی ہی تھی جیسے آج کے پاکستانی اور ہندوستانی معاشرہ کے لیے کرکٹ کا کھیل۔ خود شاعری سے ہماری دلچسپی قابلِ ذکر ہے۔ اسلام نے عربوں بلکہ انسانوں کے کسی جذبہ، کسی شوق کو کُچلا نہیں بلکہ اس کے مقاصد بدل گئے اور وہ بھی جبر سے نہیں، بلکہ اہل ایمان میں فکر و خیال کی عظیم تبدیلیوں کے ساتھ۔ شاعری ہَوا و ہوس کے اظہار کی جگہ زندگی کی صداقتوں، لطافتوں اور قائم رہنے والی اقدار کے اظہار کا وسیلہ بن گئی۔ خوش آوازی کا دھارا نغمۂ بدن کی طرف سے تجوید کی طرف موڑ دیا گیا۔ یہی بات دوسرے فنونِ لطیفہ کے باب میں بھی درست ہے۔

شاعری عہدِ رسالت میں زندگی میں کس درجہ دخیل تھی، اس کے اندازے کے لیے یہی ایک بات کافی ہے کہ حضور ﷺ کی محفلوں میں شعر پڑھے جاتے تھے۔ پھر میں نے یہ بھی عرض کیا کہ زندگی کے ہر مرحلے اور کام میں شعر کا سہارا لیا جاتا تا کہ کام کی مشقت کم ہو جائے۔ ایسی شاعری میں نعت کا پہلو ضرور آ جاتا تھا۔

حضرت خاتم الانبیا ﷺ نے ذلقعدہ ۷ھ میں عمرۃ القضاء ادا فرمایا۔ جب آپ مکۂ معظمہ میں داخل ہوئے تو ناقۂ رسالت کی مہار حضرت ابن رواحہؓ کے ہاتھوں میں تھی۔

تلوار گلے میں پڑی تھی اور لب پر یہ شعر تھے۔

خلوا بنی الکفار عن سبیله الیوم نضر بکم علی تنزیله
ضرباً یزیل الهام عن مقیله و یذهل الخلیل عن خلیله

اے کفر زادو! ان (ﷺ) کے راستے سے ہٹ جاؤ
آج حرم میں ان کی آمد سے وہ ضرب لگائیں گے
کہ سر تن سے جدا ہو جائیں گے
اور (دہشت کے سبب سے) دوست، دوست سے بچھڑ جائیں گے

حضرت عمرؓ کو حرم پاک میں یہ فخریہ اشعار پسند نہیں آئے کیونکہ حرم تو سر جھکانے اور آنسو بہانے کا مقام ہے۔ انھوں نے حضرت ابنِ رواحہؓ کو منع کیا مگر صاحب دانش و وحی الٰہی ﷺ نے فرمایا۔ ’’عمر! مت روکو۔ یہ اشعار اہلِ مکہ کے لیے تیر سے زیادہ اثر کرنے والے ہیں۔‘‘ یوں سرکار ﷺ نے اپنے ارشاد سے یہ بتایا کہ جہاں تلوار سے جنگ حرام ہو وہاں بھی زبان سے جہاد کیا جا سکتا ہے۔ ممتاز شاعر اور جلیل القدر صحابی حضرت کعب بن زُبیرؓ نے سورۂ الشعراء کے حوالے سے رسول ﷺ سے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ نے شعراء کی مذمت فرمائی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ مسلمان شمشیر سے بھی جہاد کرتا ہے اور زبان سے بھی۔ یہ جہاد لسانی ویسا ہی ہے جیسے تیر چلانا۔

مدینہ کے اسلامی معاشرہ کی شاعری کا مرکزی کردار حضور نبی کریم ﷺ تھے۔ آپ ﷺ

کے صحابہؓ آپ سے اپنی اولاد، ماں باپ اور سارے انسانوں سے بڑھ کر محبت کرتے تھے۔ وہ اس دنیا میں راتیں جاگ کر اور رو کر گزاتے تھے کیونکہ انھیں یقین نہ تھا کہ جنت میں آپ ﷺ کے ساتھ جنت کے اعلیٰ ترین طبقہ میں رہنا میسر آئے گا اور آپ کی تسلی سے یہ پریشانیٔ خاطر دور ہوئی۔ یہ وہ تھے کہ آپ ﷺ کے وضو کے پانی کو زمین پر نہ گرنے دیتے۔ اس قربت اور محبت کے ساتھ آپ ﷺ کا احترام بھی صحابۂ کرام اس درجہ کرتے کہ سانس لینے میں بھی احتیاط برتتے۔ گفتگو میں آواز کو پست رکھتے کہ کہیں حبطِ اعمال میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ یوں وہ اپنی محبت کے اظہار میں بھی سلیقہ کو بدرجہ کمال برتتے۔ حضور ﷺ کے ساتھ ان کا رشتہ ایسا تھا کہ حضور ﷺ کی وفات کے موقع پر اُن صحابہ کے جذبات نے بھی شعر کا قالب اختیار کر لیا جو باضابطہ شاعر نہیں تھے اور ان کے اشعار میں ان کا مزاج پوری طرح جلوہ گر ملتا ہے۔ حضور ﷺ کے رفیقِ غارؓ نے کہا:

فکیف الحیاۃ لفقد الحبیب و زین المعاشر فی المشتھد

''اب زندگی کا کیا کیف جب حبیب رُخصت ہو گیا اور جس سے معاشرہ اور دنیا کی زینت تھی، وہ قبر کی زینت بن گیا۔''

یہ شعر وہی کہہ سکتا تھا کہ جو غار، بدر اور قبر میں اپنے صاحب ﷺ کے ساتھ رہا اور رفاقت جس پر ختم تھی۔ فاروقِ اعظمؓ تو اللہ کے حکم سے کفر اور اسلام کے درمیان خطِ تفریق کھینچنے والے بنے۔ فاروق بین المِلّتین۔ ان کے رثائی اشعار میں اللہ کی اس نصرت کا ذکر ہے جو میدانِ جنگ میں رسول ﷺ کو حاصل ہوئی۔

فامسی رسول اللہ قدر عزز نصرہ وامسی عداہ من قتیل و شار

''پس رسول ﷺ کو اللہ کی نصرت نے عزت و غلبہ عطا فرمایا'' اور ان کے دشمن مارے گئے اور شکست آشنا ہو کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

حضرت عثمان غنیؓ تو سراپا گداز تھے۔ علم و حیا کے ساتھ رقّتِ قلب کے مظہر۔ ان کی پوری شخصیت اور حضور ﷺ سے ان کا رشتہ اس شعر میں سمٹ آیا ہے۔

فیا عینی ابکی ولاتسامی وحق البکاء علی السید

''اے میری آنکھ آنسو بہا اور تھکن کا اظہار نہ کر

کہ اپنے سید اور آقا پر بکا کرنا تجھ پر فرض ہو چکا''

حضرت علیؓ نے اپنے سرپرست اور باپ جیسے بھائی کا جو مرثیہ لکھا اس میں ان کی، حضرتِ فاطمہ اور حضرت حسنینؓ کی مکمل کیفیت اور حالت آ گئی ہے۔

لقد غشیتنا ظلمۃ بعد موتہ نہاراً فقد زادت علی ظلمۃ الدجی

''ہم پر ایسی تاریکی چھا گئی ان کی موت کے بعد

کہ دن ظلمت میں کالی رات سے بڑھ گیا۔''

حضرت فاطمہؓ اور سیدہ عائشہ صدیقہؓ کے اشعار بھی حضور علیہ السلام کے ساتھ ان کے رشتہ کی مکمل تصویر پیش کرتے ہیں۔

عہدِ رسالت مآب علیہ السلام کی عام شاعری اور نعتیہ شاعری کے مطالعے سے مسلم معاشرہ کی شاعری کے خدوخال واضح ہو جاتے ہیں۔ بعد کے عربی شعرا نے انھیں بنیادوں پر نعتیہ شاعری کے ایوان کی توسیع کی۔ بلند مینار سے تعمیر کیے اور ایسے نقش و نگار اپنے قلم اور تخیل سے تخلیق کیے کہ فارسی اور اُردو نعت گوئی کے ارتقا میں ان کا بڑا حصہ ہے۔ یہ درست ہے کہ ایران اور برعظیم کی شعری روایات، ذہنی خصائص، تاریخی واقعات اور شعراء کی افتادِ طبع نے ان دونوں زبانوں کی نعتیہ شاعری کو انفرادیت بھی عطا کی۔

عربی کی نعتیہ شاعری میں نبی علیہ السلام کے محاسنِ اخلاق کا ذکر عام ہے۔ اس بارے میں عرب شاعر کے ہاں اردو اور فارسی شاعر سے زیادہ تنوع ہے۔ بات صبر، رحمت، شفقت کے ذکر تک محدود نہیں رہتی بلکہ حضور علیہ السلام کی قوتِ فیصلہ، ارادہ کی عزیمت، جلال ہاشمی اور کائنات پر آپ کے احسانات کا ذکر بھی نمایاں طور پر کیا جاتا تھا۔ آج کے بعض نقاد شمائل اور سراپائے نبوی کے ذکر کو مناسب نہیں جانتے اور یہ سچ بھی ہے کہ بہت سے شاعر آپ کا سراپا نازیبا طور پر پیش کرتے ہیں۔

بہر حال عربی شاعری میں رخسار و گیسوئے محمدی ﷺ کا ذکر ملتا ہے اور اس طرح کہ رخسار انوارِ الٰہی کی اور گیسو پناہ اور سائے کی علامتیں بن جاتے ہیں۔ عربی شاعری میں خوشبوئے رسالت ہر جگہ نظر آتی ہے۔ خوشبو، اُمتیوں اور عالم پر آپ کے اثر کا اشارہ اور رمز بن جاتی ہے۔ اسی طرح عرب شاعر آپ پر سلام ضرور بھیجتے ہیں اور شاید اسی کے زیرِ اثر ''سلام'' اُردو نعت کی مستقل ضمنی صنف بن گیا ہے۔ عربی کی نعتیہ شاعری کا پیکر قصیدہ ہے کیونکہ قصیدہ کی ہیئت عام عربی شاعری پر پوری طرح محیط تھی اور عربوں نے اپنے جوہرِ شعری کا اظہار اسی صنف کے ذریعہ کیا ہے۔ عربی کے کئی نعتیہ قصیدوں کی تشبیہ ٹھیٹ عاشقانہ مضامین سے عبارت ہے۔ میرے پاس نہ تو وقت ہے اور نہ اس وقت مثالیں ہیں کہ تفصیل سے گفتگو کی جاسکے۔ صرف حضرت کعب اور بوصیری کے قصائد بردہ کی مثالیں کافی ہیں۔ ایک قصیدہ پر حضور ﷺ نے اپنی محفل میں اپنے دستِ مبارک سے چادر عنایت کی اور دوسرے قصیدہ پر یہی انعام شاعر کو خواب کے عالم میں عطا کیا گیا۔ کعب بن زبیرؓ کے قصیدہ کی تشبیب میں سعاد کی جدائی کے ساتھ اس کا سراپا بھی ہے لیکن حضور ﷺ نے اس پر پسندیدگی کا اظہار فرمایا۔ اس بنا پر میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اسلامی معاشرہ میں اگر شاعر کی نظر اسلامی اقدار اور معاشرہ کی تعمیر پر ہو تو وہ اجزائے کلام میں اپنے تخیل، احساسِ جمال اور اظہارِ محبت میں آزادی کا حق رکھتا ہے۔

فارسی نعت کی نقش گری میں عربی کی نعتیہ شاعری کا بڑا حصہ ہے۔ مضامینِ نعت، اسالیب، علائم ان سب شعبوں میں فارسی کے شعراء نے عربی کے اثرات قبول کیے ہیں لیکن فارسی نعت گوئی کا بنیادی ذریعۂ اظہار قصیدہ نہیں ہے۔ فارسی میں قصیدہ، غزل، مثنوی، رباعی، ترکیب بند اور سارے ہی اصنافِ سخن میں نعتیں کہی گئی ہیں، لیکن غزل کی صنف فارسی اور اردو میں نعت کے لیے زیادہ استعمال کی گئی ہے۔ اس کے بہت سے اسباب ہیں۔ پہلا سبب تو یہی ہے کہ فارسی اور اردو کی مقبول ترین صنف غزل ہے۔ غزل اپنے اختصار کے ساتھ ساتھ اس وجہ سے بھی مقبول ہوئی کہ اس کا ہر شعر اپنی جگہ ایک اکائی ہے اور یہ اکائیاں مل کر اُس وحدت کی تعمیر کرتی ہیں جسے ہم غزل کہتے ہیں۔ پھر ایک شعر میں جہانِ معنی آباد نظر آتا ہے۔ غزل کا شعر ہمارے ذہن کی وادیوں میں اپنا مسکن

بنالیتا ہے اور اس کے مفہوم میں نت نئے پہلو پیدا ہوتے رہتے ہیں۔

جائے محمد درونِ خلوتِ جانست　　　نیست مرادیگر بجائے محمد

درجاں چوکرد منزل جانانِ مامحمد　　　صد درگشادہ دردل از جانِ مامحمد

تیرِ قضا ہر آئینہ از ترکشِ حق است　　　لیکن کشودِ آں زکمانِ محمد است

لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ فارسی میں بے مثال نعتیہ قصیدے اور مثنویاں لکھی گئی ہیں۔ مثنویٔ مولانا روم تو جمال وکمالِ محمدی ﷺ کا آئینہ ہے۔ پھر بیدل کی مثنویٔ محیطِ اعظم۔ غزل کے سلسلہ میں یہ بات بھی ملحوظِ خاطر رہے کہ صورت میں یہ قصیدہ کا نقش ثانی ہے۔ ردیف وقافیہ کا وہی نظام۔ فرق ہے تو طول اور اختصار کا۔ چند دوسری تکنیکی باتیں ہیں جو زیادہ اہم نہیں مثلاً قصیدہ میں ایک سے زیادہ مطلع جمع نہیں ہوسکتے۔

اردو شاعری کی بیشتر اصناف فارسی سے لی گئی ہیں۔ اکثر فارسی کے مضامین کے ترجمے کیے گئے ہیں اور بلاحوالہ دیے۔ یہ کوئی سرقہ نہ تھا۔ بات یہ ہے کہ علم، معاشرے میں عام تھا اور لوگوں کے سامنے اصل اشعار ہوتے تھے اور وہ ترجمہ کی تعریف اصل کو سامنے رکھ کر کرتے تھے۔ یوں اردو شاعری کی رفتارِ ترقی اتنی تیز رہی کہ صدی کا سفر عشرہ میں طے ہوجاتا۔ یہ بات غزل اور قصیدہ کے بارے میں درست ہے لیکن اردو کی نعتیہ شاعری کے عہدِ اول میں فارسی اثرات کے ساتھ ساتھ مقامی روایات اور برعظیم کی شعری روایات کا عکس اور اثر بھی نظر آتا ہے۔ ہماری شاعری کا آغاز حقیقی معنوں میں دکن سے ہوا۔ دکن کی ریاستوں بالخصوص گول کنڈہ اور بیجاپور کی تقریبوں اور تہواروں میں عید میلاالنبی ﷺ کو خاص اہمیت حاصل تھی۔

دکنی معاشرہ میں مقامی اثرات بہت اہمیت رکھتے تھے۔ پھر یہاں تصوف اور شیعیت کا عجب امتزاج نظر آتا ہے۔ اسی طرح جذبات واحساسات کا اظہار عورت کی زبانی بھی کیا جاتا تھا۔ یہ خالص ہندوستانی روایت تھی اور شمالی ہند میں بعد میں فروغ پانے والی صنفِ سخن ریختی سے بنیادی طور پر مختلف تھی۔ دکن میں چکی نامے چرخہ نامے اور شادی نامے عورتوں کی زبان میں لکھے گئے۔

قطب شاہی عہد (۱۵۰۸ء سے ۱۶۸۷ء تک) کی شاعری میں اس دور کی زندگی کا آئینہ خانہ نظر آتا ہے۔ شادی بیاہ کی رسموں کے ساتھ ساتھ عید عذیر، شب برات، سوکا، ہولی، بسنت اور عید میلاد النبی ﷺ پر بہت سی نظمیں لکھی گئیں۔ تہواروں میں ہمیں دکنی قومیت کے عناصر اور شیعیت کا امتزاج نظر آتا ہے۔ سلطان قلی قطب شاہ کے بعد عبداللہ قطب شاہ نے عید عذیر کا مولودِ علیؑ اور مجالسِ محرم تک اپنے آپ کو محدود نہ رکھا بلکہ وہ عیدِ میلاد النبی ﷺ کا اہتمام بھی بڑی شان کے ساتھ کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ عبداللہ قطب شاہ کی نعتیہ شاعری میں رسول ﷺ کی زندگی کے پہلوؤں اور سیرتِ پاک سے زیادہ میلاد النبی کا ذکر بار بار آتا ہے۔ سلطان عبداللہ قطب شاہ ہر سال جشنِ میلاد النبی ﷺ کے موقع پر نئی نظمیں اور نعتیں کہتا تھا۔ ایک نعت کا آغاز اس مصرع سے ہوتا ہے۔

لکھ فیض سوں آیا پھر دن، دینِ محمد کا

اور یہ شعر ملاحظہ ہو جو زبان کے اعتبار سے آج بھی تازہ معلوم ہوتا ہے۔

نبیؐ مصطفٰی کا جو مولود آیا
جہاں صاف ہو سر بسر جگمگایا

میں نے اپنی کتاب ''اردو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پس منظر'' میں دکنی شاعری کے ان پہلوؤں کا خاصی تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ قطب شاہی ادوار کے شعرا میں غواصی، ابنِ نشاطی، طبعی کے نام نعت گوئی کے سلسلہ میں ممتاز ہیں۔ عادل شاہی عہد (۱۴۹۰ء۔ ۱۶۸۶ء) میں شاہ برہان الدین جانم، شاہ اشرف اور سب سے بڑھ کر حضرت شاہ میران جی شمس العشاق نے عشق کی زبان میں ذکرِ نبیؐ کیا۔ ان بزرگوں سے یہ عہد روشن تھا۔ عادل شاہی عہد کا ممتاز ترین شاعر نصرتی تھا۔ میرے خیال میں نصرتی کا شمار اردو کے عظیم شاعروں میں کرنا مناسب اور قرینِ حق ہے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ ہم اردو کے دکنی رنگ اور روپ کی تفہیم کے لیے محنت کرنے پر تیار نہیں۔ نصرتی کا ایک نعتیہ شعر یاد آیا۔ ''تی'' کو ''سے'' سے بدل دیجیے تو شعر کی تفہیم میں کوئی مشکل نہ رہے گی:

عجب آفرینش کے دریا کا دُر
کہ جس نور تی بحرِ ہستی ہے پُر

عادل شاہی اور قطب شاہی ادوار میں نعتیہ شاعری زندگی اور معاشرہ کا حصہ تھی۔ تصوف کے حوالے سے بھی اور تقریبات کے حوالے سے بھی۔ اس دور میں نور نامے، معراج نامے، شمائل نامے بھی لکھے گئے اور یہ سلسلہ دکن کے علاقے اور گجرات میں بعد میں بھی جاری رہا۔ شمائل نامے کی روایت تو اردو کے علاوہ دوسری زبانوں میں بھی موجود تھی مثلاً پشتو میں۔ پشتو کا ایک شمائل نامہ اردو میں بھی منتقل کیا گیا۔

ولی دکنی اُس شعری روایت کے جد امجد ہیں جس کا تعلق آج کے شعر و ادب سے ہے۔ ہماری طرح زبان میں بھی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں، لیکن یہ تبدیلیاں اتنی آہستہ ہوتی ہیں کہ ان کا احساس خاصی مدت گزرنے کے بعد ہوتا ہے۔ ولی کی زبان آج کی زبان سے یقیناً مختلف ہے، مگر اس کی تفہیم اور تحسین مشکل نہیں ...... یہ آج کی زبان کا نقشِ اول ہے۔ ایک بات اور کہتا چلوں کہ ولی گجراتی کو ولی دکنی کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اُس وقت دکن کا علاقہ شش صوبۂ دکن تھا اور گجرات اُس میں شامل تھا۔ ولی کی ایک رباعی ملاحظہ ہو۔ اسے فریاد اور استغاثہ سمجھ لیجیے۔ حالی نے خاصۂ خاصان رُسل کے دربار میں ملتِ اسلامیہ کا استغاثہ پیش کیا تھا اور ولی دکنی نے اپنا ذاتی استغاثہ، مگر میں اور میرے الفاظ کا رشتہ قاری سے بھی تو قائم ہو سکتا ہے۔ ویسے بھی ''میں'' کے پردے میں ہمارے شاعروں نے قصۂ آدم پیش کیا ہے۔

اے خلق کے زیب وزین ! مجھ حال کوں دیکھ
اے جدِ حَسن و حُسین! مجھ حال کوں دیکھ
تجھ باج مجھے نہیں ہے دوجا جگ میں
شاہنشۂ مشرقین ! مجھ حال کوں دیکھ

ولی کے بعد اور ولی کے اثر سے اردو شاعری کا مرکز دکن سے شمالی ہند منتقل ہو گیا۔ پنجاب

میں تو دہلوی شعراء حاتم و میر و سودا و درد کے عہد سے کچھ پہلے نعت کے نمونے مل جاتے ہیں، لیکن شمالی ہند میں نعت گوئی کا حقیقی دور حاتم اور میر و سودا و درد سے شروع ہوتا ہے۔ ہمیں اس دور میں نعتیہ قصیدے بھی ملتے ہیں، نعتیہ مثنویاں بھی، میر کے ہاں نہایت خوبصورت نعتیہ مسدس بھی ہے۔ ان کے بعد انشا اللہ خاں انشا اور نظیر اکبر آبادی نے یاد رکھے جانے والے نعتیہ مخمس لکھے۔ دوسرے اصنافِ سخن کو بھی نعت کے لیے استعمال کیا گیا۔ یہ شمالی ہند کی نعت کی ایک اہم خصوصیت ہے۔ پچھلے دنوں کسی صاحب نے نعت کی ہیئت کا سوال اٹھایا تھا اور اس بات پر زور دیا تھا کہ غزل ہی کا پیرا نعت کے لیے مناسب ہے۔ یہ انتہا پسندانہ رائے ہے۔ سودا سے لے کر عزیز لکھنوی اور ہمارے عہد تک اعلیٰ نعتیہ قصیدے بھی لکھے گئے۔ محسن کاکوروی کا قصیدۂ لامیہ

سمتِ کاشی سے چلا جانبِ متھرا بادل

ایک رجحان ساز ادبی کارنامہ ہے۔ اسی طرح فارقلیط بھی قصیدہ ہے اور عبدالعزیز خالد کو طویل ترین نعتیہ قصیدہ لکھنے کا شرف حاصل ہوا۔ محسن کاکوروی کی مثنویوں ''چراغ کعبہ'' اور ''صبح تجلی'' کے حوالہ کے بغیر میں اردو کی نعتیہ شاعری کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ میری ناچیز رائے میں نعت کو کسی ہیئت تک محدود سمجھنا درست نہیں۔ شاعر کس پیکر کا انتخاب کرے؟ اس کا تعلق اس کے مزاجِ شعری، افتادِ طبع اور موضوع سے ہے۔ حفیظ جالندھری کے شاہنامۂ اسلام کی چاروں جلدوں کو بنیادی طور پر نعت قرار دیا جا سکتا ہے۔ واقعاتی نعت۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ نعت نثر میں بھی لکھی جا سکتی ہے۔ شبلی کے ظہورِ قدسی اور خواجہ حسن نظامی کی بعض تحریروں کو بہترین نعتوں کے زمرہ میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ یہ درست ہے کہ غزل دوسری اصناف سے زیادہ مقبول تھی، اسی لیے نعت کے لیے بھی زیادہ استعمال ہوئی۔

اس گریز کے لیے معذرت کا خواستگار ہوں۔ ذکر ہو رہا تھا شمالی ہند میں نعت کی روایت کا۔ اس ضمن میں چند نام بھی میں نے پیش کیے تھے۔ ویسے شمالی ہند میں نعت کے ارتقا کو بیان کرنے سے پہلے یہ عرض کر دوں کہ میرا مقصد تمام نعت کہنے والوں کا احاطہ کرنا نہیں اور نہ یہ ممکن ہے۔ میں

اہم شعراء کا ذکر کرنے کے ساتھ رجحانات کی نشاندہی کرنا چاہتا ہوں اور بعض بنیادی معروضات کو پیش کرنا بھی میرے پیشِ نظر ہے۔

سودا کے استاد شاہ حاتم اردو زبان کی اصلاح کرنے والوں میں اولیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے ایہام گوئی کو چھوڑ کر تازہ گفتاری کو اپنایا۔ آخری عمر میں تصوف ان کا احوالِ حقیقی بن گیا۔ دیکھیے، فارسی کا ایک نہایت معروف شعر کس تخلیقی رنگ و آہنگ کے ساتھ ان کے وسیلے سے اردو میں منتقل ہوا ہے:

صاحب دلوں کو حشر تلک ہے وہ سجدہ گاہ
جس سرزمیں میں تم نے قدم سے نشاں کیا

میر (کہ اردو کے ''خدائے سخن'' کہے جاتے ہیں) پر یہ نکتہ عشقِ رسول ﷺ نے منکشف کیا:

جلوہ نہیں ہے نظم میں حسنِ قبول کا
دیواں میں شعر گر نہیں نعتِ رسول کا

میر کی دروں بینی اور تصوف سے دلچسپی ''ذکر میر'' اور ان کی شاعری دونوں سے ہم پر آشکار ہوتی ہے۔ انہوں نے عشق کا اظہار کیا اور محبت کو سبب ظہور جانا۔ محبت اس سطح پر اللہ یا اس کے رسول سے اپنے آپ کو جوڑ لیتی ہے۔ میر کو یقین ہے کہ ذات رسالت ماب ﷺ حشر کے دن ان کی عذر خواہِ جرم ہوگی۔ میر کے ایک نعتیہ مسدس میں ان کے لہجہ کی نرمی پوری طرح ملتی ہے۔ یہ مسدس ان کی نعتیہ شاعری کی قدر کے تخمینہ کے طور پر بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔ ایک بند پیش کرتا ہوں:

جرم کی کھو شرمگینی یارسول
اور خاطر کی حزینی یارسول
کھینچوں ہوں نقصانِ دینی یارسول
تیری رحمت ہے یقینی یارسول

رحمتہ للعالمینی یارسول

ہم شفیع المذنبینی یارسول

سودا کا نعتیہ قصیدہ اردو کے نعتیہ قصائد میں بڑی شہرت رکھتا ہے اور سودا کے فن کی مکمل ترجمانی کرتا ہے۔ زبان کے اُس تشکیلی دور میں سودا نے اجزائے قصیدہ کو کامیابی کے ساتھ برتا ہے۔ تشبیب میں شکوہ وحشمت ہے، مدح میں نیاز مندی اور قصیدہ کے تمام اجزا مربوط ہیں۔ میرا اشارہ اس قصیدے کی طرف ہے۔

ہوا جب کفر ثابت، ہے وہ تمغائے مسلمانی

نہ ٹوٹی شیخ سے زنارِ تسبیحِ سلیمانی

سودا نے مثنوی کو بھی نعت کے لیے استعمال کیا ہے۔

محمد باعثِ ایجادِ افلاک

محمد علتِ غائیِ لولاک

محمد کنتُ کنزاً کی گواہی

محمد عالمِ علمِ الٰہی

محمد جگ میں سالارِ رسل ہے

محمد ماہرِ ہر جزو کل ہے

یہ ذہن کی شاعری ہے۔ فنی طور پر یہ اچھے شعر ہیں۔ ترکیبیں چُست ہیں اور الفاظ موضوع کے مطابق ہیں، لیکن ان اشعار اور مجموعی طور پر سودا کی نعتیہ شاعری میں دل کی اکسیر اور اس کی آنچ نہیں ملتی۔ پھر عقیدہ کے اعتبار سے بھی ان کی نعتیہ شاعری پایہ اعتبار سے عاری ہے۔

اس دور کے اکابر صوفی شعراء حضرت میرزا مظہر جانجاناں اور خواجہ میر درد کے اردو کلام میں کوئی باضابطہ نعت نہیں ملتی لیکن ان دونوں کی خاکِ دل میں عشقِ مصطفوی ﷺ دمکتا اور چمکتا اور ان کے وجود کو چمکاتا نظر آتا ہے۔ ان کا فارسی کلام بھی اس عشق کی شہادت دیتا ہے۔ اردو میں

حمد و نعت کے اشعار ان کی غزلوں میں غزل کی علامتوں اور اشاروں میں نظر آتے ہیں۔ میں تو خواجہ میر درد کے اس شعر کو نعتیہ شعر ہی سمجھتا ہوں۔ (۲)

ہمارے پاس ہے کیا جو فدا کریں تجھ پر
مگر یہ زندگی مستعار رکھتے ہیں

دورِ میر و سودا اور درد کے فوراً بعد میر حسن، قائم، انشا، جرأت، مصحفی، نظیر اکبر آبادی وغیرہ نے ایسی نعتیں کہیں کہ اردو نعت کے کسی بھی انتخاب میں ان نعتوں کو جگہ دینی ہوگی۔ میں تو اسے بھی حضور ﷺ کے معجزاتِ بعد وفات میں شامل کرتا ہوں کہ انشا اللہ خاں انشا جیسا ہنسوڑ بھی بارگاہ ختمی مرتبت ﷺ میں احترام و ادب کی زندہ مثال کی طرح نظر آتا ہے اور اس کے الفاظ کا انتخاب اردو زبان کی حد تک مرتبۂ عظمتِ محمدی ﷺ کی آگاہی کا اظہار ہے۔ اسی طرح وہ نظیر اکبر آبادی جس کی شناخت یہی ہے کہ اس نے آگرہ اور اس کے مضافات کی بولی کو اپنے عہد کی عوامی زندگی کے اظہار کے لیے ادبی سطح پر استعمال کیا، نعت میں طریقۂ راسخہ کے معتبر لہجہ اور اسلوب میں سخن سرا نظر آتا ہے۔ دونوں کی بہترین نعتیں مخمس کے پیرائے میں ہیں۔ میں دونوں کے نعتیہ مخمسوں کا ایک ایک بند نمونہ کے طور پر پیش کرتا ہوں۔ اسے بھی میں رفعِ ذکرِ سید المرسلین ﷺ کی شکل سمجھتا ہوں کہ نعتیہ اشعار سنے اور سنائے جائیں۔

پہلے انشا کے مخمس کا بند اور اس کا دروبست ملاحظہ ہو:

عرش کے کچھ نہیں فقط قائمۂ جلیل پر
لوحِ جبینِ مہر پر، چشمۂ سلسبیل پر
ثبت یہی نقوش ہیں، عدن کی ہر فصیل پر
ہے خطِ نسخ سے لکھا شہ پرِ جبرئیل پر
صلِ علیٰ نبینا ، صلی علیٰ محمد

انشا اُن شعرا میں سے ہیں جنہوں نے عبادت سمجھتے ہوئے صلِ علیٰ محمد اور صلی اللہ علیہ وسلم

کی تکرار کی ہے اور اکثر ردیف کے طور پر۔ امیر مینائی اور عہدِ حاضر کے شاعر علامہ اقبال سہیل کے نام اس ضمن میں ذہن میں آ گئے۔

نظیر اکبر آبادی کے سلسلے میں ان کے آہنگ کا ذکر میں کر چکا ہوں۔ ''سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا'' کی صدا بلند کرنے والا درویش حضور ﷺ کے حضور مخاطبت کی جرأت کرتا ہے۔ اس خطاب میں ثنائے خواجہ ہی سے اس میں حرف کی ادائیگی کا حوصلہ پیدا ہوتا ہے۔ عام طور پر غزل کے شعر کے دونوں مصرعوں میں ایک مضمون ادا کیا جاتا ہے اور مخمس یا مسدس کے ایک بند کے تمام کسی ایک خیال کی ادائیگی کرتے ہیں۔ لیکن یہ بند ملاحظہ ہو، تمام مصرعے میں حضور ﷺ کی ذات اور مرتبہ کا الگ الگ پہلو موجود ہے۔ نظیر اکبر آبادی جانتے تھے کہ رحمۃ للعالمین کی ہر صفت ذات اور کائنات کی ایک دنیا ہے۔

تم ظہورِ اولیں ہو یا محمد مصطفیٰ
ہم دمِ جاں آفریں ہو یا محمد مصطفیٰ
وجہِ قرآنِ مبیں ہو یا محمد مصطفیٰ
نزہتِ بستانِ دیں ہو یا محمد مصطفیٰ
زینتِ خلدِ بریں ہو یا محمد مصطفیٰ

ہم اردو نعت کی روایت اور رجحانات کی تلاش اور تعین میں اب مصحفی اور شاہ نصیر کے شاگرد کرامت علی شہیدی تک آ گئے ہیں۔ وقت کی کمی کے سبب میر حسن، قائم خود مصحفی کے نعتیہ اشعار آپ کی خدمت میں پیش نہ کر سکا۔ شہیدی کی متاعِ فن نعتِ محمد عربی ہے۔ وہ نعت کو اپنا سرمایۂ شعری وفکری بنانے والے شعرا میں شمالی ہند کی حد تک اولیت رکھتے ہیں۔ وہ بہارِ نعت کے ایسے طائرِ پیش رفت ہیں، جن کے نغموں میں امیر مینائی، محسن کاکوروی اور مولانا احمد رضا خان کی آمد آمد کی نوید ہے۔ شہیدی اپنے آقا و مولا حضرت رسول اللہ ﷺ کی محبت کے نگر کے باسی تھے۔ ۴ صفر ۱۲۵۲ھ (۱۸۴۰ء) کو مدینہ کے راستے میں انھوں نے انتقال کیا اور یوں اُن کا سفرِ مدینہ، سفرِ ابدی بن

گیا۔ شہیدی کے دو شعر ملاحظہ ہوں:

توارد کے یہ معنی، جب لکھا شعر اس کی مدحت میں
مرے مضموں سے مضموں لڑ گیا ہے نظمِ قرآں کا
اُدھر اللہ سے واصل، ادھر مخلوق میں شامل
خواص اس برزخِ کبریٰ میں حرف مشدّد کا

شہیدی کی نعت میں عشق، خیال اور فن یہ تینوں اجزا مل کر ایک وحدت کی صورت اختیار کر گئے ہیں۔ میر، سودا، نظیر اور انشا کی نعتیہ شاعری کے نمونے آپ سن چکے ہیں مگر ان شاعروں کی مجموعی شاعری کا کوئی واضح رشتہ نعت سے قائم نہیں ہوتا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ نعت مسلم معاشرے کی ایک روایت کی طرح ان کے کلام میں آئی ہے۔ انھوں نے نعتیں اپنے شعری مجموعے کے حرف آغاز کے طور پر لکھیں۔ اسی طرح جیسے حمد لکھی۔ شہیدی کی پوری شاعری نعت کی توسیع ہے۔ شہیدی کے بعد میلاد لکھنے والے شعرا یعنی غلام امام شہید اور اکبر میرٹھی بھی ان کی آواز کی بازگشت کا درجہ رکھتے ہیں۔

غالب، میر کے بعد اردو کے سب سے بڑے غزل گو ہیں۔ انھوں نے فارسی میں ہمیشہ یاد رکھنے والے نعتیہ اشعار لکھے ہیں۔ اردو میں انھوں نے جو نعتیہ اشعار کہے ہیں وہ ان کی شاعری اور شخصیت کا حصہ ہیں اور رسمی نعت گوئی سے کہیں آگے کی چیز ہیں۔ یہ نعتیہ اشعار ان کی غزلوں میں ''اچانک'' آ جاتے ہیں اور یوں جیسے اس دنیا میں جنت کی طرف ایک دریچہ کھل گیا ہو۔

اس کی اُمت میں ہوں میں، میرے رہیں کیوں کام بند
واسطے جس شہ کے غالب، گنبدِ بے در کھلا

غالب نعت کے باب میں ایک نئی تکنیک کے بانی اور موجد ہیں۔ ذکرِ رسول ﷺ اور یادِ رسول ﷺ زمانے کے مقابل صف آرائی میں ان کا مورچہ اور آخری پناہ گاہ ہے۔ غالب اپنے آپ کو اپنے پڑھنے والے سے چھپاتے ہیں۔ ان کو اکثر یہ بات گوارا نہیں ہوتی کہ ان کا سامع

اور قاری ان کی اداسی اور تنہائی کا نظارہ کرے۔ جن اشعار میں وہ بلند آہنگ اختیار کرتے ہیں وہ غم کو چھپانے کی ادا ہے، کہیں کہیں تھکن کے کسی لمحے میں وہ ہمیں اپنے وجود میں جھانکنے کی اجازت دے دیتے ہیں۔ ان کی ایک نہایت معروف غزل یوں شروع ہوتی ہے۔

دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں
خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں
کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل
انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں
یا ربّ زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے
لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں

یہ غالب کے زخم زخم اندرون کی تصویر ہے۔ وہ گردشِ مدام سے گھبرا کر خدا کے حضور استغاثہ پیش کرتے ہیں۔ ''لوح جہاں پہ حرف مکرر نہیں ہوں میں۔'' اور درِ خدا سے وہ اپنے رسول کی بارگاہ میں پہنچ جاتے ہیں۔ وہ قدم بوسی کی تمنا کرتے ہیں اور قدم بوسی کی اجازت چاہتے ہیں۔

کس واسطے عزیز نہیں جانتے مجھے
لعل و زمرّد و زرو گوہر نہیں ہوں میں
رکھتے تم قدم مری آنکھوں سے، کیوں دریغ
رتبے میں مہر و ماہ سے کم تر نہیں ہوں میں
کرتے ہو مجھ کو منع قدم بوس کس لیے
کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں

ان اشعار کی تفہیم میں ان کے کسی دوست نے اشکال کا شکوہ کیا اور غالب نے اسے یاد دلایا کہ وہ کون سی شخصیت ہے جس نے آسمان کو اپنے قدموں سے سرفراز کیا، اور وہ کون ہے جسے لعل و زمرد زر گوہر سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ غالباً حالی نے یادگارِ غالب میں اشعار سے بحث کی ہے

اور غالب نے کسی خط میں بھی ان اشعار کی تشریح کی ہے۔

غالب کی اسی تیکنک کے تمام امکانات اقبال کے ہاں ابھر کر سامنے آئے ہیں۔ اسی تیکنک کے بارے میں، میں نے عرض کیا تھا کہ حضور ﷺ کے وسیلے سے کائنات سے رشتہ قائم کرنا ہے اور کائنات کے واسطے سے حضور سے یہ تعلق پیدا کرنا ہے۔

وقت کی قید اور تقریر کے حدود کے تعین کی وجہ سے غالب کے عہد کے شعرا ذوق، بہادر شاہ ظفر اور قدرے بعد کے شاعروں انیس و دبیر کی نعت گوئی کے بارے میں کچھ عرض کرنا ممکن نہیں لیکن مومن خاں مومن کی ایک تضمین کا ذکر کرنا چاہوں گا۔ قدسی کی نعت

مرحبا سیدِ مکّی، مدنی العربی

پر اردو میں بے شمار تضمینیں لکھی گئی ہیں۔ میں نے ایسی تضمینوں کا ایک مجموعہ دیکھا تھا جو گزشتہ صدی عیسوی کے اختتام پر یا اسی صدی کے آغاز میں شائع ہوا تھا۔ مومن ہمارے اکابر شعراء میں سے ہیں اور انھوں نے قدسی کے ساتھ ہم آواز ہو کر سرکارِ ختمی مرتبت ﷺ کے حضور اپنے جذباتِ عقیدت پیش کیے ہیں۔ ایک بند ملاحظہ ہو:

دشت عالم میں سرا سیمہ گزاری اوقات
آج تک منزلِ مقصود نہ پائی ہیہات
مدد اے خضرِ کرامت کہ نہیں پائے ثبات
ماہمہ تشنہ لبانیم وتوئی آبِ حیات
لطف فرماکہ زحد می گزرد تشنہ لبی

غلام امام شہید کا ذکر شہیدی کے تذکرہ کے ساتھ کیا تھا۔ یہ ان شاعروں میں شامل ہیں جنھوں نے نعت کو سرمایۂ فن ہی نہیں متاعِ حیات بنا لیا۔ ان کا مولودِ شہید اب بھی پڑھا جاتا ہے اور اُس کی نعتوں کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ شہید نے واقعات کو نظم کرنے کی روایت کو مستحکم کیا اور ان کی تقلید میں یہ سلسلہ جاری رہا۔ انھوں نے طویل بحر میں ایک نعتیہ قصیدہ لکھا جس کی خوش آہنگی

قاآنی کی یاد دلاتی ہے۔ان کی یہ نعتیہ غزل آج بھی محفلوں میں پڑھی جاتی ہے۔

سینہ ہے مرا روکشِ صحرائے مدینہ
دل ہے جرسِ محملِ لیلائے مدینہ

محسن کاکوروی اور امیر مینائی اسی قبیلۂ نعت گویاں کے سالار ہیں اور اب میرا مطالعہ اِن کے دور تک آ چکا ہے،مگر میں ان کے ذکر سے پہلے عالم شعراء اور مولانا قاسم نانوتوی کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔نعت گو شعرا کے ایوان میں ہمارے،کئی جید علما نعت برلب اور عشقِ مصطفےٰ ﷺ دردل نظر آتے ہیں۔حضرت سید اسمٰعیل شہید کی نعتیہ مثنوی کے یہ شعر دیکھیے۔یہ اشعار ہی ان پر لگائے گئے الزامات رفع کرنے کے لیے کافی ہیں۔

دل ان کا جو ہے مخزنِ سرِ غیب
مبّرا خطا سے ہے بے شک وریب
بظاہر جو ہے مقطعِ انبیا
حقیقت میں ہے مطلعِ اصفیا
ہے اوّل ہی پیدا ہوا ان کا نور
بہ ظاہر کیا گو کہ آخر ظہور

مولانا محمد قاسم نانوتوی اسی مکتبِ فکر کے ترجمان ہیں۔دیوبند کے نام کے ساتھ ان کا نام وابستہ ہے۔بدنصیبی سے برِعظیم کے حنفی مسلمانوں کا ایک حصہ دیوبندی اور بریلوی گروہوں میں تقسیم ہوگیا۔اس محفل میں بھی دیوبندی اور بریلوی موجود ہیں اور میں اُس ذات گرامی کے واسطے سے جسے مومنوں کے لیے رؤف ورحیم بنا کر بھیجا گیا یہ عرض کروں گا کہ ان دونوں گروہوں کے اختلاف ایک مخصوص فضا اور تاریخی پس منظر میں پیدا ہوئے۔الحمدللہ آج فضا بدل گئی ہے،اور ہمیں باہمی تکفیر کی جگہ حضور ﷺ کی محبت کو اساس بناتے ہوئے ان اختلافات کو بھلا دینا چاہیے۔میری نظر میں یہ دونوں گروہ اسلام کے جلال وجمال کی نمائندگی کرتے ہیں۔یہ بھی واضح الفاظ میں کہتا

چلوں کہ ہم میں سے کسی کو یہ حق نہیں کہ دوسرے مسلمان سے حُبِ نبی ﷺ کا ثبوت اور سند طلب کرے۔

اس گریز با موقع کے بعد مولانا محمد قاسم نانوتوی کے چند نعتیہ اشعار پیش کرتا ہوں۔ ان میں تو حضور ﷺ سے خطاب بھی ہے اور پھر یہ تو دیکھیے کہ ان کی تمنا حضور ﷺ اور مدینہ کے حوالے سے کیا ہے۔ یہ وہی تمنا ہے۔ جس کی تکرار بعد میں مولانا احمد رضا خاں علیہ الرحمہ کے نعتیہ کلام میں ملتی ہے۔

تو فخرِ کون و مکاں، زبدۂ زمین و زماں
امیرِ لشکرِ پیغمبراں ، شہِ ابرار
امیدیں لاکھوں ہیں لیکن بڑی امید ہے یہ
کہ ہو سگانِ مدینہ میں میرا شمار
جیوں تو ساتھ سگانِ حرم کے تیرے پھروں
مروں تو کھائیں مدینہ کے مجھ کو مرغ و مار
اُڑا کے باد مری مُشت خاک کو پسِ مرگ
کرے حضور کے روضہ کے آس پاس نثار

ہمارے وہ علما جنھوں نے علم کے ذریعہ مقامِ محمدی ﷺ سے ہمیں آشنا کیا اور اپنے اشعار کے وسیلے سے اپنے جذباتِ عشقِ رسول کا اظہار کیا ان میں حاجی امداد اللہ مہاجر مکی، مذاق میاں بدایونی، مولانا حسن بریلوی، سید سلیمان ندوی، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا ابو الکلام آزاد اور مولانا مفتی محمد شفیع وغیرہ شامل ہیں۔ اس گروہ کے ممتاز ترین شاعر بلاشبہ مولانا احمد رضا خاں بریلوی ہیں جو اردو کی نعتیہ شاعری کے اہم نمائندوں اور شاعروں میں شامل ہیں۔ ان کا ذکر میں محسن کاکوروی اور امیر مینائی کے بعد حالی کے ساتھ کروں گا، لیکن مجھے اجازت دیجیے کہ انیسویں صدی کے ممتاز علما کے مرشد اور قطب الاقطاب حضرت امداد اللہ مہاجر مکی کی ایک نعت کے چند شعر آپ کی خدمت میں پیش کردوں۔ یہاں بھی تخاطب رسول اللہ ﷺ سے ہے اور وہ بھی ہجرت کے

پس منظر کے ساتھ۔ مولانا قاسم نانوتوی اور حاجی صاحب نور اللہ مرقدہ کے اشعار کو دہرانے سے اُن چند سخت مزاج صاحبان کا علاج ہو سکے گا جو اپنے آپ کو ان سے نسبت دیتے ہیں اور سرورِ کائنات ﷺ سے تخاطب کو شرک سے کچھ ہی کم درجہ کی چیز سمجھتے ہیں۔

کر کے نثار آپ پہ گھر بار یارسول ﷺ
اب آ پڑا ہوں آپ کے دربار یارسول ﷺ
دونوں جہاں میں مجھ کو وسیلہ ہے آپ کا
کیا غم ہے گرچہ ہوں میں بہت خوار یارسول ﷺ
کیا ڈر ہو اس لشکرِ عصیان و جرم سے
تم سا شفیع ہو جس کا مددگار یارسول ﷺ
ہو آستانہ آپ کا ، امداد کی جبیں
اور اس سے زیادہ کچھ نہیں درکار یا رسول

امیر مینائی اور محسن کاکوروی آج اپنے نعتیہ کلام کی وجہ سے زندہ ہیں اور یوں کہ ان کے نعتیہ اشعار ہمارے دلوں کی دھڑکن میں شامل ہیں۔ ویسے تو امیر مینائی نے غزل کے تین دیوان اور ایک تذکرہ شعرا اپنی یادگار چھوڑا ہے، لیکن ان کی شناخت اور تشخص ان کی نعت گوئی ہے۔ ان کی غزل میں تاثیر کی کمی شاید اس لیے ہے کہ عشقیہ مضامین ان کے احوال سے تعلق نہیں رکھتے، لیکن ان کی نعت میں دل اور فن دونوں شریک ہیں۔ امیر نے ویسے تو غزل ہی کی ہیئت کو نعت میں زیادہ استعمال کیا ہے، مگر ان کا مسدسِ میلاد، اردو کی نعتیہ شاعری میں اپنی جگہ رکھتا ہے۔ امیر نے صلی اللہ علیہ وسلم کی ردیف کافی نعتوں میں استعمال کی ہے۔ وہ دکھ، مایوسی اور اضطراب کے عالم میں نبی کریم ﷺ کی یاد اور ذکر کے نغمے چھیڑ دیتے ہیں۔

کوئی دل نواز یہاں نہیں، مجھے تابِ ضبطِ فغاں نہیں
میرے دل میں ہے جو غم نہاں، نہ کہوں جو تم سے تو کیا کروں

اور امیر کا یہ شعر تو اکثر ہمارے لبوں پر ہماری حسرت بن کر ابھرتا ہے۔

جب مدینے کا مسافر کوئی پا جاتا ہوں
حسرت آتی ہے یہ پہنچا میں رہا جاتا ہوں

محسن کاکوروی کی عظمت یہ ہے کہ لکھنؤ کے فنی تصورات، لفظ تراشی، اہتمام شاعرانہ اور لفظی و تخلیقی نزاکتوں کے رخ کو انھوں نے ہوا و ہوس کی طرف سے موڑ کر ثنائے شاہِ مدینہ کے ذریعہ ایک نئی شاعرانہ محفل لکھنؤ میں آراستہ کی۔ لکھنؤ کی محفلِ عشرت میں اخلاقی عناصر انیس و دبیر اور دوسرے مرثیہ گوشعرا کے ذریعہ آئے تھے۔ مجموعی طور پر آتش کے استغنیٰ کے ساتھ عشقیہ شاعری کی سطح بھی وہاں زیادہ بلند نہیں تھی۔ محسن کاکوروی نے اردو کی نعتیہ شاعری کو زبان و بیان اور فن کی معراج تک پہنچایا۔ ان کا قصیدہ ''سمت کاشی سے چلا......'' آج بھی اپنے انداز کا مکمل ترین نمونہ ہے، اگرچہ دوسروں نے اس کی تقلید کی۔ ''صبح تجلی'' اور ''چراغ کعبہ'' محبت اور فنِ سخن کے آئینہ خانے اور شیش محل ہیں۔ صنائع لفظی و معنوی کا ایسا استعمال صرف نعتیہ شاعری میں شاید ہی کہیں ملے اگرچہ شعرائے لکھنؤ کی معراج ہی صنائع اور بدائع کا استعمال تھا۔ محسن کے ہاں علمی اور دینی حوالوں اور استعاروں نے ان کے کلام کو عام آدمی کی دسترس سے اکثر مقامات پر دور کر دیا ہے، لیکن تجسیم اور سراپائے رسول ﷺ کے جو نمونے ان مثنویوں میں ہیں ان کی کوئی دوسری مثال میری نظر میں نہیں۔ رات کا، کعبہ میں وضو کے ساتھ آنا، تجسیم کا کمال ہے، اِسی طرح ان جیسا سراپا کسی اور کے یہاں نہیں:

حقا کہ وہ جسم سر سے تا پا
ہے شاہدِ غیب کا سراپا
ابرو پہ جبینِ مہ شمائل
رکھی ہوئی رحل پر حمائل

پیشانی ہے جزوِ مصحفِ رو
اس پارے کے دو رکوع ابرو
جوہر کا بھرا ہوا خزینہ
آئینۂ بے مثال سینہ
اس گردن صاف کی بلندی
تکبیر فریضۂ سحر کی
رعنائی قامتِ مناسب
روزے میں اذانِ وقت مغرب

شاید میں نے ابتداء میں عرض کیا ہو کہ بعض نقادنعت میں سراپا پیش کرنے کے قائل نہیں۔اس بارے میں کوئی حکم نہیں لگایا جاسکتا۔اس کا تعلق شاعر کے سلیقۂ کلام سے ہے۔شاعر اگر کتاب شمائل کے اجزاء کو شعری سراپا میں بدل دے تو اس کے اشعار سے ہمارے سینہ کی دنیا جگمگ کر اٹھتی ہے۔

محسن کا یہ شعران کی نعتیہ شاعری پر شاعرانہ تبصرہ ہے۔

خدا کے سامنے محسن پڑھوں گا وصفِ نبی ﷺ
سجے ہیں جھاڑ یہ باتوں کے ،لامکاں کے لیے

حالی نعت گوئی کی دنیا میں ایک بڑا انقلاب لے کر آئے ۔ویسے بھی انیسویں صدی کا نصف آخر ہمارے ادب میں بڑے دوررس انقلابات کا زمانہ ہے۔حالی کا دور بیک وقت ہماری غلامی، ہمارے زوال اور ہمارے نشاۃ الثانیہ کا عہد ہے۔نام کی مغلیہ سلطنت ختم ہو چکی تھی۔ ہندوستان تاج برطانیہ کے زیرِ نگیں آچکا تھا۔مسلمانوں کا ایک طبقہ رونما ہونے والی تبدیلیوں کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہ تھا اور ماضی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ایک گروہ نے ماضی سے رشتہ توڑ کر حال سے سمجھوتہ کرلیا اور اپنی تاریخ کو زمانۂ ظلمت قرار دے کر اپنا مقدر دانش فرنگ کے سپرد کر دیا۔سرسید احمد خاں

نے حال کی تفہیم اور مستقبل کی تعمیر کے کام میں ماضی اور مسلمانوں کے تشخص کی اہمیت کو بھی سمجھا۔ حالی قافلۂ سید ہی کے رہرو تھے۔ انھوں نے مسدسِ حالی میں ہمارے ثقافتی ورثہ کو بھی پیش کیا ہے، اور حال کی ابتری کا نقشہ بھی ہمیں دکھایا ہے۔ انھوں نے اپنے بہت سے قارئین کی طرح محسوس کیا کہ مسدس کے مطالعہ سے مستقبل کے بارے میں مایوسی پیدا ہوتی ہے۔ اسی لیے ایک طرف انھوں نے مسدس کا ضمیمہ لکھا اور دوسری طرف حضرت رحمۃ للعالمین اور ہمارے رؤف ورحیم کے حضور ہمارا استغاثہ پیش کیا۔ حالی نے ہمارے اجتماعی حالات اور ملی وسیاسی معاملات سے نعت کا رشتہ قائم کیا۔ ان سے پہلے نعت کا تعلق اجتماعی ''تقاریب'' سے تو تھا مگر معاملات سے نہیں۔ ان سے پہلے نعت کی صنف میں مسلمانوں کی ہیئتِ اجتماعیہ پر فکر کی گنجائش نہیں تھی۔ حالی اس حقیقت تک پہنچ گئے جس کا اظہار اقبال نے یوں کیا ہے کہ اللہ نے ہمیں ایک دین عطا کیا اور رسول اللہ ﷺ نے ہمیں ایک ملّت بنایا۔ ملّت اپنا استغاثہ ملّت گر کی خدمت ہی میں پیش کر سکتی ہے۔

اے خاصۂ خاصانِ رسل، وقت دعا ہے
اُمت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے
جو دین کہ ہمدردِ بنی نوع بشر تھا
اب جنگ و جدل چار طرف اس میں بپا ہے
فریاد ہے اے کشتیِ امت کے نگہباں
بیڑا یہ تباہی کے قریب آن لگا ہے
تدبیر سنبھلنے کی ہمارے نہیں کوئی
ہاں ایک دعا تیری کہ مقبولِ خدا ہے

مسدسِ حالی کے نعتیہ اشعار سو سال سے زیادہ عرصے سے جنوبی ایشیاء کی فضاؤں اور ہمارے قلوب واذہان میں گونج رہے ہیں۔ ولادتِ سرکارِ دوعالم ﷺ پر یہ شعر اردو میں حسن اظہار کی آخری حد ہے:

ہوئی پہلوئے آمنہ سے ہویدا
دعائے خلیلؑ اور نویدِ مسیحاؑ

مسدس میں حالی نے احادیثِ نبوی کا ترجمہ جس صحت، احتیاط اور حسنِ بیان کے ساتھ کیا ہے، اس نے اس ضمن میں بعد کے شعرا کی رہنمائی کی۔

مولانا احمد رضا خاں بریلوی کا نعتیہ کلام آج بھی ایک زندہ حوالے کا درجہ رکھتا ہے۔ وہ ایک کثیر التصانیف عالم ہیں، اور حیرت ہوتی ہے کہ اس کے باوجود انھوں نے نعت کا بڑا سرمایہ اپنی یادگار چھوڑا ہے۔ بات یہ ہے کہ حضور ﷺ سے ان کی وابستگی خود بخود شعر کے قالب میں ڈھل جاتی تھی۔ مصطفےٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام'' اردو کا معروف ترین سلام ہے اور اس کے اثرات بعد کے شاعروں کے سلاموں میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ مولانا کی بہت سی نعتوں پر دوسرے شاعروں نے نعتیں لکھی ہیں۔ مثلاً اس نعت پر

واہ کیا جود و کرم ہے شہِ بطحا تیرا
''نہیں'' سنتا ہی نہیں، مانگنے والا تیرا

''تیرا'' کی ردیف سے ایک بات یاد آ گئی۔ پاکستان کے ایک نہایت اچھے نعت گو اپنے اس نظریہ کا خاصے تشدد سے پرچار کرتے ہیں کہ امام الانبیا ﷺ کے لیے تو اور تم کی ضمیریں استعمال کرنا گستاخی ہے۔ اس رائے کو قبول کرنا بہت مشکل ہے۔ ''تو'' کا لفظ اللہ تعالیٰ کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے کہ اس کی وحدت کا اشارہ ہے اور حضور ﷺ کے لیے بھی نبیوں میں ان کی یکتائی کے پیش نظر مستعمل ہے۔ پھر اس لفظ میں جو قربت اور محبت ہے وہ کسی اور خطابیہ لفظ میں نہیں۔ ہاں جسے گستاخی کا پرتو نظر آئے اس کے لیے ''تو'' اور ''تم'' سے مکمل اجتناب لازم ہے۔

انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے آغاز کے کتنے ہی شعرا کے نام ذہن میں آ رہے ہیں مثلاً آسی غازی پوری، لطف بریلوی، اسمٰعیل میرٹھی، شاد عظیم آبادی، اکبر میرٹھی لیکن میں اپنے نعت کے عظیم تر شعرا یا اردو کے اہم شاعروں کی نعتوں تک محدود رکھنے پر مجبور ہوں۔ شاد عظیم

آبادی ضرور تذکرہ کے مستحق ہیں۔ ان کا ایک نعتیہ مسدس مجھے بہت پسند ہے، مگر افسوس اس کا کوئی مکمل بند یاد نہیں۔ معراج کے سلسلہ میں ایک بند کا ایک شعر ضرور یاد ہے اور اس شعر میں نعت گوئی کی اہمیت پر تبصرہ بھی ہے:

نعتِ رسول حق ہے ہماری سرشت میں
اُمت پہ اس کا راز کھلے گا بہشت میں

میں اقبال کی نعت گوئی سے پہلے بوجوہ مولانا محمد علی جوہر، مولانا حسرت موہانی، اصغر گونڈوی اور جگر مرادآبادی کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں۔ مولانا محمد علی جوہر اور حسرت موہانی کی نعت گوئی میں ان کی شخصیتوں کا پرتو ہے، اور ان کی شخصیت کا سب سے نمایاں رنگ عشقِ رسول عربی ﷺ ہے۔ پھر حضور ﷺ کی سیرت پاک نے ان دونوں کو کارزارِ جہاد میں حوصلہ اور استقامت عطا کی۔ حسرت، اصغر اور جگر کا رشتہ بھی بہت واضح ہے۔ جدید اردو غزل کی تعمیر انھیں بزرگوں نے کی۔ ان نقش گرانِ غزل جدید میں فانی، یگانہ اور فراق گورکھپوری بھی شامل ہیں۔ فانی اور یگانہ کی نعت گوئی کا مجھے علم نہیں، فراق نے ضرور نعتیہ اشعار کہے ہیں۔

مولانا محمد علی جوہر کی زندگی عشقِ محمدی ﷺ کا صحیفہ ہے۔ وہ حضور اکرم ﷺ کی حرمت پر جان قربان کرنے والوں میں تھے۔ ان کی ایک نعت کے اشعار میں نے نماز کے بعد بھی پڑھے ہیں۔ جاپان میں مدینہ کی حاضری کی تمنا سے جب سینہ شق ہونے لگتا تو یہی شعر اس تمنائے حاضری کو آنسوؤں میں بدل کر دل کی لگی کو شبنم صفت الفاظ سے ٹھنڈا کر دیتے۔ یہی لفظ آتشِ شوق کو بڑھاتے اور یہی لفظ تسلی بھی بن جاتے۔ یہ شاعر کے عشق اور شاعری دونوں کا کمال ہے:

تنہائی کے سب دن ہیں، تنہائی کی سب راتیں
اب ان سے لگیں ہونے خلوت میں ملاقاتیں
معراج کی سی حاصل سجدوں میں ہے کیفیت
اک فاسق و فاجر میں اور ایسی کراماتیں

بے مایہ سہی لیکن شاید وہ بلا بھیجیں
بھیجیں ہیں درودوں کی کچھ ہم نے بھی سوغاتیں

مولانا حسرت موہانی نے متعدد حج کیے اور اپنے جد امجد ﷺ کے روضے پر حاضری دی۔ کسی نے پوچھا کہ مولانا شرعی طور پر بار بار حج کرنے کا کیا مسئلہ ہے۔ عاشقوں کی سادگی کے ساتھ جواب دیا کہ میں تو رسول اللہ ﷺ کے روضہ کی حاضری کے لیے جاتا ہوں، بس اتنا اہتمام کر لیتا ہوں کہ ذی الحجہ میں جاؤں۔ مدینہ ان کے لیے شہر محبت تھا، اور وہاں کے باسیوں کے بغیر اس شہر کے منظر نامہ کی تکمیل بھلا کیسے ہو سکتی تھی اور وہ بھی حسرت کے لیے۔

پھر آنے لگیں شہر محبت کی ہوائیں
پھر پیش نظر ہو گئیں جنت کی فضائیں
نظارہ فروزی کی عجب شان ہے پیدا
یہ شکل و شمائل ، یہ عبائیں ، یہ قبائیں

مجھے مدینہ منورہ کی فضاؤں میں مولانا حسرت بار بار یاد آئے اور اچانک ان کے تجربوں پر اپنے تجربوں کا گمان ہوا۔ ''گنبد'' اور ''دریا'' کے درمیان بظاہر کوئی معنوی رشتہ نظر نہیں آتا لیکن حسرت جیسا شاعر اور عاشق ایک ایک تلازمہ ذہنی کی تخلیق تار نظر کے عنصر کی بنا پر یوں کرتا ہے۔

جب دور سے وہ گنبد خضریٰ نظر آیا
بہتا ہوا اک نور کا دریا نظر آیا

کانپور کی سڑکیں گواہ ہیں اور آپ حضرات میں سے بہتوں کی آنکھیں بھی شاہد ہوں گی کہ جب حسرت اپنے گھر سے نکلتے تو ذہن میں اچانک یہ خیال آتا کہ یہ شخص قرنِ اوّل کے کارواں کا فرد ہے۔ جو نہ جانے وقت کے کس قانون کے تحت ہمارے درمیان آ گیا ہے اور یہ شخص ذاتِ نبی ﷺ کریم سے حاصل ہونے والی توانائی کے سہارے فرنگی سامراج سے لڑتا ہے۔

ڈر غلبۂ اعدا سے نہ حسرت کہ ہے نزدیک
فرمائیں مدد سید والائے مدینہ

اصغر گونڈوی کے لیے تصوف قال نہیں بلکہ حال تھا۔تصوف کے مضامین اردو کے کس شاعر کے ہاں نہیں۔لیکن میری ناچیز رائے میں خواجہ درد، آسی غازی پوری اور اصغر گونڈوی اردو کے نمائندہ صوفی شاعر ہیں۔اصغر کا تصوف سلوک، معرفت اور تزکیۂ نفس کا دوسرا نام ہے اور یہ مقامات محمدی ﷺ کی دنیا میں سفر کرنے سے حاصل ہوتے ہیں۔اصغر نگاہِ نبوت کی انسان سازی اور بہت سے آدمیوں کے گریزِ حق سے باخبر تھے۔شاید اس نکتہ کو شعر کی زبان میں اصغر سے بہتر کسی نے ادا نہیں کیا۔

فراغ حسن سے تیرے چمک گئی ہر شے
ادا و رسم بلالیؓ و طرزِ بولہبی

اصغر سے میرا ایک شخصی رشتہ بھی ہے۔ایک نعتیہ مشاعرے میں ان کا مصرع، مصرعہ طرح تھا اور اس مصرع کی تضمین لازم تھی۔اس نعت کے چند شعر سنیئے۔یہ مصرع، مصرعہ تھا۔

"بیخود ہوں تہ سایۂ دامانِ محمد ﷺ"

اس نعت میں بھی حضرت صدیقؓ کے حوالے سے اصغر نے وہی بات کہی ہے۔جو ابھی ابھی میرے پیش کردہ شعر میں حضرت بلالؓ کے حوالے سے کہی تھی۔

کچھ صبحِ ازل کی، نہ خبر شامِ ابد کی
بیخود ہوں تہہ سایۂ دامان محمد ﷺ
تو سینۂ صدیقؓ میں اک راز نہاں ہے
صدقے ترے اے صورت جانانِ محمد ﷺ
اے حسنِ ازل اپنی اداؤں کے مزے لے
ہے سامنے آئینہ حیرانِ محمد ﷺ

میں ذاتی رشتہ کی بات کہہ رہا تھا۔ میں نے اپنی پہلی نعت اسی طرح میں کہی، اور کوئی ۳۵ سال پہلے یہ نکتہ اصغر مرحوم سے ہی سیکھا کہ صحابہ اکرامؓ کے ذکر کے بغیر نعت، نعت نہیں بن پاتی اپنا مصرع یاد آیا:

میزانِ جہاں حلقۂ یارانِ محمد ﷺ

اور یہ اصغر کی نظرِ کیمیا اثر تھی جس نے جگر کی مستی کا عشق محمد ﷺ کی جاوداں مستی سے رشتہ قائم کر دیا۔

اک رند ہے اور مدحتِ سلطانِ مدینہ
ہاں کوئی نظر ، رحمتِ سلطان مدینہ
اس امتِ عاصی سے نہ منہ پھیر خدایا
نازک ہے بہت غیرتِ سلطانِ مدینہ

جگر صاحب نے تو بہت وسیع اور نازک سیاق وسباق میں ''غیرت سلطان مدینہ'' کا ذکر کیا ہے، لیکن میں اپنی ذات کے حوالے سے یہ عرض کروں گا کہ دیارِ مغرب میں اس مصرع کی سنگین نزاکت نے کئی بار میرے قدموں کو استقامت عطا کی، اور مجھے اپنے آپ سے شرمندہ ہونے سے بچالیا۔

ہماری قومی تاریخ کا یہ عجب کرشمہ ہے کہ شعر و سیاست وعلم و ہنر کی کیسی دیو قامت شخصیتیں ایک ساتھ جمع ہو گئی تھیں۔ اس قحط الرجال کے دور میں ہم اپنے بچوں اور نو جوانوں کا ذکر اقبال سے پہلے آ گیا کیونکہ میں اصغر اور جگر کے درمیان فصل پیدا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اقبال تو مجمع البحرین ہیں۔ ان کی شخصیت کے افق پر مشرق اور مغرب ایک دوسرے سے ہم آغوش ہو گئے تھے۔ انھوں نے شاعری کو نئی زبان اور نئے حوالے عطا کیے۔ اگر اردو میں کسی شاعر کی شاعری میں پیغمبری کا جز نظر آتا ہے تو وہ اقبال ہیں۔ صاحبِ خلقِ عظیم، معلم انسانیت ﷺ کی ذات کے ان گنت رنگوں کو اقبال نے اپنی نظروں میں آباد کر لیا اور یوں کہ ہر دید، ہر نظارہ انھیں رنگوں کو اقبال نے اپنی نظروں میں آباد کر لیا

اور یوں کہ ہر دید، ہر نظارہ انھیں رنگوں کا عکس ہے۔ اقبال نے اردو میں شاید اپنے ابتدائی دور کی ایک نعت کے سوا کوئی باضابطہ نعت نہیں کہی، اور وہ نعت روایتی انداز کی نعت ہے اگرچہ عشق کی رستی اس میں کچھ کم نہیں:

خیال راہِ عدم سے اقبال تیرے در پر ہوا ہے حاضر
بغل میں زادِ عمل نہیں ہے، صلہ مری نعت کا عطا کر

بانگ درا کی کئی نظموں میں خیال شاہ مدینہ یوں شامل ہے کہ نعت کی ہر تعریف بدل جاتی ہے۔ حضرت بلال حبشی پر ان کی نظم، ''جنگ یرموک کا ایک واقعہ''، ''ایک حاجی مدینہ کے راستے میں'' اور ''حضور رسالت مآب''، ''آپ ﷺ میں''۔ ''جواب شکوہ'' میں عشق محمدی ﷺ کی بجلیاں مسلسل چمکتی اور ہماری راہوں کو روشن کرتی نظر آتی ہیں، اور محمد عربی ﷺ سے رشتہ استوار کرنے کا سبق اقبال نے مسلمانوں کو خدا کی زبان سے دیا ہے۔ یہ قرآن کے اسلوب کا اتباع ہے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کی زبانی ہمیں یہ حکم دیا ہے کہ ''اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میرا اتباع کرو۔ اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمھارے گناہ معاف کردے گا۔'' (آل عمران:۳۱)

جواب شکوہ میں اللہ مسلمان سے کہتا ہے:

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسمِ محمد ﷺ سے اُجالا کر دے

اور اگلے بند میں تسلسل کلام کو جاری رکھتے ہوئے اس نام کے بارے میں یہ شعر ملتا ہے۔

خیمۂ افلاک کا استادہ اسی نام سے ہے
نبضِ ہستی تپش آمادہ اسی نام سے ہے

اقبال کی نظم ذوق وشوق میں، جس کے بیشتر اشعار فلسطین میں کہے گئے۔ جو نعتیہ اشعار ہیں ان کی کوئی مثال اردو شعر وادب میں نہیں۔ مجھے تعجب ہے کہ اردو کے بعض معتبر نقادوں نے ان اشعار کو حمدیہ قرار دیا ہے حالانکہ ''شوکت سنجر و سلیم'' اور ''فقر جنید و بایزید'' سے بات واضح ہو جاتی

ہے۔ان اُمتیوں کی صفات اور علوئے رتبہ کا تعلق رسول کی ذات سے ہی ہوسکتا ہے کیونکہ رسول ہی کی صفات ان میں جزوی طور پر اُبھری ہیں:

لوح بھی تو ، قلم بھی تو، تیرا جود الکتاب
گنبد آبگینہ رنگ تیرے محیطِ میں حباب
عالم آب وخاک میں تیرے ظہور سے فروغ
ذرۂ ریگ کو دیا تونے طلوعِ آفتاب
شوکت سنجر و سلیم، تیرے جلال کی نمود!
فقر جنید و بایزید ، تیرا جمالِ بے نقاب
شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب! میرا سجود بھی حجاب
تیری نگاہ ناز سے دونوں مراد پاگئے
عقل غیاب و جستجو! عشق حضور و اضطراب

اور پھر اقبال کے وہ اشعار جو نومبر ۱۹۳۳ء میں حکیم سنائی کے مزار پر حاضری کے تاثر کے طور پر حکیم سنائی کے مشہور قصیدے کی پیروی میں لکھے گئے۔

وہ دانائے سبل، ختم الرسل، مولائے کل جس نے
غبار راہ کو بخشا، فروغِ وادیٔ سینا
نگاہِ عشق ومستی میں وہی اوّل، وہی آخر
وہی قرآں، وہی فرقاں، وہی یسٰین، وہی طٰہٰ

اقبال کے ساتھ ہی ظفر علی خاں کا نام ہمارے ذہن میں آتا ہے۔مولانا محمد علی جوہر اور حسرت موہانی کی طرح ظفر علی خان بھی ہمارے معتبر سیاسی راہنما اور ممتاز صحافی تھے۔ان کی سیاست ہو یا صحافت، دونوں عشق محمدی کی تنویر سے منور تھیں۔ظفر علی خان کے لیے حضرت محمد ﷺ

احمد مجتبیٰ علیہ کی ذات گرامی اہل ایمان کی ابدی دنیا کی طرح ہے جس میں ہم آباد ہیں۔ان کی دو نعتیں تو ضرب المثل کے درجہ تک پہنچ گئی ہیں:

دل جس سے زندہ ہے وہ تمنا تمھی تو ہو
ہم جس میں بس رہے ہیں وہ دنیا تمھی تو ہو

اور

وہ شمع اجالا جس نے کیا چالیس برس تک غاروں میں

بیسوی صدی کے دوسرے ممتاز نعت گو شعرا جن کا نعتیہ کلام پاکستان بننے سے پہلے اور پاکستان بننے کے بعد فضاؤں میں گونجتا رہا اور آج بھی گونج رہا ہے، ان سب کا تفصیلی ذکر نہیں کیا جا سکتا اور زمانی قرب کی وجہ سے آپ صاحبان ان سے خوب واقف بھی ہیں۔اس دور میں عزیز لکھنوی نے بہت اچھے نعتیہ قصیدے لکھے۔اقبال سہیل نے اس سلسلے کو اور آگے بڑھایا اور مجموعی طور پر میرے نزدیک وہ ہمارے عہد کے سب سے ممتاز نعتیہ قصیدہ گو شاعر ہیں۔جوش ملیح آبادی اور سیماب اکبر آبادی نے ایسی نعتیہ نظمیں لکھی ہیں جن میں ان کے فن کی پوری ترجمانی ملتی ہے۔جوش صاحب کی دو نعتیہ نظمیں ان کی شاعری کے معلوم محاسن سے مرصع ہیں۔الفاظ کی شان وشوکت، شاعرانہ فضا کی تخلیق وہ اندرونی جذبہ جس سے الفاظ کے رخسار تمتما اُٹھتے ہیں۔نظم قصیدہ کی ہیئت میں لکھی گئی ہے اور اس میں نبی اکرم علیہ سے خطاب ہے۔نظم کے اختتامی حصہ میں فریاد اور استغاثہ کا رنگ آ گیا ہے جو حالی کے عرض حال بحضور سرور کائنات کی یاد دلاتا ہے:

تجھ پہ نثار جان و دل مڑ کے ذرا یہ دیکھ لے
دیکھ رہی ہے کس طرح ہم کو نگاہ کافری
تیرے فقیر اور دیں کوچۂ کفر میں صدا
ترے غلام اور کریں اہل جفا کی چاکری

قیام پاکستان سے پہلے ہی حفیظ جالندھری، ماہر القادری، بہزاد لکھنوی، زائر حرم حمید

لکھنوی وغیرہ کے نعتیہ نغمے مقبولیت ماہر حاصل کر چکے تھے۔ حفیظ کے شاہنامہ اسلام کی چار جلدوں کو کسی نے اردو کی سب سے طویل نعتیہ نظم کہا ہے اور بجا طور پر حفیظ اور ماہرالقادری کی نعتیہ شاعری پر حالی اور اقبال کے واضح اثرات ہیں۔ ان شاعروں نے نبی کریم ﷺ کی ذات وصفات کے تذکرے کے ساتھ آپ کی تعلیمات اور آپ کے بپا کردہ انقلاب کا بھی ذکر کیا ہے۔ وہ انقلاب جس نے مساوات، حریت واخوت کو انسانی معاشرے کی زندہ حقیقتوں میں بدل دیا۔ حفیظ جالندھری کے یہ شعر ملاحظہ ہوں:

وہ جس نے تخت اوندھے کر دیے شاہانِ جابر کے
بڑھائے مرتبے دنیا میں ہر انسانِ صابر کے
دلایا جس نے حق انسان کو عالی تباری کا
شکستہ کر دیا ٹھوکر سے بت سرمایہ داری کا

حفیظ اور ماہرالقادری کے سلام بھی بہت مقبول ہوئے۔ مقبول القادری کی نعتوں میں سرکار دوعالم ﷺ سے شخصی وابستگی بھی ہے اور انھوں نے حضور ﷺ کے تا قیامت قائم رہنے والے کارناموں کو بھی یوں پیش کیا ہے ان کے آنے والے شاعروں کے نغموں میں ان کے آہنگ کی بازگشت سنائی دیتی ہے:

امیروں کو راز اخوت بتایا
غریبوں کے حاجت روا بن کے آئے
کہیں عفو و رحمت کے جلوے دکھائے
کہیں وہ نبرد آزما بن کے آئے
کہیں بدر و خندق میں فوجیں لڑائیں
کہیں صلح کا سلسلہ بن کے آئے

بہزاد لکھنوی کی نعتوں میں غزل کی اصطلاحات اور علامتیں اس طرح ملتی ہیں کہ ان سے

ایک عشقیہ فضا وجود میں آتی ہے لیکن تقدس مجروح نہیں ہوتا۔ زائر حرم حمید لکھنوی کی نعتوں میں ایسا تسلسل اور یادوں کے ایسے سلسلے ہیں کہ آدمی ان کے ساتھ حرمین میں پہنچ جاتا ہے۔ خاص طور پر مدینہ منورہ کی زمین اور آسمان اور فضائیں قاری کو اپنی آغوش میں لے لیتی ہیں۔ یہ انداز ان کے علاوہ اس تواتر سے جناب عبدالعزیز شرقی مہاجر مدنی کے ہاں ملتا ہے۔ اللہ انھیں سلامت رکھے اور ہم ان سے مدینہ کی، مدینہ کے در و دیوار کی باتیں سنتے رہیں۔

قیام پاکستان کے وقت ان شاعروں اور ان کے دوسروں ہم عصروں کی نعتیں شمالی ہند کے مسلم معاشرہ کے تشخصی عناصر میں شامل تھیں۔ ان شاعروں میں حفیظ جالندھری، ماہر القادری، بہزاد لکھنوی، احسان دانش، حفیظ الرحمٰن، رئیس امروہوی، شورعلیگ، سید آل رضا، فضل کریم فضلی وغیرہ پاکستان کے شہری بنے۔ جوش ملیح آبادی، سیماب اکبر آبادی، آرزو لکھنوی اور نہال سیوہاروی نے بھی پاکستان کو اپنایا۔ یہ وہ لوگ تھے جو اس حقیقت سے باخبر تھے کہ ایک قوم نے اپنا وطن حاصل کیا ہے اور وہ جغرافیائی حدود کے تحت ایک نئے ملک کے شہری نہیں بنے ہیں۔ پاکستان کے قیام نے نعت گوئی کو ملّی مطالبوں، تقاضوں اور اجتماعی زندگی سے ہم آہنگ کر دیا۔ مدینۂ منورہ کی اسلامی ریاست کے بعد پاکستان تاریخ کی دوسری ریاست تھی جو اسلام کے نام پر حاصل کی گئی۔

حضرات گرامی! ہندوستان کے مسلمان کئی پہلوؤں سے اسلام کی ترجمانی کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ آپ نے اسلامی تشخص کو برقرار رکھا ہے۔ آپ کس حد تک اپنے امور مملکت میں شامل ہیں اس کے بارے میں کچھ کہنے کا مجھے حق نہیں، لیکن یہ ضرور عرض کروں گا کہ:

عالم آزاد گاں ہے اک جہاں سب سے الگ

اور پاکستان جنوبی ایشا میں مسلمانوں کا عالم آزادگاں ہے۔ آزادی کے تقاضے بڑے سنگین ہوتے ہیں۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ تاریخ کے کئی نازک موڑوں پر ہم نے عالم اسلام اور خود اپنے آپ کو مایوس کیا ہے، لیکن یہ بھی عرض کروں گا کہ مجموعی طور پر پاکستان کے دانش وروں، ادیبوں اور شاعروں کی فکری سمت درست ہے وہ اس عہد اور میثاق کو نہیں بھولے ہیں جو ان کے آبا نے

تحریک پاکستان کے وقت اپنے آپ سے اور آنے والی نسلوں سے کیا تھا۔ پاکستان کی شاعری میں یہ ملی رنگ مسلسل باقی رہا نعت گوئی اسی ملی رنگ کا مقدمہ ہے۔ یہی وہ بنیادی رنگ ہے جس سے دوسرے رنگوں کے چشمے پھوٹتے ہیں۔ قومی جذبہ کو اعلیٰ شاعری میں بدلنا بہت مشکل مرحلہ ہے۔ اکثر ایسی شاعری فرمائشی یا اوپری سی چیز ہو کر رہ جاتی ہے، لیکن پاکستان قوم ایسی آزمائشوں سے گزری کہ اس کے فن کاروں کی نوا لہو ترنگ بن گئی۔ صداقت کی امین۔ انھیں آزمائشوں کے کتنے ہی لمحے نعت بن گئے۔

پاکستان کی نعتیہ شاعری میں شاعروں کا وہ ذاتی جذبہ اور شخصی عنصر بھی موجود ہے جو ہر اُمتی کو صاحب گنبد خضریٰ ﷺ سے وابستہ کرتا ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ عہد حاضر کے شہر آشوب میں یہی ذات گرامی سائبان اور پناہ گاہ کا درجہ رکھتی ہے۔ ۱۹۷۷ء کے بعد اسلامی نظام کے قیام کا تذکرہ عام ہوا اور اس کے امکانات میں بھی اضافہ ہوا۔ یہ سچ ہے کہ بہت سی سیاسی مصلحتوں اور شخصی کوتاہیوں کی وجہ سے اسلامی نظام نافذ نہ ہو سکا لیکن ملک میں ایک اسلامی فضا قائم ہوئی۔ عمل کی کوتاہیوں کے باوجود ذہنی طور پر استحکام ریاست کے لیے اسلام کی اہمیت دلوں نے تسلیم کی۔ کسی نظام کی عملی تشکیل کے سلسلے میں عملی مثال کا ہونا لازم ہے۔ سارے انسانی نظام کوئی مکمل اور جامع عملی مثال پیش نہیں کر سکتے، لیکن اسلام کی عملی، جامع اور مکمل مثال نبی آخر الزماں علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات گرامی ہے۔ یہ وہ ذات ہے جس کے بارے میں قرآن حکیم نے فرمایا:

وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۝ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ ۝ (سورہ النجم: ۳۔۴)

''یہ رسول خواہش نفس سے کوئی بات نہیں کرتے، یہ تو وہی کہتے ہیں جو ان کی طرف وحی کیا جاتا ہے۔'' (مفہوم)

یہ وہ ذات ہے کہ جب اس وجود کامل کے لیے حضرت عائشہ صدیقہ عنہا سے عرض کیا گیا کہ ہمیں کچھ حضور ﷺ کی سیرت اور اخلاق کے بارے میں بتائیے تو فرمایا کہ ''کیا تم نے قرآن نہیں پڑھا۔'' اور چودہ سو سال سے زیادہ کا عرصہ بیت گیا، مگر اس ذات گرامی کا عمل ہمارے لیے آج

بھی اسوۂ حسنہ کا درجہ رکھتا ہے۔ان کی ذات ہمارے لیے اسوہ حسنہ ہے اور رہے گی۔ یہ بات عقیدہ کی دنیا تک محدود نہ تھی بلکہ عملی طور پر مسلمانوں نے حضور اکرم ﷺ کی تقلید کا التزام کیا ہے۔ کیا انسانی تاریخ کوئی ایسی مثال پیش کر سکتی ہے کہ کسی انسانی کے دنیا سے جانے کے صدیوں بعد اس کے وابستگان دامن صرف عبادات ہی میں نہیں بلکہ کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے، جاگنے، سونے انتہا یہ کہ اپنے ناخن کاٹنے میں بھی اس کے اتباع کی کوشش کریں۔ پاکستان بننے کے بعد حضرت محمد ﷺ کا ذکر گرامی ہمارے ادب اور ذہنی فضاء کا جس طرح حصہ بنا ہے اس کی مثال شاید برعظیم کی مسلم ثقافت کی گذشتہ کئی صدیوں کی تاریخ میں نہیں ملے گی۔ آج ہر ادبی رسالے کے ہر شمارے میں آپ کو حمد و نعت ملے گی۔ نعت اس عہد سے پہلے ہمارے ادب کی ایسی غالب صنف کبھی نہیں بنی تھی۔ مجھے یوں کہنا چاہئے کہ ذکر رسول کی یہ فضا ادب میں پہلے نہیں تھی، کیونکہ نعت کے ساتھ ساتھ اس سرزمین اور دیار رسول کے کتنے ہی سفرنامے لکھے گئے ہیں اور سیرت طیبہ پر کتابیں مسلسل شائع ہو رہی ہیں۔ ایک سوال آپ کے ذہن میں بار بار ابھرتا ہے۔ وہ یہ کہ ذکرِ مصلح اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس تواتر کے باوصف ہماری اصلاح حال کیوں نہیں ہوتی؟ اس کا جواب پاکستان کے ایک ممتاز سیرت نگار اور نعت گو شاعر حضرت نعیم صدیقی کے الفاظ میں پیش کرنا چاہوں گا:

یہ تیرے عشق کے دعوے، یہ جذبۂ بیمار ۔۔۔ یہ اپنی گرمئ گفتار، پستئ کردار
حسین لفظوں کے انبار، کھو گئی تلوار ۔۔۔ رواں زبانوں پہ اشعار، اڑ گیا مضمون
میں ایک نعت کہوں، سوچتا ہوں کیسے کہوں

یہاں کہاں سے مجھے رفعت خیال ملے ۔۔۔ کہاں سے شعر کو اخلاص کا جمال ملے
کہاں سے قال کو گم گشتہ رنگ حال ملے ۔۔۔ حضور! ایک ہی مصرع یہ ہو سکا موزوں
میں ایک نعت کہوں، سوچتا ہوں کیسے کہوں

حضرات گرامی! یہ صورت حال گہرے تفکر اور تجزیہ کا مطالبہ کرتی ہے۔ لیکن ذرا یوں سوچئے کہ اگر ذکر محمد عربی ﷺ یوں نہ ہو رہا ہوتا تو ہمارے معاشرہ کی صورت کیا ہوتی ہم اپنا تشخص کھو

بیٹھتے، اقدار حیات سے محروم ہوتے، کسی کے خلاف کوئی آواز نہ اٹھتی، غیروں کی تقلید ہماری اجتماعیت کو مٹا دیتی۔ آج ہمیں احساس زیاں ہے تو اسی ذکر گرامی سے یہی ذکر ہماری باز آفرینی کے تمام امکانات اپنے دامن میں رکھتا ہے۔

آج پاکستانی نعت گوئی میں بڑا تنوع ہے۔ ہر شاعر اپنے مزاج کے مطابق اپنے پیارے رسول ﷺ کے ذکر میں مصروف ہے۔ شاعروں کی ایک جماعت نے غزل کی ہیئت میں ادب کے تمام تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے نبی کریم ﷺ کے ساتھ اپنے شخصی رشتہ کو شعر بنا دیا ہے۔ شاعروں کی اس جماعت میں منور بدایونی (مرحوم)، تابش دہلوی، حافظ لدھیانوی، حنیف اسدی، حفیظ تائب، سرور کیفی، عبدالعزیز شرقی مہاجر مدنی، سرشار صدیقی، اقبال صفی پوری، عاصی کرنالی، محشر بدایونی اور ذاکر علی خاں وغیرہ شامل ہیں۔ ان کی نعتوں میں ملت کے مسائل اور عہد حاضر کے تقاضے بھی آ جاتے ہیں مگر سچ تو یہ ہے کہ یہ قبیلۂ عاشقاں کے سوختہ جاں لوگ ہیں اور انھیں کی نوائے سینہ تاب ہمارے دلوں میں حضورؐ کی محبت کے شعلہ کو روشن تر کرتی ہے۔ ان شاعروں میں بیشتر نعت کے شاعر ہیں اور کچھ نے اب تمام اصناف کو چھوڑ کر نعت کو اپنا لیا ہے۔ ان میں سے بیشتر کا ذریعہ کا اظہار غزل کا فارم ہے۔ عبدالعزیز خالد، نعیم صدیقی، صہبا اختر اور مظفر وارثی نے نظموں کے ذریعہ اپنا اظہار عقیدت کیا ہے اگرچہ غزل کے فارم میں بھی نعتیں کہی ہیں۔ صہبا اختر اور عبدالعزیز خالد کی پختہ گوئی، الفاظ کا دروبست اور ربط کلام دیدنی اور قابل تحسین ہے۔ عبدالعزیز خالد، محسن کاکوروی کے علمی ورثہ کے وارث ہیں۔ صہبا اختر نے بھی نعت رسول مدنی کے لیے اپنے علم میں اضافہ کیا جو بڑی سعادت ہے۔ اپنی نغمگی اور حسن میں مظفر وارثی کا کلام بے شک بہت نمایاں ہے۔

حضورؐ کی محبت کتنے ہی دلوں کی زمین پر برستی رہی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ان زمینوں سے نعت کا سبزہ اور سر سبز پودے ابھر کر سطح نطق و کاغذ تک آ گئے۔ جب میں پاکستان سے ہندوستان کے لیے روانہ ہوا تو اچانک سلیم گیلانی صاحب کا مجموعۂ نعت ''سیدنا'' ملا۔ مجھے تو یہ علم بھی نہ تھا کہ سلیم گیلانی شعر کہتے ہیں اور شعر بھی ایسے:

تو جوازِ دو جہاں ہے، تو ہی رازِ کن فکاں ہے ۔ تو کہاں کہاں نہیں ہے، تو کہاں کہاں نہیں تھا

میں نے کانپور، دہلی اور لکھنؤ کے ہر نعتیہ مشاعرے یا ادبی محفل میں احمد ندیم قاسمی کے نعتیہ شعر ضرور سنائے ہیں۔ میری ناچیز رائے میں پاکستان کی اجتماعی فضا کے بعد نوائے قاسمی نے پاکستان کی جدید تر نعت کے مزاج بنانے میں سب سے زیادہ حصہ لیا ہے کاش وہ اور نعتیں کہیں تا کہ اردو دنیا کو ان کا نعتیہ مجموعہ مل سکے۔ اس فضا کی تخلیق تو مولانا ظفر علی خاں سے شروع ہوئی، پھر اس میں شورش کاشمیری کی توانا آواز شامل ہوئی اور قاسمی صاحب اس کا نقطہ عروج ہیں۔ عبدالعزیز خالد، نعیم صدیقی، صہبا اختر کو اسی زمرہ میں شامل کیا جاسکتا ہے۔

اب نعت گوئی کے ذریعہ نوجوان شعرا اپنی جدید حسیت کا اظہار بڑے توانا انداز میں کر رہے ہیں۔ یہ نعت مجموعی طور پر اپنی پیشرو نعت کی روایات کی امین بھی ہے اور عہد فردا کی نعت کی نقیب بھی۔ اس کی ترجمانی کے لیے میں صرف دو شاعروں کے نام لوں گا۔ سلیم کوثر اور ثروت حسین۔ سلیم کوثر کے یہ شعر سنیے:

بے یقیں راستوں پر سفر کرنے والے مسافر سنو ۔ بے سہاروں کا ہے اک سہارا بہت، کملی والا بہت
میری بینائی سے اور مرے ذہن سے محو ہوتا نہیں ۔ میں نے اسم محمد کو دیکھا بہت، اور سوچا بہت

ثروت حسین کا یہ شعر ملاحظہ کیجیے کہ کس حسن سے اس نے سارے عالم کے پس منظر میں ذات ختمی مرتبت ﷺ کا ذکر کیا ہے:

سارے عالم کو جزیرہ ٹھہراؤں
ایک انساں کو سمندر لکھوں

شاعری کی مروجہ اور کلاسیکی اصناف کے علاوہ نظم آزاد و معریٰ اور اب نثری نظم میں بھی نعتیں لکھی گئی ہیں۔ میں نے ۱۹۶۳ء میں قصیدۂ بردہ (بوصیری) کا ایک آزاد ترجمہ نظم آزاد میں پیش کیا تھا۔ اس کے بعد کئی شاعروں نے آزاد نظم کو نعت کے لیے استعمال کیا۔ سچ تو یہ ہے کہ آپ کے شاعر عمیق حنفی کی نعتیہ نظم صلصلۃ الجرس آزاد نظم کے فارم میں اب تک اردو کی بہترین طویل نعت

ہے۔قمر ہاشمی کی طویل نظم مرسل آخر بھی ذکر اور اہمیت کی مستحق ہے۔

نعت نثر میں بھی لکھی جا سکتی ہے۔شبلی کا نثری شاہکار ''ظہور قدسی'' اور خواجہ حسن نظامی کے بعض مضامین نعت ہی ہیں۔پاکستان میں نسیم نیشو فوز نے حمد یہ انشائیوں کے ساتھ ساتھ نعتیہ انشائیے بھی لکھے ہیں۔اس خاکسار کو بھی نثر میں نعت لکھنے کی توفیق حاصل ہوئی ہے۔

میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے توجہ سے میری معروضات سنیں۔آخر میں چند پاکستانی شعرا کے نعتیہ اشعار آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں، کہ یہی آج کی محفل میں تسکین فکر و نظر کی صورت ہو سکتی ہے۔وقت خاصا ہو گیا ہے، اس لیے ان اشعار پر تبصرہ ممکن نہیں ہے۔ویسے بھی یہ شعر اپنی تنقید آپ ہیں۔میں نے ان شعراء کو چنا ہے جن کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا۔

احمد ندیم قاسمی صاحب کے یہ شعر ملاحظہ ہوں:

تجھ سے پہلے کا جو ماضی ہے وہ لاکھوں کا سہی — اب سے تا حشر جو فردا ہے وہ تنہا تیرا

لب وا نہ ہوں تو اسم محمد ادا نہ ہو — اظہار مدعا کا اشارا ہے تیرا نام

قرآن پاک ان پر اتارا گیا ندیم — اور میں نے اپنے دل میں اتارا ہے تیرا نام

رند باصفا سراج الدین ظفر کی نعتیہ سرمستی ملاحظہ ہو:

سبوئے جاں میں چھلکتا ہے کیمیا کی طرح — کوئی شراب نہیں عشق مصطفےٰ کی طرح

قدح گسار ہیں اس کی اماں میں جس کا وجود — سفینۂ دوسرا میں ہے ناخدا کی طرح

جمالِ روئے محمد کی تابشوں سے ظفر — دماغِ رند ہوا عرشِ کبریا کی طرح

اس رند باصفا سے جمیل الدین عالی کا خیال آیا کہ وہ شدید ردعمل اور Response کے شاعر ہیں۔

نہ چھپ کے اور نہ کسی کو دکھانے آیا ہوں — میں اک غریب بس اپنے ٹھکانے آیا ہوں

سنا سکا ہوں نہ اب تک خدا کے گھر میں بھی — یہاں تمام کہانی سنانے آیا ہوں

شاعر لکھنوی کا شعر یاد آیا:

کبھی خوش بیاں کبھی بے نوا، ہے عجیب طرح کا دل مرا
غم مصطفیٰ سے ہے شادماں، غم زندگی سے ملول ہے

اللہ ہمیں غمِ مصطفیٰ سے شادماں رکھے، اور اسی دعا کے ساتھ آپ سے اجازت چاہتا ہوں۔ آخر میں یہ عرض کروں گا کہ درِ مصطفیٰ سے وابستگی ہی ہمارے ایمان کی کسوٹی اور دکھ درد کا علاج ہے۔ اس مرحلہ پر مجھے جو کہنا ہے وہ عاصی کرنالی صاحب کی زبانی کیوں نہ کہہ دوں۔

اپنے کانوں کے لیے اذنِ اذان طیبہ — اپنی نظروں کے لیے گنبدِ خضرا مانگو
اپنے چلنے کے لیے راہ سفر، سوئے حجاز — اپنے رکنے کے لیے صرف مدینہ مانگو
اپنے گرنے کے لیے اُس شہہ والا کے قدم — اپنے اٹھنے کے لیے اس کا سہارا مانگو
اپنے پڑھنے کے لیے ذوقِ احادیثِ رسول — اپنے لکھنے کے لیے، نعت معلیٰ مانگو
اپنے جینے کے لیے لذت و توفیقِ درود — اپنے مرنے کے لیے دید کا لمحہ مانگو

نقشِ نقّاش

''نقشِ وفا'' میں ایک قطعہ میرے متعلق بھی ہے (اُسے فرمائشی قطعہ نہ سمجھیے گا) اسی لیے اس مجموعے کے بارے میں کچھ لکھتے ہوئے ''من تُرا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو'' کی پُرانی مثل یاد آ گئی۔ لیکن پہلو میرا ہی دبتا ہے۔ وفاؔ صاحب تو بہت اللہ کے حاجی بھی ہیں اور حرمِ زندگی کے حاجی بھی۔ اُن کی نورانی ڈاڑھی، چمکتی ہوئی آنکھیں اور متبسم ہونٹ دیکھتے ہی اجنبی کو بھی یقین آ جائے گا کہ وہ زندگی کے ہر نشیب و فراز سے آگاہ ہونے کے باوجود ''قابلِ اعتبار'' آدمی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ وفا کیشی بچپن یا نوجوانی سے وابستہ ہوتی ہے۔ بوڑھے آدمی خرانٹ ہو جاتے ہیں اور دوسروں کو گھستے رہتے ہیں۔ حفظ الرحمٰن وفاؔ، اس عام کہاوت کی بڑی مستند اور مستحکم تردید ہیں زندگی کے صدمے، آزمائشیں، لوگوں کا اندازِ نظر، ان میں سے کوئی چیز اُن سے تحیّر، معصومیت، وفا اور محبت کی صفات نہیں چھین سکی۔

میں نے اب تک جو کچھ عرض کیا ہے اُس کا تعلق وفاؔ صاحب کی شاعری سے بہت گہرا ہے۔ جو آدمی ہمیشہ دوسروں کے لیے سراپا خلوص رہتا ہو وہ بھلا اپنے جذبات کے ساتھ تجارت کیسے کر سکتا ہے۔ ہم میں سے اکثر آدمی اپنے آپ سے دور رہتے ہیں۔ حفظ الرحمٰن وفاؔ اُن میں سے نہیں وہ افسانوں کی اُس محدود اور مختصر برادری کے فرد ہیں جسے خود شناسی کی نعمت عطا ہوتی ہے۔

اس مجموعہ میں جو تنوع اور رنگا رنگی ہے وہ جنابِ وفاؔ کی زندگی کا پرتو ہے۔ اُن کی زندگی بھی کچھ اِسی انداز کی ہے کہ اُس میں یادِ خدا عشقِ رسول، فکرِ معاش، ذکرِ دوستاں، گھنیری زلفوں کا سایہ اور رُخساروں کی شادابی...... یہ اور ایسی ہی کتنی چیزیں سمٹ آئی ہیں۔ میرے نزدیک اِن میں سے کسی بات میں کوئی تضاد نہیں۔ انسان کے قلب و نظر میں اتنی ہی وسعت ہوتی ہے کہ ''قرآنِ حکیم'' کے

ساتھ" دیوان داغ" بھی اپنی جگہ بنالے۔ حفظ الرحمٰن وفاؔ کی زندگی اور کلام دونوں میں یہ تمام اجزا ہم آہنگ ہو کر ایک وحدت ہو گئے ہیں۔

غزل کی زبان اور آہنگ کو ہم سب سمجھتے ہیں۔ یہ دل کی زبان ہے کوئی اس سے بھاگ کر کہاں جائے گا۔ ہمارے حاجی صاحب کی نوجوانی کے خوب صورت لمحے غزل کے سانچہ میں ڈھل گئے ہیں۔ پھر ایسی غزلوں کے بارے میں کچھ کہنا لا حاصل ہے کیونکہ حاجی صاحب نے ماضی کے ایسے جزیرے آباد کر لئے ہیں جن میں اُن کی جوانی ہمیشہ کے لیے محفوظ ہوگئی ہے۔ میں اُن کے مذہبی کلام حمد، نعت اور منقبت کے بارے میں دو ایک باتیں کہنا چاہتا ہوں۔ پہلی بات تو یہ کہ خدا کے تصوّر اور محمدؐ عربی سے اُنھیں ایسی شدید جذباتی وابستگی ہے جو "خوگرانِ پیکرِ محسوس" اس صنم کدۂ کائنات کے بُتوں کے لیے محسوس کرتے ہیں۔ پھر اس جذباتی وابستگی میں روح اور تخئیل بھی شامل ہیں۔ دوسری بات یہ کہ اُن کی مذہبی شاعری میں سچّے جذبات کے ساتھ عقل کی ایک زیریں لہر (UNDER CURRENT) بھی موجود ہے وہ محبت میں گُم ہو جانے کے بعد بھی اس کائنات پر محمدؐ عربی کے احسانات کا صحیح جائزہ لینے کے اہل ہیں۔ بے خودی میں یہ ہشیاری، حُسنِ محبوب کے سوا دوسری جگہ کم ہی نظر آتی ہے۔

حاجی صاحب قابلِ مبارک باد ہیں کہ ظفر علی خاں کے بعد انھوں نے شعر و ادب کے اِس کنج میں نئی قلمیں لگائی ہیں۔

("نقش وفا" ۱۹۵۸ء)

''نقشِ سعادت'' کا حرفِ آغاز

اردو کے ایک نامور نقاد نے کئی سال ہوئے اپنے ایک تنقیدی مضمون میں ارشاد فرمایا تھا کہ نعت گوئی اور قصیدہ گوئی کا دور بیت گیا۔اس درمیانی عرصے میں (کوئی دس بارہ سال کی مدت میں) یہ ''ارشاد'' تو حرف غلط کی طرح مٹ گیا لیکن نعت گوئی کی وسعتوں میں نئی وسعتیں اور دنیائیں شامل ہوتی گئیں۔ایک طرف ماہر القادری، شورش کاشمیری، حمید لکھنوی اور نعیم صدیقی وغیرہ نے نعت میں دل کی دھڑکنوں کے ساتھ ساتھ دینی تصورات کو سمویا اور دوسری طرف جگر مراد آبادی، تابش دہلوی، منور بدایونی، محشر بدایونی، اقبال صفی پوری وغیرہ نے غزل کی ایمائیت اور عاشقانہ لے کو نعت میں اس طرح جگہ دی کہ ذکر نبی اکرم ﷺ کے ایوانوں میں نئی شمعیں روشن ہوگئیں۔عبدالعزیز خالد نے فارقلیط لکھ کر نعت گوئی کو اردو میں نیا رجحان عطا کیا۔فارقلیط اپنے انداز کی طویل ترین نظم ہے۔ نئے پن کے ساتھ ساتھ اس کے اشارات اور علمی نکات محسن کاکوروی کی یاد دلاتے ہیں۔ سراج الدین ظفر نے اپنے لہجۂ خاص میں ''مدحتِ سلطانِ مدینہ'' شروع کی۔خدا کرے یہ سلسلہ جاری رہے۔

مذہب اور شاعری کا تعلق کوئی ایسی بات نہیں جس پر چونکا جائے۔انگریزی میں مذہبی ادب اور بالخصوص مذہبی شاعری پر کئی مستند کتابیں موجود ہیں۔اردو تنقید کا دامن بھی ایسی کتابوں سے خالی نہیں۔مذہبی روایات تو کسی ملک اور قوم کی ثقافت کا ایسا حصہ بن جاتی ہیں کہ انھیں ادب سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔اردو ادب کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ مسلمان شاعروں کے علاوہ بہت سے غیر مسلم شعرا کے دیوانوں کا آغاز حمد و نعت اور منقبت سے ہوا ہے۔قومیت، وطنی تصورات اور جغرافیائی، نسلی و ذہنی تعصبات کے اس تاریک دور میں نبی اکرم ﷺ کی ذات گرامی ایک منارۂ نور و ہدایت کی طرح

ان غیر مسلموں شاعروں کو بھی متاثر کرتی رہی ہے جو اخوت و مساوات انسانی کے قائل ہیں۔ جگن ناتھ آزاد کا جو سلام اس مجموعے میں شامل ہے اس دعویٰ کے ثبوت کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔ پچھلے دنوں ایک غیر مسلم شاعر کی نعت کا یہ شعر سنا:

ہے عہد نبوی معرکۂ بدر سے قائم
تاریخ لکھی جائے بہ عنوانِ محمد

یہی وہ معرکہ ہے جسے قرآن نے یوم الفرقان کہا ہے۔ میں منفی اور مناظرانہ انداز کا قائل نہیں لیکن ''فاضل نقاد'' سے بصد ادب یہ ضرور عرض کروں گا کہ جو ذات انسانی اخوت مساوات اور عدل عمرانی کی علامت کا درجہ رکھتی ہو اس کا ذکر انسانی قلوب کو ہمیشہ گرماتا اور ذہنوں کو منور کرتا رہے گا۔ دوسری طرف ہم نے ''خدایان باطل'' کا حشر اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے ہمارے محترم نقاد کے رہنما کی تعریف میں ایک روسی نظم کا ترجمہ ان کے ایک ہم مشرب شاعر نے کیا تھا۔

صفِ اعدا کے مقابل ہے ہمارا رہبر

اور اسی اسٹالین کی ہڈیاں بھی اس کی قبر سے نکال پھینکی گئیں۔

اردو میں نعتیہ شاعری ایک مستقل موضوع ہے جس کا حق چند صفحات میں ادا نہیں کیا جاسکتا نعتیہ شاعری کا آغاز دکنی دور سے ہوا اور یہ سلسلہ کبھی نہیں ٹوٹا۔ بقول میر تقی میر:

جلوہ نہیں ہے نظم میں حسنِ قبول کا
دیواں میں شعر گر نہیں نعتِ رسول ﷺ کا

اس مختصر سے مجموعے میں اردو کے اہم شعرا کے نعتیہ کلام کا انتخاب تاریخی ترتیب کے ساتھ پیش کیا جارہا ہے آپ ملاحظہ کریں گے کہ سودا کا بلند آہنگ لہجہ حضور رحمت دو عالم ﷺ کس طرح گداز ہوگیا ہے۔ نظیر اکبرآبادی کا لاابالی پن کیسے آداب و متانت کے سانچے میں ڈھل گیا ہے۔ غالب نے نعت گوئی میں بھی ایک نئی راہ تراشی ہے۔ نعت کے تین چار شعر ان کی ایک مشہور غزل میں اس طرح آتے ہیں کہ اگر وہ خود ہی اپنے خط میں تشریح نہ کردیتے تو شارح مفہوم

کے تعین میں ٹھوکریں کھاتے رہتے۔

مجھے احساس ہے کہ اس انتخاب میں بعض شعرا شامل نہیں ہیں اور بعض بہت مشہور نعتیں پیش نہیں کی جاسکیں۔ عہدِ حاضر کے شعرا میں شفیق جونپوری، احمد ندیم قاسمی، تابش دہلوی، شاعر لکھنوی، محشر بدایونی اور اقبال صفی پوری کی کمی مجھے شدت سے محسوس ہو رہی ہے، لیکن اس سلسلے میں مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ برادرم محشر بدایونی کے انتخاب ''مقبول نعتیں'' میں ان میں سے بیشتر حضرات کا کلام موجود ہے اور یہ عمدہ انتخاب آسانی سے دستیاب ہوسکتا ہے۔

بعض نہایت ''مقبول نعتیں'' لوگوں کے حافظہ میں محفوظ ہیں اسی لیے ان کے لیے جگہ نہیں نکالی جاسکتی۔ انھی شاعروں کی کم مشہور مگر عمدہ نعتوں کو شامل کرلیا گیا۔ مثلاً مولانا ظفر علی خان کی نعت ''وہ شمع اُجالا'' کی جگہ ان کی دوسری نعت شامل کی گئی ہے۔

یہ نعتیہ مجموعہ میرے دوست اخلاق احمد صاحب (حافظ اسلام احمد اینڈ سنز) کے اشتراک سے بلا کسی ہدیہ کے عام تقسیم کے لیے شائع کیا جارہا ہے۔ وقت بھی کم تھا اور صفحات بھی مختصر اسی لیے ہم کو اپنی تنگیٔ داماں اور وسائل کی کمی کی وجہ سے بعض شعرا کو چھوڑنا پڑا اور بعض کا نعتیہ کلام مل نہ سکا۔ بہر حال مجھے یقین ہے کہ آپ اس مجموعہ سے مایوس نہیں ہوں گے۔ اس انتخاب میں کئی ایسے نہایت اہم نعت گو شعرا شامل ہیں جنھیں عام طور پر نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ یہ حضرات شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ دین وتقویٰ کے اعتبار سے بھی اپنی مثال آپ تھے۔ مثلاً حضرت عزیز صفی پوری، حضرت مذاق بدایونی۔ ان بزرگوں کے علاوہ انشا، ظہیر دہلوی، وحید کڑوی، ناطق لکھنوی، علامہ اقبال سہیل وغیرہ، کو بھی اب تک نظر انداز کیا گیا ہے۔ حضرت وحید کڑوی کی نعت کے لیے میں جناب عادل عثمانی اور واصل عثمانی کا ممنون ہوں۔ میں اپنے دوست جناب سراج الدین ظفر کا شکریہ بھی ادا کرتا ہوں جن کی پہلی نعت اس مجموعہ میں شامل ہو رہی ہے۔ نعیم صدیقی صاحب کی نظم عزیزی انیس احمد سلمہ کے وسیلہ سے ملی۔

نعتوں کی نقل کا کام بڑی حد تک عزیزی شمشیر خان صاحب ایم۔ اے۔ (کراچی) نے

کیا ہے اور انتخاب میں بھی انھوں نے میری مدد کی ہے۔ ان کے تعاون کے بغیر یہ کام چار چھے دن میں پورا نہیں ہو سکتا تھا۔ الحاج ڈاکٹر ابواللیث صدیقی صاحب کے ذاتی کتب خانے میں کم و بیش تمام اہم شعری مجموعے موجود ہیں۔ موصوف نے اس انتخاب کے سلسلے میں کتب خانے کی کنجیاں ہمارے حوالے کر دی۔ اللہ تعالیٰ انھیں اجر خیر عطا فرمائے۔

آخر میں اپنے دوست اخلاق احمد صاحب کے لیے بھی دست بدعا ہوں ان کے اشتراک کے بغیر شاید یہ مجموعہ ربیع الاول کے مہینے میں شائع نہ ہو پاتا۔ اللہ مجھے توفیق عطا فرمائے کہ میں اس کے بعد کے اردو کی نعتیہ شاعری کا ایک بہتر اور مفصل انتخاب اور تنقیدی جائزہ پیش کر سکوں۔

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم

(جولائی ۱۹۶۶ء/۷ ربیع الاول ۱۳۸۶ھ)

چراغِ حرا کی تابناکی

بیان انسان کے لیے خدا کی سب سے بڑی دین ہے۔ اللہ نے انسان کو پیدا کیا اور اُسے نطق و بیان کے عطیے سے سرفراز فرمایا۔ خلافت کا تاج بھی انسان کے سر پر علم الاسماء نے رکھا۔ لفظ جو علوم کے خزانوں کی کلید ہیں۔

نطق و بیان کی معراج ذکرِ نبی کریم ﷺ ہے خواہ یہ کسی صورت میں ہو۔ نعت ذکرِ رسولؐ کی ایسی صورت ہے، جو شاعر کے جذبۂ عشق کو دوسروں کا جذبہ بنا دیتا ہے۔ نعت گوئی تو حضرت حسان بن ثابتؓ سے پہلے شروع ہوئی لیکن سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حضرت حسانؓ کی نعت گوئی کو جس طرح پسند فرمایا اس کا تقاضا یہی ہے کہ حضرت حسانؓ کی روایت کو ہمارے شاعر اپنائیں۔ سرور کیفی صاحب قابلِ مبارک باد ہیں کہ وہ نعتوں کے مجموعے کے ساتھ دنیا شعر و سخن میں قدم رکھ رہے ہیں۔ خدا کرے یہ مجموعہ جہاں ایک طرف ادبی دنیا میں ان کا تعارف اور شناخت قرار پائے، وہیں بارگاہِ نبویؐ میں اسے شرفِ قبول عطا ہو۔

حضور ﷺ سے محبت ہمارے ایمان کی اساس ہے، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ خدا پر ہمارا ایمان نبی کریم ﷺ کی شہادت پر قائم ہے۔ سرور کیفی صاحب کے جذبۂ دل نے انھیں اُس دیار میں پہنچا دیا جو خواب گاہِ مصطفویؐ ہے۔ ع

اے خنک شہرے کہ آنجا دلبرست

اُس درگاہ سے انھیں خوشبوئے محبت عطا فرمائی ہوئی ہے۔ انھوں نے تحدیثِ نعمت کے طور پر اس کا ذکر اپنے اس شعر میں کیا ہے۔

ایک خوشبو جو میسّر مجھے طیبہ میں ہوئی
ذہن و دل کو اُسی خوشبو میں بسائے رکھوں

مسرؔور کیفی صاحب نے اپنے نعتیہ کلام کے مجموعے کو بڑا خوبصورت نام دیا ہے

''چراغِ حرا۔''

سچ پوچھیے تو اس عالم آب و رنگ میں جہاں بھی آرزو کے چراغ روشن ہیں، انھیں حرا کے شعلہ اَبدی سے روشنی ملی ہے۔ اس مجموعے میں کتنے ہی ایسے اشعار ہیں جن میں بوئے عشق اور ذہن کی روشنی کے ساتھ ساتھ حُسنِ بیان و شعر بھی موجود ہے۔ مجھے یقین ہے کہ مستقبل میں مسرؔور کیفی صاحب ایک منفرد لہجہ پیدا کرنے میں کامیاب ہوں گے اور اگر فیضِ مصطفویؐ کی روشنی سے وہ یوں ہی بہرہ یاب ہوتے رہے اور فنی ریاض سے کام لیتے رہے تو ان شاء اللہ محسن کاکورویؒ اور مولانا ظفر علی خانؒ جیسے نعت نعت گو شعرا کی محفل میں انھیں بھی جگہ ملے گی۔

(پیش لفظ ''چراغ راہ''، جنوری ۱۹۷۸ء)

میاں والی بستی کا آدمی

ایک نظم، ایک غزل کے حوالے سے

''ہم جس میں بس رہے ہیں وہ دنیا تمھی تو ہو''

ظفر علی خاں کا یہ مصرعہ بچپن سے میرے ساتھ سفر کر رہا ہے۔ ایک طرف تو یہ بول اب گردشِ لہو بن گئے ہیں اور دوسری طرف دیارِ اسمِ محمدؐ کا سمت نما بھی بنے۔ ''اسلام تیرا دیس ہے تو مصطفویؐ ہے'' بھی اسی حقیقت کا بالواسطہ اظہار ہے، کیوں کہ اسمِ محمدؐ ہی اسلام ہے۔

اور نہ جانے تقدیم اسم محمدؐ کی وہ کون سی ساعت تھی، کون سی گھڑی تھی کہ ایک چہرہ میرے سامنے چمکا۔ ماتھے پر جیسے خاکِ طیبہ کے ذرے ستارہ صفت چمک رہے تھے۔ آنکھوں میں وہ قندیل روشن تھی جس کی لو میری ذات تک سفر کر رہی تھی۔ یوں کسی کی آنکھوں سے کسی کی ذات تک کا سفر ازل اور ابد کو اپنی آغوش میں لے لیتا ہے۔ پھر وہ قندیل مہرِ درخشاں بنی اور میرا قلب آئینہ اور پھر:

بس اتنے پر ہوا ہنگامہ دار و رسن برپا\
کہ لے آغوش میں آئینہ کیوں مہر درخشاں کو

اور پھر بہت سے بیتنے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ یہ سفر یک طرفہ نہیں تھا۔ یہ محمد اجمل نیازی سے میری آگاہی کی داستان کی نقطۂ آغاز ہے۔ اور محمد نگر کا یہ باسی مجھے اس دنیا کے جغرافیے کے حوالے سے اسلام آباد میں ملا تھا۔ اسلام آباد، جس کی فضاؤں میں رچی ہوئی خوشبو ہونٹوں تک آتے آتے صلِ علیٰ محمدؐ بن جاتی ہے اور پھر لاہور میں محمد اجمل نیازی کے ساتھ وہ لمحے گزرے، جو ہماری زندگیوں کی کتاب پر اُسی طرح ثبت ہیں جیسے پاسپورٹ پر ویزے کی مہریں ہوتی ہیں۔ لاہور کے بارے میں

مولانا شبیر احمد عثمانی کے حوالے سے یہ کہتا چلوں کہ حضرت مجدد الف ثانیؒ نے کہیں فرمایا ہے کہ میں نے اپنے مراقبے میں دیکھا کہ سرکارِ دو عام کی خاص نظر کرم اس شہر پر ہے۔ اور سید ہجویر سے لے کر محمد اقبال تک یہ سارے وجود اُسی نگاہِ کرم کی زندہ انسانی دستاویزیں ہیں، اور یہ سلسلہ جاری ہے۔ یہ نہ ہوتا تو محمد اجمل نیازی میاں والی (میانوالی لکھنا مجھے پسند نہیں کہ اس املا میں وہ بستی اپنے معانی سے محروم ہو جاتی ہے۔ وہ تو میاںؒ والی جگہ ہے۔) سے لاہور کیوں پہنچتا۔

محمد اجمل نیازی مراقبے والا آدمی ہے۔ مراقبہ وہ بیداری ہے جو ہمارے اور دنیا کے درمیان حجابِ زندہ بن کر، ہمیں اپنے رب کی حضوری کا احساس دلاتی ہے۔ مجھ میں یہ جرأت نہیں کہ دیارِ دوست میں پہنچنے کا دعویٰ کر سکوں۔ لیکن وہ دوست تو ایسا کہ اپنے جلوے سے سرفراز فرمانے کے لیے زمان و مکان کے قانون معطل کر کے اپنے رفیق اور عبد کو اپنے پاس بلا لیتا ہے۔ اور پھر وہ گھڑی بھی آتی ہے جب رفیق رختِ سفر باندھتا ہے اور فرماتا ہے کہ میں اپنے رفیق اعلیٰ سے ملنے جا رہا ہوں۔ معراج خلا میں رونما ہونے والا کوئی تنہا واقعہ نہیں، وہ تو طیبہ نگری کی روح جاوداںؐ کی زندگی کی بلندیوں کے سلسلے کا نام ہے۔ رسولوں کی زندگی سلسلۂ کوہ کی طرح ہوتی ہے اور یہ تمثیل بھی اپنے عجز بیان کا اعلان ہے اور اس سلسلے کی بلند ترین چوٹیاں بلند ترین رسول کی معراج کا اشاریہ ہیں۔

محمد نگری کے باسی کے ذکر میں ایسے جملے تو آئیں گے۔ جو جملہ معترضہ نہیں بلکہ حوالہ ہیں۔ حضورؐ واحد نبی ہیں جنھوں نے اپنے امتیوں کے لیے بھی معراج کا بندوبست فرما دیا۔ رُشد و ہدایت اور انسان کی ساری تاریخ میں اس کی مثال کہیں اور نہیں ملے گی۔ الصلوٰۃ معراج المومنین اور پھر لیلۃ القدر، سلسلۂ روز و شب کی معراج ہے۔ یہ رات آدمی کا بھی مراقبہ ہے، وقت کا بھی مراقبہ اور اس خط کا بھی مراقبہ جو آدمی اور وقت کے مابین ہے، جسے ہم انتظار کہتے ہیں۔ ملٹن نے کہا تھا کہ:

> ''وہ بھی مصروف خدمت ہیں جو صرف کھڑے رہتے ہیں اور انتظار کرتے ہیں اور ہمارے ہاں کھڑے رہنے کا عمل رائیگاں مراقبہ کا بامعنی عمل بن جاتا ہے''

لیلۃ القدر میں انتظار کا مراقبہ، وقت اور انتظار کی ایک نئی تخیلی تصویر ہے حسن، الفاظ،

رنگ، جذبہ اور تخیل بن گئے ہیں۔ محمدؐ کی محبت آنسوؤں اور خوابوں کی حیرت اور وعدوں کے اسرار اپنے اظہار کے لیے آدمی خود چن لیتے ہیں اپنے رب کے حکم سے۔ اور اس میں میرا اور آپ کا کیا اجارہ کہ وہ آدمی محمد اجمل نیازی ہے ہمارے عہد میں۔ ہر عہد میں ایسے چند آدمی ضرور ہوتے ہیں ورنہ گویائی سکوت بن جائے اور الفاظ گونگے ہو جائیں اور اظہار کے سمندر پھاڑ دیے جائیں اور یوں کہ معانی ان میں غرق ہو جائیں اور مفہوم بکھر کر لاوے کی خاکسترِ آتشیں کی طرح فہمیات کی بستیوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیں۔ اور لیلۃ القدر میں انتظار کا مراقبہ، وہ مرحلہ ہے جہاں شاعری اپنے وجود کا اعلان کرتی ہے، ہم پہلے اسے سمجھتے کم ہیں اور محسوس زیادہ کرتے ہیں اور پھر احساس تفہیم بن جاتا ہے۔

یہ ارادے جو اپنا زمان و مکاں تک نہیں جانتے
یہ ستارے جو اپنا نشاں تک نہیں جانتے
ٹوٹتے ٹوٹتے رت جگوں کے ازل زار میں کتنے حیران ہیں

اس حیرانی کو محمد اجمل نیازی نے حرفِ آگاہی بنا دیا ہے۔

اور پھر اظہار کی وہ منزل آتی ہے کہ ''وہ'' کی ضمیر نگر کے مالک اور نگر کے باسیوں دونوں کا احاطہ کر لیتی ہے۔

ہم جس میں بس رہے ہیں وہ دنیا تمھیؐ تو ہو

اسی دنیا کا نام محمدؐ بھی ہے اور کائناتِ روحِ محمدؐ بھی۔ یہ وہؐ ہے کہ مسکینوں کے درمیان جینا اور انھیں کے درمیان اٹھنا آپؐ نے اپنے لیے پسند کیا۔ یہ وہ اسم ہے جو فلسفیوں سے حل نہیں ہوتا اور نکتہ وروں کی گرفت میں نہیں آتا۔ یہ اسم دعائے نیم شبی، آہِ سحر گاہی، درد و غم کی راہ کے آبلوں کے ہنگام ہونٹوں کی مسکان اور نگاہِ خواب کی دید کی صورت اُبھرتا، مسکراتا اور دکھائی دیتا ہے۔ محمد اجمل نیازی کے لیے وہ ایک ارادہ بن گیا ہے۔ اور یہ بات اس کے لیے بشارت ہے کہ انسان ارادہ کرنے والا حیوان ہے۔ اُس کی حیات ہی ارادہ ہے۔

اضطرابِ خاکِ امجد میں کہیں رہتا ہے وہ
کائناتِ روحِ احمد میں کہیں رہتا ہے وہ
ڈھونڈنے نکلے ہیں جس کو علم کے صحرا میں ہم
درد و غم کی راہِ ابجد میں کہیں رہتا ہے
اک ارادے کی طرح اجمل دلوں کے درمیاں
ارضِ جاں کی آخری حد میں کہیں رہتا ہے وہ

یہ وہی تو ہے جس نے ہماری مٹی کو خاکِ امجد بنا دیا ہے۔ ہماری مٹی کو نہیں بلکہ ہمیں اور ارادے کی طرح اپنے دل کے درمیان اپنی ارضِ جاں کی آخری سرحد پر اُسے بسانے کا شرف محمد اجمل نیازی کے ہم عمر شعراء میں سلیم کوثر کے سوا شاید کسی کو حاصل نہیں ہوا ہے۔ ''شاید'' بہت اہم ہے کیوں کہ گردِ راہِ محمدؐ کے شہسواروں کا حساب کسے آتا ہے جو مجھے آئے گا۔

میں محمد اجمل نیازی کو میکانکی انداز میں نہیں پڑھ سکتا، اور حضور علیہ السلام کے ذکر کی محفل میں میری سانسیں میرے سینے میں الجھنے لگتی ہیں اور سارا وجود ایوانِ گریہ بن جاتا ہے اور سارے منظر مل کر ایک دوسرے میں گم ہونے لگتے ہیں اور ایک دھنک سی چھا جاتی ہے اور ہر چیز اندر کا منظر بن جاتی ہے اور یہ منظر بادل بن کر برسنے لگتے ہیں اور میں بکھر جاتا ہوں اور پھر اپنی ذات کے گنبد میں کسی کا نام زور زور سے پکارتا ہوں اور پھر اُس نام کی بازگشت مجھے از سرِ نو تعمیر کرتی ہے اور میں اُس زمانے میں پہنچ جاتا ہوں کہ جب وہؐ مدینے کی گلیوں سے گزرتا تھا تو مدینے کے بچے تمنا کرتے تھے کہ کبھی سلام کرنے میں انھیں سبقت حاصل ہو سکے اور میں ان سب بچوں کے خدوخال میں اپنا چہرہ تلاش کر رہا ہوں اور محمد اجمل نیازی کا چہرہ تلاش کر رہا ہوں۔

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ

اللہ محمد اجمل نیازی کو خوش رکھے جس نے مجھے بہت رلایا ہے۔

مرج البحرین

کہنے والے نے کہا:

تا قیامت کھلا ہے باب سخن

اور شاہد الوری اس دعویٰ کی دلیل اور سند لے کر آ گئے اور اسے ''سخن در سخن'' کا نام دیا ہے۔
بعض صاحبوں کی تحریر سے کچھ ایسا گمان گزرا ہے کہ وہ اسے ''غالب سخن ور'' کی ''ہم عصری'' کی کوشش سمجھتے ہیں۔ بہت سے صاحبان ہنر نے اسے ''تضمین'' تک محدود جانا۔ میں تو یہ سمجھا ہوں کہ ''سخن در سخن'' بیک وقت غالب کی گہرائیوں، اپنی ذات کے بطون اور کائنات کی پرتوں کے اندر سفر ہے۔ اس مسافر کا وسیلہ، زادِ راہ اور حربہ اس کا تخیل اور الفاظ پر اس کی گرفت ہے۔

غالب، شاہد الوری کے لیے محض ایک شاعر نہیں بلکہ ایک استعارہ اور ایک سمت ہے۔ فکر اور زندگی کی سمت۔ اور شاہد نے اس استعارہ کے معانی کے مختلف گوشے ہی اجاگر نہیں کیے بلکہ خود اپنی ذات کا اظہار بھی کیا ہے کہ یہی زندگی کا جواز ہے۔ غالب نے اپنے اشعار میں آنے ہر لفظ کو گنجینۂ معنی کا طلسم کہا تھا اور شاہد الوری کے الفاظ اس طلسم کی کلید ہیں۔ شاہد کی رفاقت میں غالب سے ملاقات ہی کا دوسرا نام ''سخن در سخن'' ہے اور

مباش منکر ''شاہد'' کہ در زمانہ تست

''سخن در سخن'' کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصہ میں خالق کائنات جل جلالہ اور قرارِ جاں ﷺ کی حمد و نعت کے بعد دینی بزرگوں کا ذکر کیا گیا اور امیر خسرو سے عبدالحق، حسرت موہانی اور جوش تک ہمارے بزرگوں اور فن کاروں کے ذکر کے ساتھ سرسید احمد خاں، جوہر، قائد اعظم اور لیاقت علی خاں جیسے رہ نماؤں کی شخصیتوں کو شعری تاثر ڈھالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ہمارے ہاں ملی اور قومی نظموں

کی کمی نہیں، لیکن بیشتر نظمیں مجھے ان انسانی ڈھانچوں کی یاد دلاتی ہیں جن کی زیارت کبھی کبھی ٹی وی کے پردہ پر یا کسی میڈیکل کالج میں ہو جاتی ہے۔ شاہد الوری نے ان شخصیتوں کے فیضان کو اپنی قومی زندگی اور اپنے نفس میں محسوس کیا ہے۔ یہاں ان کی شاعرانہ قدرت کے ساتھ ساتھ ان کے علم اور بصیرت کا بھی اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ ویسے تو ہم نے اکثر یہ دیکھا ہے کہ علم اچھے بھلے شاعروں کو بگاڑ دیتا ہے اور وہ لغت کی ''قارونیت'' کو جذبہ کا قائم مقام سمجھ بیٹھتے ہیں۔ الحمد للہ کہ شاہد الوری اس سانحہ اور المیہ سے بچ گئے۔

انھوں نے اپنے ہر قطعہ میں غالب کا کوئی نہ کوئی مصرع تخلیقی انداز میں استعمال کیا گیا ہے۔ بیشتر مقامات پر نئے سیاق وسباق کی بنا پر مصرع کو نئے معانی مل گئے ہیں اور اس سے میرے اس خیال کو تقویت پہنچتی ہے جس کا میں نے بارہا اظہار کیا ہے یعنی قاری ادب کا نہایت اہم فریق ہے اور شاہد الوری کی ذات تو شاعر اور غالب کے قاری کا ''مرج البحرین'' ہے۔ رب ذوالجلال کی حمد میں شاہد کہتے ہیں:

میں جانتا ہوں حاصل عرفاں ہیں حیرتیں

اور اسی خیال کو آگے بڑھاتے ہوئے غالب کو یوں اپنا ہم نوا بنا لیتے ہیں۔

عرفان ذات کا کوئی امکان ہی نہیں
''یارب بیان شانہ کشِ گفتگو نہ ہو''

یہاں حیرت میں سکوت کے معانی بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔

عرفان ذات کا کوئی امکاں نہ سہی مگر ایک ذات ایسی ہے جو اس بے نشان کا نشاں ہے اور ''اسی کی یاد اجالا، اسی کا ذکر شعور'' مگر لایمکن الثناء کما کان حقہ اور شاہد بھی اس عجز کا اعتراف کرتے ہیں اور غالب کے اس مصرع کو نیا مفہوم عطا کر دیتے ہیں۔

''سفینہ چاہیے اس بحرِ بیکراں کے لیے''

اس قطعہ میں بت کدہ وکلیسا اور خانقاہ دیر کو عقائد کی نگارش کہہ کے شاہد نے ایک نیا

استعارہ تراشا ہے۔

''سخن در سخن'' میں تین نعتیں، حضور سرورِ کائنات ﷺ کے ساتھ شاہد الوری کے رشتہ کی تین دستاویزیں ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی صدیقیت کے بعد حضرت فاروق معظمؓ کی ذات گرامی کو چند اشعار میں شاہد نے جس طرح پیش کیا ہے اس پر انھیں صرف مبارک بادہی دی جاسکتی ہے۔ اس ''قطعیہ نظم'' کا ہر مصرعہ معرفت فاروقی، آگاہیٔ تاریخ اسلام اور علم ارتقائے دین کا ایک باب ہے۔ حضرت عثمان غنیؓ سے متعلق قطعہ میں غالب کے دو مصرعے ہیں ان کے ذوالنورین ہونے کی طرف شاعرانہ اشارہ کا درجہ رکھتے ہیں، ویسے دوسرے جتنے قطعے میری نظر سے گزرے ہیں ان میں غالب کا ایک مصرع ہی دیکھا۔ حضرت غوث الاعظم کے بارے میں ان کا شعر ہے:

ولایت کے ہر پھول میں اللہ اللہ
گلستان بغداد ہم دیکھتے ہیں

اور صاحب گلستان بغداد نے ۳ رشوال ۵۴۵ء کو فرمایا تھا کہ ''قلب، بدن کے قفس میں پرندہ ہے، ڈبہ میں موتی کی طرح ہے اور صندوق میں مال کی مثال۔ پس اعتبار پرندے کا ہے پنجرہ کا نہیں، اعتبار موتی کا ہے ڈبہ کا نہیں، مال کا ہے صندوق کا نہیں''، باب اوّل کے قطعات میں قلب کے نور سے قفسِ الفاظ اور صندوقِ اظہار جگمگا رہا ہے۔ خدائے بزرگ اس کاوش شعری کو قبول فرمائے۔

باب دوم کے قطعات میں زندگی ورق ورق ہمارے سامنے آتی ہے۔ ہمارے عہد کے کم شاعروں کی زندگی ایسے مختلف تجربوں سے گزری ہوگی جیسے شاہد الوری کی زندگی گزری ہے اور انھوں نے شعر سخن کے بازار میں اپنے ہر تجربے کو Cash کرالیا ہے۔ باب دوم کے قطعات پر نہایت معتبر اور صاحبان نظر ناقدوں اور مبصروں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ اس کتاب کی ترتیب بھی اردو میں ایک نیا تجربہ ہے اور یہ ''سخن در سخن'' کی تیسری سمت ہے.....ان نقادوں کی نکتہ آفرینی کے علاوہ آپ کے اپنے مطالعہ اور تعبیر و تفسیر سے اس کتاب کے قطعات میں معانی کی چوتھی سمت بھی پیدا

ہو جائے گی۔

ادب کی دنیا بھی اب ہماری دنیا کی طرح سہ ابعادی (تھری ڈائی منشنل) نہیں بلکہ چہاابعادی ہے۔ کاش میرے پاس اتنا وقت ہوتا کہ اس حصّہ کے قطعات کے بارے میں کچھ عرض کرسکتا، ویسے بھی ماہ صیام میں دل بابِ اوّل سے نکل کر قطعِ مسافت پر آمادہ ہونے کے لیے تیار نہیں۔

(مقدمہ "سخن در سخن")

نطق و بیان کی معراج

بیان، انسان کے لیے خدا کی سب سے بڑی دین ہے۔ اللہ نے انسان کو پیدا کیا اور اسے نطق و بیان کے عطیہ سے سرفراز فرمایا..... خلافت کا تاج بھی انسان کے سر پر علم الاسماء نے رکھا..... لفظ جو علوم کے خزانوں کی کلید ہیں۔

نطق و بیان کی معراج ذکرِ نبی کریم ﷺ ہے، خواہ یہ کسی صورت میں ہو۔ نعت، ذکر رسول ﷺ کی ایسی صورت ہے جو شاعر کے جذبۂ عشق کو دوسروں کا جذبہ بنا دیتی ہے.... نعت گوئی تو حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ سے پہلے شروع ہوئی، لیکن سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حضرت حسانؓ کی نعت گوئی کو جس طرح پسند فرمایا اس کا تقاضا یہی ہے کہ حضرت حسانؓ کی روایت کو ہمارے شاعر اپنائیں۔ مسرور کیفی صاحب قابل مبارک باد ہیں کہ وہ نعتوں کے مجموعے کے ساتھ دنیائے شعر و سخن میں قدم رکھ رہے ہیں۔ خدا کرے یہ مجموعہ جہاں ایک طرف ادبی دنیا میں ان کا تعارف اور شناخت قرار پائے، وہیں بارگاہِ نبوی ﷺ میں اسے شرفِ قبول عطا ہو۔

حضور ﷺ سے محبت ہمارے ایمان کی اساس ہے، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ خدا پر ہمارا ایمان، نبی کریم ﷺ کی شہادت پر قائم ہے...... مسرور کیفی صاحب کے جذبۂ دل نے انھیں اس دیار میں پہنچا دیا جو خوابگاہِ مصطفوی ﷺ ہے۔

اے خنک شہرے کہ آنجا دلبرست

اُس درگاہ سے انھیں خوشبوئے محبت عطا ہوئی ہے۔ انھوں نے تحدیثِ نعمت کے طور پر اس کا ذکر اپنے اس شعر میں کیا ہے۔

ایک خوشبو جو میسر مجھے طیبہ میں ہوئی
ذہن و دل کو اسی خوشبو میں بسائے رکھوں

مسرور کیفی صاحب نے اپنے نعتیہ کلام کے مجموعے کو بڑا خوبصورت نام دیا ہے۔
''چراغِ حرا''

سچ پوچھیے تو اس عالمِ آب و رنگ میں جہاں بھی آرزو کے چراغ روشن ہیں، انھیں حرا کے شعلۂ ابدی سے روشنی ملی ہے۔ اس مجموعے میں کتنے ہی ایسے اشعار ہیں جن میں بوئے عشق اور ذہن کی روشنی کے ساتھ حُسنِ بیان و سخن بھی موجود ہے۔ مجھے یقین ہے کہ مستقبل میں مسرور کیفی صاحب ایک منفرد لہجہ پیدا کرنے میں کامیاب ہوں گے اور اگر فیض مصطفوی ﷺ کی روشنی سے وہ یوں ہی بہرہ یاب ہوتے رہے اور فنی ریاض سے کام لیتے رہے تو ان شاء اللہ محسن کاکوروی اور مولانا ظفر علی خان جیسے نعت گو شعرا کی محفل میں انھیں بھی جگہ ملے گی۔

(ابتدائیہ ''چراغِ حرا''، ۱۹۷۸ء)

ایک زندہ کرامت

''مدحِ سالارِ اُمم، سالارِ اُمم، رسول دہر، مردِ اکرم و کامل، محرمِ اللہ الصّمد، محمد و احمد صلی اللہ علیہ وسلم اس مداح کا ماحصلِ عمرو رُدح ہے کہ اسم اس کا راغب، کام اس کا حصولِ آگہی بَہر علمائے احمد ہے۔''

یہ چھوٹی سی عبارت جو میں نے کوئی پانچ منٹ کے تامل اور غور و فکر کے بعد لکھی ہے حقیقی معانی میں غیر منقوطہ نہیں ہے کیوں کہ ''ے'' (ی) حرفِ منقوطہ ہے۔ اگرچہ اردو تحریر میں ''ی'' کے باب میں نقطوں کا رواج عام نہیں رہا۔ اگر اِس مجموعے کے صاحبان علم قارئین میری طرح یہ کوشش کریں تو راغبؔ صاحب کے کمالِ فن کے اعتراف اور پوری تفہیم کے لیے ایک دلچسپ مشق ہوگی۔

علم صنائع اور بدائع میں ہم دو قسم کی صنعتوں کا مطالبہ کرتے ہیں۔ صنائع معنوی اور صنائع لفظی۔ صنائع معنوی کے مقابلے میں یقیناً صنائع لفظی کا درجہ پست تر ہے کیونکہ زبان کا کام اور مقصد خیال کا اظہار اور ابلاغ ہے صنائع معنوی سے پیرائیہِ اظہار اور خیال چمک اُٹھتا ہے۔ ان صنعتوں میں تشبیہ کی لطف آفرینی کا کون قائل نہ ہوگا اور استعارہ ہمیں تشبیہ سے بلند تر سطح پر ملتا ہے۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ عظیم شاعر کے ہاتھوں، زبان، استعاروں کا سلسلہ مسلسل بن جاتی ہے۔

لیکن نبی کریم ﷺ کے ذکر کی ایک زندہ کرامت یہ ہے کہ اُن کی مدح میں صنعتِ غیر منقوطہ بھی، ایک صنعتِ معنوی بن جاتی ہے کیونکہ حضور ﷺ کے دونوں ناموں ''محمد'' و ''احمد'' میں کوئی نقطہ نہیں۔ درود و سلام اُس احمدؐ و محمدؐ مرسل پر کہ لفظ و بیان کی دنیا پر جس کے وجود کی چھوٹ سے کہکشاں کا منظر ہر طرف نظر آتا ہے۔ اس کا دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ اس صنعت کی وجہ سے آدمی فکر و ریاض کے سلسلۂ عمل سے گزرتا ہے، خاصا وقت اثرِ ذکرِ رسولؐ میں گزارتا ہے اور پھر ایسے نقوش اُس کے قلم کے

ذریعے کاغذ کے سینے پر ثبت ہوتے ہیں جو ہر داغ سے پاک ہوتے ہیں۔ نقطہ بھی بصری اعتبار سے ایک داغ ہے اور دھبے کی طرح ہوتا ہے۔

صنعتِ غیر منقوطہ کے حروف کی تعریف بہت طویل اور روشن ہے، اسے علم و ادب کے علاوہ تفسیرِ قرآن اور مداحِ رسولِ اکرمؐ کے لیے بھی استعمال کیا گیا ہے۔ حضور ﷺ سے ہمارے اہلِ قلم کا جو قلبی رشتہ اور ذہنی واسطہ ہے اُس نے اس صنعت کا احیا ہمارے دور میں بھی کیا ہے۔ جناب راغبؔ مراد آبادی کا زیرِ نظر مجموعہ ''مدحِ رسول'' اس کی مثال ہے۔ مولانا محمد ولی رازی نے بھی نثر میں حضور ﷺ کی سیرت، صنعتِ غیر منقوطہ کے التزام کے ساتھ تحریر کی ہے۔ یہ کتاب میری نظر سے نہیں گزری لیکن یہ ضرور جانتا ہوں اَلْوَلَدُ سِرٌّ لِاَبِیْہِ (ولی رازی صاحب مولوی محمد شفیع کے فرزند ہیں)۔

راغب صاحب کے اس مجموعے میں صنعتِ غیر منقوطہ میں چالیس نعتیں اور تیئیس رباعیاں ہیں۔ اُن کے پہلے نعتیہ مجموعے ''مدحتِ خیر البشر'' میں بھی اس خاک داں میں نبی کریم ﷺ کی حیاتِ مبارکہ کے ۶۳ برسوں کی نسبت سے غالبؔ کی زمینوں میں ۶۳ نعتیں تھیں۔ یہ بات اس بندۂ عاجز کے ذہن میں آئی تھی اور جناب راغبؔ نے میرے خیال کو حقیقت کا جامہ پہنایا ـــــ

دوسرے مجموعے میں بات ۶۳ کے التزام سے آگے بڑھ گئی ہے۔ چالیس نعتیں جیسے حیاتِ قبل بعثت کا احاطہ کر رہی ہیں اور ۲۳ رباعیوں میں زمانِ نبوت کا نقش ہے۔ میں نے جب راغبؔ صاحب سے یہ بات کہی تو اُن کے چہرے پر حیرت کے آثار پیدا ہوئے اور دیکھنے لگے ''میں نے تو یوں سوچا بھی نہیں تھا'' معاملہ یہ ہے کہ ذاتِ نبوی ﷺ سے ہر اُمتی کا ایک راست تعلق ہے اور یہ تعلق ہمارے شعور، لاشعور اور ذات کی ہر جہت پر غالب ہے۔

ہر ایک خلوتِ جاں میں اُسی کی محفل ہے
ہر ایک شخص کو اپنا دکھائی دیتا ہے
(کشفی)

نبی آخرالزّمان علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حیاتِ قبلِ نبوت کی مدت کا یہ غیر شعوری التزام علامتِ ایمان شاعر بھی ہے اور اس سے عصمتِ انبیاء علیہم السلام کا نقطہ بھی ابھرتا ہے۔ عصمت و وحی، نبی اور غیر نبی کے درمیان سب سے نمایاں علاماتِ امتیاز ہیں۔ حضور علیہ السلام کی حیاتِ طیّبہ نبوت سے پہلے بھی سعادت و برکت، عصمت و خیر، طہارت و تقدّس سے عبارت تھی۔

مدحِ رسول کی نعتوں اور رباعیوں میں بہت کم ایسے مقامات ہیں جہاں صنعتِ غیر منقوطہ اظہار، جذبہ اور اردو کے مزاج پر غالب آئی ہو وہاں بیشتر مقامات پر یہ مشکل صنعت حجاب درمیاں نہیں بنی ہے بلکہ وسیلۂ انعکاس جذبہ و خیال کے طور پر سامنے آتی ہے۔ مختلف نعتوں کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

ملال دوُر ہوا ، حلِ معا سوال ہوا
کُھلا وہ سّرِ عدم لا اِلہٰ الاّ اللہ

○

دل محرمِ سرورِ سوادِ حرم ہوا
اللہ الصمد کہ مسلسل کرم ہوا

○

ہو گوہرِ اکرام عطا احمدؐ مُرسَل
ہر لمحہ کرم اور سوا احمدؐ مُرسَل

○

دو عالم کا دِل اور دلِ آرا محمدؐ
ہمارا محمدؐ ، ہمارا محمدؐ

راغب صاحب کے سلسلہ میں میں نے کہیں یہ بات عرض کی ہے رباعی کا وزن اُن کے مزاج کا آہنگ بن گیا ہے۔ اردو کی ہر صنفِ سخن کے ساتھ ناموں کا ایک طویل سلسلہ ذہن میں

آ جاتا ہے لیکن رباعی کے باب میں قدما میں سے شاید ہی آپ کے خیال میں کوئی نام اُبھرے۔ ویسے خواجہ میر دردؔ کے بعد انیسؔ نے رباعی کی طرف توجہ دی۔ رباعی ایک لحاظ سے مجلس میں مرثیہ کا دیباچہ بن گئی۔ شاعر مرثیہ خوانی کے لیے منبر پر بیٹھتا تو رباعی سے آغاز کرتا۔ انیسؔ نے رباعی کو حمد و نعت منقبت کے علاوہ اپنے عہد کی عکاسی کے لیے بھی استعمال کیا۔ حالیؔ و اکبرؔ نے بھی اس غریب صنفِ سخن کا کچھ نہ کچھ حق ادا کیا۔ اقبالؔ نے رباعی کے وزن کے باب میں اجتہاد اور آزادی سے کام لیا۔ لیکن اُس کے آفاق کو وسیع تر بنا دیا۔ ماضی قریب اور ہمارے عہد کو اردو رباعی کا سب سے اہم دور قرار دیا جا سکتا ہے۔ جگت موہن لال، رواںؔ اناوی، امجدؔ حیدر آبادی، تلوک چند محرومؔ، جوشؔ ملیح آبادی، سیمابؔ اکبر آبادی، فراقؔ گورکھپوری اور سالکؔ کانپوری وغیرہ کے ہاتھوں رباعی کے موضوعات میں وسعت، اس کے اختصار میں قوت و بلاغت کے نئے زاویے سامنے آئے۔ راغبؔ مراد آبادی اسی سلسلۃ الذہب کی ایک کڑی ہیں۔ وہ بلا تامّل اپنے خیال، اپنے احباب سے اپنی محبت اور کسی بھی صورتِ حال کو رباعی کے قالب میں ڈھال سکتے ہیں۔

مجھے اس بات کا افسوس تھا کہ وہ اپنی اس خداداد صلاحیت کو کسی بڑے مقصد کے لیے استعمال نہیں کر رہے ہیں۔ الحمدللہ گزشتہ چند برسوں میں انھوں نے اس کی تلافی ہی نہیں کر دی بلکہ اب تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ اُن کی یہ ساری مشق اور نہایت طویل مشق اسی لیے تھی کہ ایک دن ذکرِ رسول عربی ﷺ اور آیاتِ قرآنی و احادیثِ نبوی کی ترجمانی کے کام آئے۔ اس مجموعہ کی ۲۳ رباعیوں کے علاوہ انھوں نے کم و بیش چھ سو آیاتِ قرآنی و احادیث نبوی کا ترجمہ رباعیوں میں کیا ہے۔ ان میں سے بہت سی رباعیاں جسارتؔ میں شائع ہو کر اہلِ نظر اور صاحبانِ دل سے داد لے چکی ہیں۔ خدا کرے یہ ترجمے دو مجموعوں کی صورت میں شائع ہو سکیں۔ میری تمنا ہے کہ اس کے بعد راغبؔ صاحب تاریخی ترتیب کے ساتھ اکابرِ اردو کے فن پر تبصرہ رباعی کی صورت میں پیش کریں۔ اور تمام صاحبانِ کمال کے حالات حواشی کی صورت میں رباعیوں کے ساتھ درج کیے جائیں۔ یہ ناطق لکھنوی کی ''نظم اردو'' کے بعد اپنے طرز کا ایک عجیب کارنامہ ہوگا۔

میری تمنا ایک طویل جملہ معترضہ بن گئی جس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ مدحِ رسول کی رباعیوں میں راغبؔ صاحب کے فن اور عقیدہ کے ساتھ ساتھ اُن کے فکر و مطالعہ کا بھی بھرپور اظہار ہوا ہے۔ مثال کے طور پر پہلی ہی رباعی کا یہ مصرع

سالارِ اُمم احمدِ موعود رسولؐ

یہاں احمدؐ کے ساتھ ''موعود'' کا ٹکڑا ہمیں نوید مسیحا کی یاد دلاتا ہے جسے قرآن نے بھی حضرت عیسیٰؑ کی نسبت سے محفوظ کر دیا ہے۔

اس مجموعے کی رباعیوں میں نبی اکرم ﷺ کے ذکرِ رفیع اور محاسن کی مدح خوانی کے علاوہ دو لہجے اور خطاب کی دو سطحیں نظر آئیں۔ ایک لہجہ تو وہ ہے جس میں شاعر اپنے آپ سے خطاب کرتا ہے۔ یہ دربار سرکار میں اپنے آپ کو کھونے اور اپنے آپ کو یاد کرنے کی عجیب منزل اور عجیب مرحلہ ہے۔ یہ تضاد، ایک نئی وحدت کی تخلیق کرتا ہے۔ اور دوسرا پیرایۂ اظہار یا لہجہ شعر وہ ہے جس میں شاعر اہل ایمان کو درِ سرکار سے وابستگی کی دعوت دیتا ہے یہاں شعر میں اذان کی سی صفت پیدا ہو جاتی ہے۔ (یہ بات بلا تمثیل عرض کی گئی ہے)

پہلے اپنی ذات سے خطاب ملاحظہ ہو:

اصلاحِ ہر امر دہر ، کارِ اسلام
احکامِ رسولؐ ، اصل حصارِ سلام
ہو عاملِ ہر حکم محمدؐ ، راغبؔ
کر دل کو مدام کام گارِ اسلام

اور اب ذرا شاعرانہ اذان ملاحظہ ہو

وَا ہوگا درِ امام ، آؤ لوگو
دوڑو ، درالسلام ، آؤ لوگو

اللہ کا ممدوح ، دو عالم کا رسولؐ
در اُس کا مدام ، کھٹکھٹاؤ لوگو

دوسری رباعی کا آخری مصرع توجہ طلب ہے۔ بارگاہ رسول عربی ﷺ میں تو جنبشِ مژگاں بھی گستاخی کے زُمرے میں آجاتی ہے۔ اہل ایمان کے لیے دائمی حکم ہے کہ اپنی آوازوں کو نبیؐ کی آواز سے بلند تر نہ کرو۔ یہاں در کو کھٹکھٹانا، وابستگیٔ دوام اور رابطۂ جاوداں کے لیے استعمال ہوا ہے اور ''مدام'' کا لفظ اس کی دلیل ہے۔

پہلی رباعی میں امام کا لفظ جس انداز میں استعمال ہوا ہے۔ اگر یہ فرقہ زدہ اُمت اُس پر غور کرے تو شاید اتحاد کی ایک نئی صورت نکل آئے۔ ایسی صورت جس میں، ہر امر میں ہم اللہ اور اس کے رسولؐ سے رجوع کرنے لگیں۔ آج امام کا لفظ تین معانی میں استعمال ہو رہا ہے۔ حضرات اثنا عشری میں صرف ائمہ اہل بیت کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ سُنّی حضرات ایک طرف ائمہ اربعہ فقہ کے لیے استعمال کرتے ہیں اور دوسری طرف ائمہ اہل بیت اور اکابرِ علم دین کے لیے بھی جیسے امام رازی، امام غزالی وغیرہ۔ لیکن اِمام اوّل ﷺ کا اسم گرامی اس سلسلے میں ہم سے کسی کے ذہن میں نہیں آتا۔ اگر ہم نبی کریم ﷺ کو امام اوّل واکمل مان لیں تو کتنے فقہی اختلافات بھی دور ہو سکتے ہیں۔

لفظ امام کتنی ہی نزاکتیں اور معنوی رعنائیاں اپنے دامن میں رکھتا ہے ائمہ لُغت نے اسے جامد قرار دیا ہے جو بچے کی پہلی آواز اُم سے ماخوذ ہے (یہ آواز ملتے جلتے کتنے ہی قالب اختیار کر لیتی ہے) یہ پہلی آواز، اپنی اوّلیت کے اعتبار سے ''ماں'' کے ہم معنی بن گئی ہے۔ ماں (اُمّ) کی آغوش انسان کا پہلا حصار ہے۔ اسی لیے انسانی مسکن کو بھی اُمّ کہا گیا، ماں اپنے بچوں کے لیے اتحاد اور وحدت کا سلسلہ ہوتی ہے۔ یوں ''اُمتہ'' کے لفظ میں بھی یہ بنیادی معانی شامل ہیں۔ حضور نبی کریم ﷺ اس اُمت کا حصار اوّلین ہیں۔ وہ ہمارا حصار دمسکنِ تخستیں ہیں۔ اِلاَمَامَۃ کے معانی ہیں آگے ہو۔ اور اسی لیے امام وہ ہوا جو اپنی جماعت کے آگے ہو۔ امام کا لفظ اُس دھاگے کے لیے

استعمال ہوتا ہے جسے معمار دیوار یا عمارت کے کسی حصّے کی سیدھ کو ناپنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔اس ملّت کی دیوار کے لیے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ گرامی اُسوہ حسنہ ہی امام ہے۔افسوس کہ آج اس مِلّت کے مختلف مسالک و مذاہب سے وابستہ افراد اپنے اماموں سے آگے بڑھ کر امام اوّل سے رشتہ جوڑنے کے لیے تیار نہیں۔معاذ اللہ ہم نے نبوت کو امامت کے فریضہ سے معزول کر دیا۔عزیز مکرم محمد صلاح الدین صاحب نے بڑی قوت سے یہ بات کہی تھی حضور ﷺ ہماری اساس اور مجبوری ہیں، دوسرے ہمارا انتخاب ہیں۔راغبؔ صاحب نے ایک نعت میں یہی نکتہ بڑے حسن سے اجالا اور ابھارا ہے۔

اسلام کا محور اسمِ اللہ
اسلام کا دائرہ محمدؐ

اقبالؔ نے کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں دین عطا کیا اور نبی کریم ﷺ نے ہمیں ایک ملّت بنا دیا۔ہم ''قومِ رسولِ ہاشمی'' ہیں۔اسلام ایک مکمل نظام حیات ہے اور اس نظام کی عملی تشکیل ''اُسوۂ حسنہ'' نبوی کی بنیادوں پر ہوئی ہے۔راغبؔ صاحب کی نعت گوئی میرے دل اور ذہن دونوں کے لیے باعثِ تحریک بنتی رہی ہے۔اللہ تعالیٰ اُن کے مراتب کو بلند فرمائے اور اُن کی شاعری کے اس پہلو میں مزید استحکام، مزید اخلاص، اور حسن پیدا ہو اور اُن کی شاعری افرادِ ملّت میں دینی ارتباط و تعلق کا سبب بنے۔

(''مدحِ رسول'' [صنعت غیر منقوطہ میں نعتیں اور نعتیہ رباعیات]، ۱۹۷۹ء)

صہبا کی نعتیہ شاعری

اردو کے بیشتر شعرا کے دواوین اور کلیات کے آغاز میں ہمیں دو ایک نعتیں روایت اور رسم کے طور پر نظر آتی ہیں، لیکن نعت گو بیشتر شعرا اپنے فن اور ذات کا حصہ نہیں سمجھتے تھے۔ نعت گوئی کو ایک صنف سخن کے طور پر امیر مینائی، محسن کاکوروی، حالی اور مولانا احمد رضا خاں نے اپنا لیا۔

حالی نے اردو نعت کو قومی اور ملّی جدوجہد کا حصہ بنا دیا۔ مسلمانوں کی نشاۃ الثانیہ کی تحریک کے ایک قائد کے طور پر حالی نے نعت اور ذکرِ رسول اکرم ﷺ کو ''ہدیٰ'' بنا دیا۔

اے خاصہ خاصانِ رُسل وقتِ دعا ہے

اقبال کے ساتھ جہاں اردو شاعری کا نیا دور شروع ہوا وہاں اردو نعت کے ایک نئے عہد کا آغاز ہوا۔ اقبال کائنات کے ہر منظر، ہر مسئلے اور ہر چیز کو نبی اکرمؐ کے حوالے سے دیکھتے ہیں۔

ظفر علی خان نے بھی ذکرِ رسول اکرم علیہ الصلوۃ والسلام کو جدوجہد زندگی سے ہم آہنگ کر دیا۔

قیام پاکستان کے بعد آزادی نے جہاں ہمارے شعروادب کو مجموعی طور پر متاثر کیا، وہاں نعت بھی نئے قالب میں ڈھل گئی۔ ہم اس جہانِ بے ثبات میں ثبات کی تلاش میں مصروف ہو گئے اور یوں نشانِ ثبات سے ہمارا رشتہ مضبوط تر ہو گیا، ذاتِ رسالت مآب ہی نشانِ ثبات ہے۔

''پاکستانی دور'' میں جتنے نعتیہ مجموعے شائع ہوئے ہیں اس کی مثال ہماری ادبی تاریخ میں نہیں ملتی۔ تمام مجموعوں اور شاعروں کا تذکرہ اختصار کے ساتھ تو ممکن نہیں لیکن یہ کہنا ایک حقیقت کو دہراتا ہے کہ جن شاعروں نے اس عہد میں نعت کی روایت کو آگے بڑھایا ہے اور اس میں نئی جہتیں پیدا کی ہیں اُن میں صہبا اختر شامل ہیں۔

''اقرأ'' کا مطالعہ کرتے ہوئے ہمیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ محض شاعری نہیں بلکہ اپنے وجود اور اس کے عناصر ترکیبی کا شاعرانہ اعلان ہے۔ صہبائی کی نعت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے شخصی تعلق اعلیٰ شاعری کے قالب میں ڈھل گیا ہے اور مذہبی جذبات کا شاعری کی سطح تک پہنچنا ایک بڑا کارنامہ ہے۔

اس مجموعے میں اسالیب اور ہیئت کا تنوع بھی دیدنی ہے۔ نعت کے لیے عام طور پر غزل کی ہئیت استعمال کی گئی ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ غزل ہمارے قومی، فکری اور ادبی مزاج کی ترجمانی کرتی ہے۔ صہبا نے غزل کی ہیئت میں نعتیں کہی ہیں اور نظم کی کئی اصناف کو بھی ذکرِ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم سے سرفراز کیا ہے۔ صہبائی کی نعتوں میں جو نغمگی ہے اُس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نغمۂ محمد ہی سے زندگی میں توازن اور حسن پیدا ہو سکتا ہے۔ اسی طرح مضامین کا تنوع حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تاثرات کی طرح ہمہ گیر ہے۔

صہبا کو سرکارِ دوعالم کی ذات کی طرح اُن کے پیغام سے بھی گہری وابستگی ہے اور اس کا اظہار نعتیہ مجموعہ کے عنوان ''اقرأ'' سے ہوتا ہے۔ حضورؐ کا ذکرِ گرامی ہر اندھیرے اور ہر جہل کو ختم کرنے کے لیے سب سے موثر وسیلہ اور حربہ ہے۔

(''اقرأ''، ۱۹۸۱ء)

شاہد الوریٰ کا ایک اور مبارک سفر

''سخن در سخن'' کے بعد شاہد الوری ''حمد وثنا'' کا تحفہ لے کر ایوان ادب میں آئے ہیں۔ یہ مجموعہ ان کی افتادِ طبع کے عین مطابق ہے اور اس کے نقوش ''سخن در سخن'' میں ہمیں نظر آتے ہیں انہوں نے ''سخن در سخن'' میں حمد ونعت کے پھول بھی کھلائے تھے اور اکابرِ ملت پر جو کچھ لکھا تھا اس کی اساس بھی تعلق باللہ اور تعلق بالرسول ہے۔

ہمارے عہد میں جن اصناف سخن کو بے حد فروغ حاصل ہوا ہے ان میں نعت گوئی بھی شامل ہے۔ نعتیہ شاعری کے اتنے مجموعے ہماری ادبی تاریخ کے کسی دور میں شائع نہیں ہوئے اس کا ایک سبب تو حضور ﷺ سے مسلمانوں کا رشتہ اور تعلق ہے اور دوسرا سبب یہ ہے کہ:

آدم کو ثبات کی طلب ہے
دستورِ حیات کی طلب ہے

اور حضور ﷺ کا پیغام ہی دستور حیات ہے جو انسان کو ثبات سے آشنا کر سکتا ہے۔ دستورِ حیات دین اسلام ہے۔ جس کی تکمیل محمدِ عربی علیہ الصلواۃ والسلام کے ذریعے کی گئی۔ یوں نعت گوئی اور ثنائے مصطفیٰ کا رشتہ حمدِ الٰہی کے ساتھ نہایت واضح اور بین وبدیہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جماعت مومنین پر اپنے ایک ہی احسان کا ذکر کلام الٰہی میں اس طرح فرمایا ہے:

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (آل عمران:۱۶۴)

'' درحقیقت اہل ایمان پر تو اللہ نے بہت بڑا احسان کیا ہے کہ ان کے درمیان انھی میں

سے ایک ایسا پیغمبر اٹھایا جو اس کی آیات انھیں سناتا ہے ان کی زندگیوں کو سنوارتا ہے اور ان کو کتاب اور دانائی کی تعلیم دیتا ہے۔"

افسوس ہمارے جدید نعت گو شعرا نے اس نکتہ کو نہ سمجھا اور یہی سبب ہے کہ اچھے حمد یہ کلام کی تلاش میں ذرا مشکل پیش آتی ہے ورنہ نعت تو حمد کے بطون سے وجود میں آتی ہے۔ اس کا ایک سبب یہ ہے کہ بہت سے مشہور شعرا کی نعتیں "جدید ادبی فیشن" کے حصے کے طور پر لکھی گئی ہیں یہ ذہن کی نعتیں ہیں۔ دل کی نہیں۔ نعت گوئی کے فروغ کے اسباب کا اوپر ذکر کر رہا تھا اور سبب کے اظہار کو دانستہ مؤخر کر دیا تھا۔

الحمدللہ اب ایسے نعتیہ مجموعے سامنے آ رہے ہیں جن میں حمدِ الٰہی کو اساس بنایا گیا ہے۔ وقار صدیقی مرحوم کا مجموعہ بد قسمتی سے اب تک شائع نہیں ہو سکا۔ انھوں نے اللہ اور رسول کی رفاقت کو بڑے سلیقے سے پیش کیا ہے یوں کہ رفیق اعلیٰ کی وحدت و یکتائی مجروح نہ ہو۔ جمیل نقوی اور ع۔ س۔ مسلم کے (غیر مطبوعہ) مجموعوں کے بعد اب جناب شاہد الوری کے مجموعے میں بھی حمد و نعت کی یکتائی قابل دید ہے۔ یہ محض شعوری کوشش نہیں بلکہ الٰہی ذات اور ذاتِ رسالت، آپ ﷺ کے تعلق کی آگاہی کا نتیجہ ہے۔

مجموعے کا نام "حمد و ثنا" اس کے مضامین کا احاطہ کر لیتا ہے۔ پہلی ہی حمد جب نظر کے سامنے آئی تو اس کا دعائیہ انداز اور خطابیہ لہجہ پڑھنے والے کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔

ہر چیز ہے جلوہ ترا بارِ الٰہا ربنا
کوئی نہیں ہے دوسرا بارِ الٰہا ربنا

یہ سورۃ الفاتحہ کا ترجمہ تو نہیں لیکن اس کے نکات کی ایک بازگشت ضرور ہے۔

سب رفعتیں تیرے لیے، سب عظمتیں تیرے لیے
ہے صرف تو مشکل کشا، بارِ الٰہا ربنا

اس حمدیہ کلام میں ہندی کا لہجہ اور اسلوب بھی شاہد الوری نے مسخر کیا ہے اور ایسی بحروں

کا انتخاب کیا ہے، جن کے رقص میں تصویرِ تخلیقِ کائنات نظر آتی ہے۔

خوشبو، پانی، ہوا، اُجالا، مٹی، اگنی، روپ سروپ
تو نے اپنی ہستی کا بھی کس کس طور اظہار کیا

اوران مظاہر کائنات کو دلیلِ ذاتِ الٰہی سمجھنے والا حضرت احمدِ مجتبیٰ محمد مصطفیٰ ﷺ کے دربار تک تو خود پہنچ جائے گا کیونکہ حضور ﷺ ذات الٰہیہ کا مظہر کامل ہیں۔ رحم یا شفقت، جمال ہو یا جلال، حضور ﷺ کی سیرت کا ہر رنگ اللہ کے رنگوں کا عکس ہے اور اسی کو اخلاق الٰہی کے رنگ میں رنگ جانا کہتے ہیں۔

نعت گوئی کے سلسلے میں ہمارے شعرا نے جذبہ کے ساتھ ساتھ اپنے فن کا بھی اظہار کیا ہے حال ہی میں جناب راغب مراد آبادی کا غیر منقوط مجموعۂ نعت ''مدح رسول'' کے نام سے شائع ہوا ہے۔ جناب شاعر لکھنوی کی غیر منقوط رباعیات کا مجموعہ بھی شائع ہو رہا ہے۔ شاہد الوری نے بھی ''چہار قافیتیں'' اور ''سہ قافیتین'' کی نسبتوں اور رعایتوں کے ساتھ نعتیں کہی ہیں۔

نقش پائے حضرت سے زندگی عبادت کی
مجھ کو اس محبت نے روشنی عنایت کی

○

اے صلِ علیٰ نسبتِ دامانِ محمد ﷺ
ہے حق کی عطا دولتِ ایمان محمد ﷺ

شاہد الوری صاحب کی نعتوں میں ان کا فن بھی ہے، ذہن بھی ہے اور دل بھی۔

ہاں حمد میں بعض مقامات ایسے ہیں جو نظر ثانی کے محتاج ہیں۔ قرینے سے اور اللہ کے اس ارشاد کے تحت کہ کوئی قوم ایسی نہیں جہاں ہم نے اپنا نذیر (رسول) نہ بھیجا ہو میں رام، گوتم، اور کرشن کا احترام کرتا ہوں اور اسی طرح گیتا کے بعض ٹکڑوں میں صدائے سرمدی سنائی دیتی ہے لیکن میں ''قرآن اور گیتا'' اور ''زم زم و گنگا'' کا ذکر ایک ساتھ نہیں کر سکتا۔

اے درسِ توحیدؔ قراں میں، اے حق کی اشارت گیتا میں
اے روحِ تقدّس زم زم میں، اے نازِ تموّج گنگا میں

''اشارت'' اور ''تموّج'' کے نہایت محتاط اظہار کے باوجود بعض قارئین کے ذہنوں میں تقابل کا تاثر پیدا ہو سکتا ہے۔

اپنی نعت گوئی کے بارے میں جناب شاہد الوری نے جو شعر کہے ہیں انھیں ان کی نہایت مناسب تنقید اور تفہیم قرار دیتے ہوئے میں اس تحریر کو ان اشعار پر ختم کرتا ہوں۔

یہ نزولِ رحمت ہے، نعت لکھ رہا ہوں میں
بخششِ رسالت ہے، نعت لکھ رہا ہوں میں

(مقدمہ ''حرفِ ثنا''، ۱۹۸۴ء)

داعیٔ اسلام

اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے بارے میں کچھ لکھنا اور اسلامی اقدار وضابطۂ حیات کی تشریح وتوضیح کی کوشش کسی مسلمان ادیب اور شاعر کے لیے معراجِ قلم ہے۔

نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے عہد مبارک سے ان کی مدح وثنا کا جو سلسلہ شروع ہوا وہ آج تک جاری ہے۔ ہر وہ زبان جس کے وسیلے سے مسلمان شاعروں نے اپنا اظہار کیا ہے اپنے دامن میں نعت کی صنف ضرور رکھتی ہے اور اس صنف کی وسعتوں میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ اسی طرح سیرت نگاری ہمارے ادب کی ایک مستقل صنف ہے۔

اردو شاعری کے دکنی دور ہی سے ہماری زبان سرکار کائنات وسرور دین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر سے جگمگا رہی ہے۔ مولود نامے، معراج نامے اور نعتیں بہت سے شاعروں نے لکھیں۔ معجزات بھی نظم کیے گئے۔ بعض شاعروں نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کو بھی نظم کیا ہے۔ ہمارا دور خاص طور پر اپنی نعتیہ شاعری کے ذخیرہ پر ناز کر سکتا ہے، کیفیت وکمیت دونوں اعتبار سے۔

جناب ص علی ص (صادق علی انصاری قاسمی بستوی) کی کتاب ''داعیٔ اسلام'' اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ ان سے پہلے حفیظ جالندھری ''شاہ نامۂ اسلام'' میں نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک اور مقدس زندگی اور عظیم کارناموں کو نظم کر چکے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر کا یہ بھی ایک فیضان ہے کہ مثنوی اپنی سات مقررہ بحروں کی آہنی گرفت سے آزاد ہوگئی اور ادائے مطالب کے لیے شاعر کو طویل تر بحروں کو اختیار کرنے کی آزادی نصیب ہوگئی۔ جناب ص علی ص نے بھی اس آزادی سے فائدہ اٹھایا ہے اور شاہنامۂ اسلام کو اپنے سامنے رکھا ہے۔

دوسری طرف انہوں نے ایک نئی پابندی اپنے لیے اختیار کی۔ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کی اس منظوم سیرت میں صنعتِ غیر منقوط کی پابندی کی ہے۔ اُن سے پہلے حضرت راغب مرادآبادی غیر منقوط نعتیہ مجموعہ پیش کر چکے ہیں اور مولانا محمد ولی رازی سلمہ اللہ تعالیٰ نے اسی پابندی کے ساتھ اردو نثر میں حضرت ختمی مرتبت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ ﷺ کی سیرت تحریر کی ہے۔ محمد ولی رازی صاحب کا یہ کارنامہ ص علی ص صاحب کے سامنے رہا ہے بلکہ انھوں نے اسی کتاب کو اپنے سامنے رکھ کر اسے نظم کیا ہے۔ اس حقیقت کا اظہار ان کے قلم سے کتاب کے شروع میں ملتا ہے۔

صنعتِ غیر منقوط کو آپ لزوم مالایلزم قرار دے سکتے ہیں۔ لیکن اس سے ایک طرف تو شاعر کی قدرتِ بیان کا اندازہ ہوتا ہے اور دوسری طرف اس کے بہانے وہ سرورِ دیں صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں لکھنا اور الفاظ و بیان کا انتخاب کرنے میں زیادہ وقت صرف کرتا ہے۔ یوں یہ لفظی التزام دینی افادہ اپنے دامن میں رکھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی پابندیوں سے حُسنِ کلام اور ابلاغ دونوں پر اثر پڑتا ہے۔ مگر بقول غالب: ع

رُکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

جناب ص علی ص نے دیوار میں در پیدا کر ہی لیا اور حضرت محمد مصطفیٰ علیہ الصلوٰۃ والتسلیمات والتحیات کے ذکرِ گرامی کی ضوافگنی و نور پاشی اس کتاب کو منور کر رہی ہے۔ اگر شاعر نے ناموں کے سلسلہ میں اس صنعت (غیر منقوط) کی پابندی نہ کی ہوتی تو بعض مقامات کی تفہیم قاری کے لیے آسان تر ہوتی اور نظم کی تار بحیثیت مستحکم تر ہو جاتی۔ اسی پابندی کی وجہ سے انھوں نے غزوۂ بدر کو اسلام کا معرکۂ اول لکھا ہے اور غارِ حرا کو کھوہ لکھنے پر مجبور ہوئے ہیں۔

اس طویل نظم کے تمام حصوں میں اچھے اور رواں اشعار ملتے ہیں اور یہ بھی صاحبِ کوثر صلی اللہ علیہ وسلم کا فیض ہے کہ سنگلاخ مقامات سہل ہو گئے ہیں اور پتھروں میں پانی کا سراغ ملتا ہے۔ حمدِ الٰہی کے سلسلہ میں یہ شعر ملاحظہ ہو جو حسنِ تکرار کی بہت اچھی مثال ہے اور ایک لفظ کے تغیر نے معنویت کا جادو جگایا ہے۔

اُسی کے رحم سے حاصل سرورِ سرمدی ہوگا
اُسی کے رحم سے حاصل سرورِ آگہی ہوگا

اہل اسلام کو وداعِ مکہ کا حکم (ہجرت حبشہ) اور ''رسول اللہ ﷺ کو وداعِ مکہ کا حکم'' میں واقعاتی پہلو سلیقہ سے آ گئے ہیں۔ جب نبی کریم ﷺ کو اپنے گھر سے چلے جانے کا علم مشرکین مکہ کو ہوا تو ؎

سحر کو ایک صدا آئی کھڑے ہو کس لیے لوگو!
ہوئے راہی رسول اللہ، اک عرصہ ہوا لوگو!

''داعیٔ اسلام'' کا دوسرا حصہ غالباً ابھی شائع نہیں ہوا ہے ویسے حصہ اوّل میں مدنی زندگی کے کئی ابواب اور غزوات کا ذکر آ چکا ہے۔ اگر دوسرا حصہ ہندوستان میں شائع ہو چکا ہے تو امید ہے الرحیم اکیڈمی کراچی بھی اسے جلد ہی شائع کر دیں گے۔

اللہ سے دعا ہے کہ وہ شاعر کی اس کاوش اور ناشر کی سعی و کوشش کو قبول فرمائے اور انھیں اچھے دینی و دنیوی ثمرات عطا فرمائے، آمین!

(''تقریظ'' داعیٔ اسلام'' ۱۹۸۵ء)

نعت: حضوری کا ایک وسیلہ

نعت وہ موتی ہے جو حمد کے بطون سے پیدا ہوا ہے۔ ان دونوں کے درمیان وہی ربطہ وعلاقہ جو ذاتِ باری تعالیٰ اور ذاتِ نبی کریم ﷺ کے درمیان ہے۔ اس رشتے کا اظہار سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس خاکدان سے اپنے آخری سفر کے وقت یہ کہہ کر فرمایا کہ میں اپنے رفیقِ اعلیٰ سے ملنے جارہا ہوں۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی زندگی کا ہر نفس اللہ کی یاد اور اس کے رسول ﷺ کے ذکر سے عبارت تھا، اور وہ بھی یوں کہ جب وہ اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرتے تو سب سے بڑی نعمت کا ذکر سب سے پہلے لبوں پر آتا۔ وہ نعمت اور احسان حضرت محمد مصطفیٰ مجتبیٰ ﷺ کی بعثت ہے۔ خود اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی نعمت عظمیٰ کے طور پر بیان فرمایا ہے:

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ (آل عمران:۱۶۴)

نعت گوئی کو حضرت حسان بن ثابتؓ نے ایک مستقل صنف ادب کا درجہ عطا فرمایا اور نعت صرف شعر کی سطح تک محدود نہ رہی، بلکہ وہ مدافعت وتحفظ دین کا وسیلہ اور برہان بن گئی۔

آج ہر وہ زبان جس کو مسلمان استعمال کرتے ہیں کسی نہ کسی طور پر نعت کی روایات کی امین ہے۔ عربی اور فارسی کے بعد اردو کا دامن مجموعی طور پر دوسری تمام زبانوں کی نسبت کہربائے مدح رسول اکرم ﷺ سے زیادہ منور ہے۔۔۔۔ اردو، نعت کی جوت اور جگ مگ جگ مگ سے لشکارے مار رہی ہے۔ پاکستان کی علاقائی زبانیں بھی اس نور کی امانت دار ہیں۔ یہ نعت کی کرامت ہے کہ زبان کی حد بندیاں ٹوٹ جاتی ہیں اور ذکر رسول سے ہر زبان ہماری زبان بن جاتی ہے۔ رحمان بابا، بلھے شاہ، شاہ لطیف، مہر علی شاہ، محمد سلیم جان مجددی، انجم ہالائی ہمارا اظہار بن جاتے ہیں۔

صدیق اسماعیل سلمہ، نے یہ متاع سینہ تاب و خرد افروز ہمارے لیے یوں پیش کی ہے کہ قلب و نظر سے صل علیٰ محمد کی آوازیں اُبھرنے لگتی ہیں۔ اردو میں نعتیہ شاعری کے اچھے انتخابات شائع ہو چکے۔ اس وقت بے ساختہ شفیق بریلوی مرحوم کے لیے دعائے مغفرت دل کی گہرائیوں سے ابھر رہی ہے، لیکن صدیق اسماعیل کا مجموعہ اس اعتبار سے اپنی نوعیت کا پہلا مجموعہ ہے کہ اسے ایک نہایت ہی مخلص نعت خواں نے مرتب کیا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ کون سی نعتیں عام سننے والوں کے دلوں کو گرماتی اور تڑپاتی ہیں اور یہ محفل تو وہ ہے کہ یہاں خاص و عام کی تمیز و تفریق نہیں۔ اگر ذکرِ رسول ﷺ کی محفل کے پائیدان اور آخری صف میں بھی ہماری حاضری قبول ہو جائے تو یہی توشۂ آخرت ہے۔

صدیق اسماعیل کی اس محفل میں تاریخی اور لسانی ترتیب نہیں، بلکہ یہاں کیفیات و تاثرات کی ترتیب ہے۔ ان نعتوں میں حضور کی سرکار میں فکر و قلب دونوں کے نذرانے موجود ہیں۔ اچھے نعت گو کے الفاظ وہ لوح بن جاتے ہیں جن میں سرکار ﷺ کے جلووں کا عکس نظر آتا ہے۔ اگر آپ کو ان نعتوں کے مطالعے سے یہ حضوری حاصل ہوگئی تو یہ صدیق اسماعیل کی محنت اور کاوش کا ایک صلہ ہے۔ اصل جزا تو ان شاء اللہ انھیں ربِ جلیل اور اس کے رسول ﷺ ہی سے ملے گی۔

(مقدمہ ''انوارِ حرمین''، ۱۹۸۵ء)

دائرے کا شاعر

رحیم صدیقی عیاںؔ...... یہ نام نیا سہی، مگر بہت سی نسبتیں رکھتا ہے۔ میں تو اس نام پر ہی غور کرتا رہا۔ نہ جانے کیوں ـــــ ''رحیم'' اللہ کے ساتھ ساتھ محمد عربی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا بھی صفاتی نام ہے۔ وہ مومنوں کے ساتھ رؤف و رحیم تھے اور پھر صدیقی ـــــ اس رحیم المومنین کا خلیفۂ اوّل، یارِ غار ـــــ وہ کہ

ہستِ اوّل کشت ملّت را چو ابر
ثانیٔ اسلام و غار و بدر و قبر

سرشارؔ صدیقی کا شعر یاد آیا

جز نسبتِ صدیقی کیا نام و نسب اپنا
ہم اُن کے رفیقوں کے قدموں کے نشاں ٹھہرے

اور پھر ''عیاں'' ـــــ عیاں، جو سچ ہے، صدق ہے۔

عیاںؔ صدیقی کی شاعری سچ ہے، ان کی ذات کی ترجمان ہے، پھر یہ اکہری سطح کی شاعری نہیں۔ اس میں کئی پرتیں ہیں۔ شاعر نے گہرائی اور پرتوں کی جگہ '' دائرے'' کے لفظ کے ذریعہ پھیلاؤ اور تنوع کی طرف اشارہ کیا ہے، کیونکہ وہ بڑے دعوے کرنے کا قائل نہیں۔

عیاںؔ صدیقی ''ڈبائی'' کے رہنے والے ہیں۔ میرے بزرگ اور نہایت محترم و معتبر دوست جناب الحاج حفظ الرحمٰن وفاؔ ڈبائیوی کے عزیز ہیں۔ ڈبائی یوپی کے مردم خیز خطوں اور قصبوں میں سے ایک ہے۔ یہ ہماری تاریخ وثقافت کا ایک باب بھی ہے اور مرکز بھی۔ جدید اردو ادب کے حوالے سے بھی ڈبائی نے قدآور شخصیتیں پیدا کی ہیں۔

''دائرے''میں کئی نعتیں شامل ہیں۔ پہلے یوں ہوتا تھا کہ نعت گو شعرا کے علاوہ ہمارے دوسرے اکابرِ سخن ایک آدھ نعت تبرکاً درج دیوان کر دیتے تھے۔ ہمارے دور میں مختلف عوامل کے زیرِ اثر نعت گوئی کا دور شروع ہوا۔ ان عوامل میں ذرائع ابلاغ میں نعت کی مانگ ہے۔ گویا ب کی دنیا میں منڈی بن گئی۔ جہاں وجدان، ذوق اور اظہار ذات کی جگہ طلب و رسد کا قانون فرما نظر آتا ہے۔

جناب عیاںؔ کی نعتیں حضور سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ایک اُمتی کی وابستگی اور اس کی غلامی کی دستاویزوں کی طرح ہیں۔ یہ کسی رسم کی تکمیل نہیں بلکہ الفاظ کی صورت میں جذبات کا نذرانہ ہے بارگاہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں۔

توفیق نعت و حمد و ثنا مانگتے رہو
خوشبوئے گُل، مثالِ صبا مانگتے رہو

جناب عیاںؔ زیست یوں بسر کرنا چاہتے ہیں کہ رات مکّے میں مدینے میں سویرا ہو جائے۔ ہو جائے میں ''استمرار'' ہے یعنی ہر دن ہوتا رہے۔

جو سرورِ عالم کا ثنا خواں نہیں ہوتا
وہ مستحقِ رحمتِ یزداں نہیں ہوتا

○

جس زاویے سے دیکھیے قرآں صفات میں
دنیا کو مثلِ آئینہ، حیراں بنا دیا

نعت کے اشعار سے شاعر کے مزاج کے توازن، اندازِ نظر، الفاظ پر اس کی گرفت اور بات کہنے کے سلیقہ کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ جناب رحیم صدیقی کے ہاں یہ تمام صفات موجود ہیں اور ان کی جھلک غزلوں میں بھی ملتی ہے۔

عیاںؔ صاحب کے یہاں وہ ''جدت'' نہیں جو ''لایعانیت'' اور ''بے معانیت'' کی حدود

کو چھو لے اور وہ ''کلاسیکیت'' بھی نہیں جو پرانے اشاروں، علامتوں اور کنایوں کو لغوی معانی کی سطح پر لے آئے۔ غزل کی اس پستی پر حالؔی نے اپنے مقدمہ میں تنقید کی تھی، ورنہ وہ صنفِ غزل کے مخالف نہیں تھے۔

عیاںؔ صاحب کی غزل میں مروجہ علامتوں میں بھی شخصی فکر اور تجربوں کا اظہار ہوا ہے۔ وہ غزل کے اشعار سے اپنی کہانی بیان کرتے ہوئے، اپنے تجربات کا اظہار کرتے ہوئے، اور اپنی فکر میں ہم کو شریک بناتے ہوئے نظر آتے ہیں اور یہی خوبی ان کی شاعری، بالخصوص غزل کا جواز ہے۔ مسافر کی علامت اُنھوں نے معاشرہ میں فرد کے لیے استعمال کی ہے کیونکہ معاشرہ مسلسل آگے بڑھ رہا ہے اور یہی اس کا سفر ہے۔

مُسافر صرف اک رہرو نہیں ہے
مُسافر ہے متاعِ کارواں بھی

عیاںؔ صاحب سوچتے بھی ہیں اور مطالعہ بھی کرتے ہیں۔ میں نے اوپر کی سطروں میں یہ بات نہیں کہی ہے کہ ان کے یہاں جدّت نہیں ہے بلکہ یہ کہا ہے کہ جدّت کو انھوں نے فیشن کے طور پر نہیں اپنایا۔ انھوں نے انتشار لفظی وفکری سے اپنے آپ کو بچاتے ہوئے غزل کے ارتکاز کو اپنایا ہے۔ ان کے اشعار میں لہجہ اور مضمون کی تازہ کاری کی کمی نہیں۔

چند اشعار ملاحظہ ہوں:

بحرِ زیست میں انساں وقت کے جزیرے ہیں
مختلف، جُدا، اِک اِک، دُور منتشر، تنہا

دوسرا مصرع ان جزیروں کے ربط و گریز کی کیسی اچھی تصویر ہے۔ کاش ''مختلف'' اور ''جدا'' کے امتزاج کی جگہ کوئی اور لفظ ہوتا جو شعر میں معانی کی ایک جہت اور بڑھا دیتا۔

میں تیز دھوپ سے جو کچھ بچا کے لایا تھا
گھنے درخت کے سائے نے لے لیا مجھ سے

یہ یقیں ہے کہ بزمِ ہستی میں
کوئی تو درد آشنا ہوگا

اور کسی درد آشنا کے ذجود یا وجود کے امکان کے سہارے ہم، آپ اور عیاںؔ صاحب زندگی کا سفر طے کرتے ہیں، خواب دیکھتے ہیں اور شعر کہتے ہیں۔ عیاںؔ صاحب کی شاعری بھی آواز درد آشنا ہے۔ خدا کرے وہ یوں ہی زیست بسر کریں اور ان کی شاعری آوازِ دوست کی طرح ہمارے کانوں بلکہ وجود میں اپنی جگہ بنائے۔

(مقدمہ ''دائرے''، ۱۹۸۷ء)

سفینۂ نعت

مخدومی و مرشدی مولانا سید ابوالحسن ندوی نے اپنی ایک تقریر میں فرمایا تھا کہ ''ہر چیز کا شجرۂ نسب ہوتا ہے۔ مسجد کا شجرہ نسب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بنائی ہوئی مسجد کعبہ، بیت اللہ سے ملتا ہے اور جس مسجد کا نسب مسجد ابراہیمیؑ پر جا کر ختم نہ ہو وہ مسجد خانۂ خدا کہلانے کی مستحق نہیں، وہ مسجد ضرار ہے اور جس مدرسہ کا شجرۂ نسب صفہ نبوی ﷺ پر ختم نہ ہو وہ مدرسہ دانش کدہ نہیں، جہالت کدہ ہے۔'' ان الفاظ نے مجھے یاد دلایا کہ ہر معتبر سفینہ کا رشتہ سفینۂ نوح سے ملتا ہے۔ معتبریوں عرض کیا کہ اسی سفینہ سے حیات انسانی کے دور مابعد آدم نے قرار پکڑا اور نہ وہ طوفان تو نقش زائد باطل کو اپنے ساتھ بہا لے گیا تھا۔ یہ سفینۂ نعت بھی اسی سفینہ سے اپنا نسبی رشتہ رکھتا ہے۔ یہ مسرور کیفی صاحب کے آٹھ نعتیہ مجموعوں کا انتخاب ہے۔ تقریباً ہر نعت کے اشعار اس کے لیے منتخب کیے گئے ہیں۔ انتخاب کا یہ معیار بھی سفینۂ نوح کی تعمیر کے مطابق ہے، ورنہ سرکار ختمی مرتبت ﷺ کی مدح وثنا میں لکھے جانے والے ہر حرف کی توقیر تسلیم۔ یہ انتخاب تو ایک مجبوری ہے کیوں کہ مرتب کا دل چاہا کہ مسرور کیفی کے ہر مجموعے کی روشنی اور رنگ ہر نظر تک ہر مجموعے کی ٹھنڈک ہر قلب تک اور ہر حرف ثناء کا ذائقہ ہر مومن کے دل ونظر تک پہنچ جائے۔ ہمارا عہد، عہد نعت گوئی ہے۔ مگر شاید اس دور میں بھی آٹھ مجموعوں کا سرمایہ کسی اور کو عطا نہیں کیا گیا اور وہ بھی ایسے دربار سے جس کے متعلق ''غلط بخشی'' کا تصور بھی آدمی کو ایمان سے محروم کر دے۔

مسرور کیفی جاگتے ہیں تو نعت کی زبان میں گفتگو کرتے ہیں۔ سوتے ہیں تو خواب میں حرف نعت کی روشنی میں کبھی ان دیکھے مناظر دیکھتے ہیں اور کبھی اس کے رنگوں اور روشنیوں میں اپنے وجود کو بھیگتے دیکھتے ہیں۔ اس کی نعتوں میں بیشتر اشعار کی ترتیب لفظی اور نحو ہماری گفتگو اور بول چال

کے مطابق ہے۔ ترکیب سازی اور مضمون آفرینی سے بھی انھیں کوئی خاص دلچسپی نہیں۔ حضورؐ کا ذکر، مدینہ منورہ کے اذکار، روضہ اور اس کی جالیوں کے نظارے۔ مدینہ کی گلیاں۔۔۔ یہی ان کی متاعِ سخن ہے۔ اور آپ ہی کہیے کہ پھر حیات وکائنات کا کون سا موضوع ان ابواب کلام سے باہر ہے۔ ان کے سوا کسی صاحب ایمان کی تمنا بھی کیا ہوسکتی ہے۔ وہ ردیف وقافیہ کی تلاش میں وقت صرف کرنے والوں میں سے نہیں، صاحب گنبد خضریٰ خودان کے قلب پر نعت کے اشعار کی صورت نازل ہوتے ہیں۔ اللّٰھم صلی علیٰ سیدنا محمد عبدک ورسولک وصل علیٰ المومنین و المومنات والمسلمین والمسلمات۔

اس مجموعے کی تقریظ تو میرے استاد میرے دوست محمد شمیم صاحب لکھ رہے ہیں۔ مسرور بھائی کی قلمی تصویر بلقیس مرتب کررہی ہیں۔ شمیم صاحب نے مجھ سے کہا کہ تم ان کتابوں کے نام تاریخی ترتیب سے ضرور درج کردو جن کی چوب روشن سے یہ سفینہ بنایا جارہا ہے۔ سو میں تعمیل ارشاد کرتا ہوں۔

۱۔ چراغ حرا:۔ یہ مسرور کیفی کا پہلا نعتیہ مجموعہ ہے، جو عروج ادب کراچی نے جنوری ۱۹۷۸ء میں شائع کیا۔ اس کے ناشران کے دوست الطاف ملک ہیں جنھوں نے ’’ایک بہت بڑی سعادت سمجھ کر کتاب کی اشاعت کا کام اپنے ذمہ لے لیا۔‘‘ اور سچ مچ اس ذمہ داری کو ایمان تقاضے کے ساتھ پورا کیا، ورنہ ۱۲۰ صفحات کی، اس نہایت خوبصورت کتاب کی قیمت ۲۰ روپے نہ ہوتی۔

جناب مسرور کیفی نے اپنے حروف اول میں اپنے شعر کے ذریعے اپنی نعت گوئی کو یوں گرفت میں لیا ہے۔

دعویٰ کسے ہے نعت پیمبر کا دوستو!\
حسب عطائے مالک ہر دوسرا کہی

اس مجموعے میں جناب شاہ بلیغ الدین، نازش حیدری مرحوم، سید ابوالخیر کشفی اور شاہ تراب الحق قادری کے تاثرات شامل ہیں۔

نازش حیدری مرحوم کی مختصر تحریر سے معلوم ہوا کہ مسرور کیفی ان کے شاگرد ہیں۔ کیفی صاحب نے ۱۹۵۰ء سے بچوں کے لیے نظمیں کہنی شروع کیں، ۱۹۵۳ء سے غزل گوئی کا آغاز ہوا۔ ۱۹۶۰ء سے اپنی مادری زبان سندھی میں شاعری شروع کی اور ان کی شاعری کا دوسرا دور ۱۹۷۴ء میں اس وقت تک شروع ہوا جب وہ سعادت بیت اللہ (زیارت) سے مشرف ہوئے اور یہ دور انھیں نعت گوئی کی طرف لے گیا۔

۲۔ ملجاوماوا:۔ یہ مسرور کیفی صاحب کا دوسرا نعتیہ مجموعہ ہے۔ جسے ادارہ فروغ ادب نے اپریل ۱۹۸۰ء میں شائع کیا۔ باقی تمام مجموعے بھی اسی ادارے نے شائع کیے ہیں۔ اس مجموعے کے ساتھ بانو قدسیہ، ڈاکٹر فرمان فتحپوری اور جناب حفیظ تائب کی تقاریظ شامل ہیں۔ ۱۱۲ صفحات کے اس نعتیہ مجموعے کا فلیپ احسان دانش مرحوم نے لکھا تھا:

''جہاں مسرور کیفی کی نعتیں اہل محبت سے آنسو طلب کرتی ہیں اہل ذوق لے لیے پیغام تسکین بھی ہیں۔'' (احسان دانش)

بانو قدسیہ نے آرٹ کی اس شکل کا ذکر کیا ہے۔ ''جس میں انسان عبد کی شکل میں موجود ہو۔۔۔۔۔۔۔ یہی آرٹ ارفع ٹھیرتا ہے۔ کیونکہ یہی ناپائیدار کا پائیدار سے عشق ہے' اور انھوں نے مسرور کیفی کی نعت گوئی کو اسی آرٹ میں شامل کیا ہے۔ ''انھوں نے خودنمائی کی خلعت کو اتار کر پھینک دیا ہے۔'' یہ رائے حمد اور بالخصوص نعت کی ماہیت کو کس حسن سے گرفت میں لیتی ہے۔ اللہ بانو قدسیہ کو جزا دے۔

۳۔ جمال حرم:۔ تیسرا مجموعہ جمال حرم جون ۱۹۸۱ء میں شائع ہوا۔ اردو کتابوں میں پرنٹ لائن مشکل سے ملتی ہے۔ مسرور کیفی سال کے ساتھ ساتھ مہینے کا حوالہ بھی دیتے ہیں۔ یہ محض ماہ وسال کی بات نہیں، یہ عشق محمدی کی تقویم بھی ہے۔ جو شمسی اور قمری دونوں نظاموں کے پیمانوں کو اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے۔ ۱۱۲ صفحات کے اس مجموعے کے ساتھ پروفیسر ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، سید ابوالخیر کشفی، ڈاکٹر یونس حسنی، قادری محمد مصلح الدین صدیقی اور مولانا جعفر شاہ پھلواروی کی آراء

شامل ہیں۔

''جناب مسرور کیفی کی نعتوں میں۔۔۔۔۔۔ مژہ پر چمکتے ہوئے آنسو دکھائی دیتے ہیں۔'' (ڈاکٹر ابواللیث صدیقی)

''میں جب کیفی صاحب کے شعر پڑھتا ہوں تو مجھے نہ جانے کیوں ننھے منے بچے یاد آنے لگتے ہیں۔ جن میں سادگی اور معصومیت کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔'' (ڈاکٹر یونس حسنی)

''شاعر ہیں مگر شاعرانہ تکلفات سے کوسوں دور ہیں۔'' (مولانا جعفر شاہ پھلواروی مرحوم)

۴۔ مولائے کل:۔ کیفی صاحب کے سارے نعتیہ مجموعے بڑے سلیقہ سے خوبصورت زمینوں اور پس منظر کے ساتھ شائع ہوئے ہیں۔ مولائے کل ان سے بھی مختلف ہے۔ ہر صفحے پہلے زمین کے ساتھ پٹی ہے۔ جس پر سعدی کے وہ مشہور چار مصرعے ہیں جو آج بھی نعت کے سلسلے میں حرف معراج ہیں۔ بلغ العلیٰ بکمالہ۔۔۔۔

یہ مجموعہ اپریل ۱۹۸۲ء میں شائع ہوا۔ اس کے صفحات ۱۶۰ ہیں اور ہدیہ صرف ۲۵ روپے ہے۔۔۔ حضورؐ کی محبت کے یہ جام کیفی صاحب نے پڑھنے والوں کی خدمت میں کس شان بے نیازیٔ متاعِ دنیا کے ساتھ پیش کیے ہیں انتساب ہے۔ ''گنبد خضریٰ۔۔۔ تیرے جلووں کے نام۔'' پہلے مجموعے کا انتساب ''الحاج عبدالرحمٰن زکریا مرحوم'' اور شاعر کی اہلیہ زرینہ انجم کے نام تھا' دوسرے مجموعے کا انتساب ''مدینے کی دلکش ہواؤں'' کے نام تھا، اور تیسرے مجموعے کا اگرچہ کوئی تحریری انتساب نہیں لیکن زمین کے پس منظر میں تحریر ''یا محمد ﷺ'' ہی انتساب ہے۔ مولائے کل میں پیر محمد کرم شاہ الازہری اور مولانا کوثر نیازی کی تعارفی تحریریں موجود ہیں:

''عشق کے سمندر میں ان کے ذوق وشوق کی تند و تیز لہریں اور سہل ممتنع اہل علم وفضل کو بھی حیران کن مسرت سے ہم کنار کر دیتا ہے۔'' (پیر محمد کرم شاہ الازہری)

مولانا کوثر نیازی نے عشق نبیؐ کے ذکر میں بھی عوام وخواص کی دیواریں اٹھا دی ہیں۔ ''وہ خواص کے شاعر تو نہ کہلا سکیں گے، البتہ عوام کے شاعر ضرور ہیں۔'' الحمد اللہ راقم الحروف اپنا شمار ان

پڑھ لوگوں میں کرتا ہے جو بقول مولانا کوثر نیازی ان نعتوں کو پڑھ کر ''جھوم جھوم'' اٹھیں گے۔

۵۔ نور یزداں:۔ نور یزداں کے ساتھ اشفاق احمد، ذاکر علی خان اور ایک شعر کے ذریعے جناب عبدالغفور صاحب بھی رائے کے بہانے ذکر مصطفےٰ کی سعادت سے بہرہ مندہ ہوئے ہیں۔ فلیپ پر ڈاکٹر مرتضیٰ اختر جعفری کا نثری تبصرہ موجود ہے۔۱۱۲ صفحات کا یہ مجموعہ اپریل ۱۹۸۳ء کو شائع ہوا۔ سال کا ہر مہینہ مہنگائی لے کر آتا رہا مگر ہدیہ وہی بیس روپے۔ میں نے اس کا ذکر یوں ضروری سمجھا کہ اس سے مسرور کیفی کی شخصیت کا عاشقانہ پہلو ابھر کر سامنے آتا ہے۔ ان کے یہ مجموعے بارگاہ رسالت (ﷺ) میں سالانہ نذرانے ہیں۔ جب نیا مجموعہ شائع ہو جاتا ہے تو وہ اس خنک شہر کا رخ کرتے ہیں۔ جہاں ہمارا آرام جہاں (ﷺ) آرام فرما ہے۔ امتی کے اس ہدیہ کی قبولیت کی نشانی یہی ہے۔ کہ اس کا رسول (علیہ الصلوٰۃ والسلام) تقریباً ہر سال اسے اذنِ حضوری عطا کرتا ہے۔

اشفاق احمد نے لکھا ہے کہ ''مسرور کیفی نعتوں کی روشنی کے سہارے روز جزا کے خوف سے بھی باہر نکل گیا ہے'' اور ''میرے خیال میں مسرور کیفی وہ واحد لکھی بنجارہ ہے جس نے اور سب چیزوں کو چھوڑ کر مدینہ سے اصل اور صحیح زر مبادلہ کمایا ہے۔'' محمد ذاکر علی خان کو مسرور کیفی کے ہاں ''والہانہ لگاؤ سادگی اور خواہش سپردگی'' نظر آئی ہے۔

اس مجموعے کے گرد سبز رنگ کا حاشیہ ہے اور ایک فانوس لٹک رہا ہے جو ''بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر'' کے نور کو اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے۔

۶۔ میزاب رحمت:۔ مسرور کیفی کے چھٹے مجموعے ''میزاب رحمت'' میں نور کی بارش نظر آتی ہے۔ پس منظر میں میزاب رحمت مرکز میں ہے اور آب نور کے دھارے یا کرنیں اس سے نکل رہی ہیں۔ یہ مجموعہ مارچ ۱۹۸۴ء میں شائع ہوا۔ صفحات اور ہدیہ مسرور کیفی کی روایت کے مطابق۔ حرف آغاز لکھنے والے دوست محمد فیضی اور مولانا محمد ولی رازی۔ ایک وہ جس نے سیرتؐ کے بارے میں کتنی ہی تقریریں کیں۔ دوسرا ہادیٔ عالم کا مصنف۔ مسرور کیفی اپنے آقا کے غلاموں اور مدح خوانوں کو کس

طرح یاد رکھتے ہیں۔

۷۔ سید الکونین:۔ مسرور کیفی کا ساتواں مجموعہ ''سید الکونین'' مارچ ۱۹۸۶ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعہ کے ساتھ کوئی تقریظی تحریر شامل نہیں ہے۔ یہ وہ مرحلہ ہے۔ جہاں پہنچ کر شاعر نے رضائے رب اور خوشنودیٔ نبی کریم ﷺ کو اپنی جزا سمجھ لیا اس مجموعے کے لیے کیفی صاحب نے مختلف شعرا کے ۱۶ ایسے فارسی اور اردو شعر منتخب کر لیے جن میں نعت گوئی کے بارے میں کوئی نکتہ پیش کیا گیا ہے۔ اور ہر صفحہ کی پیشانی انھی اشعار سے مزین ہے۔ مہنگائی میں اضافہ کے باوجود ۱۱۲ صفحات کے اس مجلد مجموعے کا ہدیہ وہی بیس روپے ہے۔ مسرور کیفی تجارتی قیمت اور ہدیۂ محبت کے معانی اور فرق کو خوب سمجھتے ہیں۔

۸۔ سجدۂ حرف:۔ یہ ان کا آٹھواں مجموعہ ہے اور کسی کی تحسینی تحریر کے بغیر شائع ہوا ہے۔ یہ اس مرحلہ کی شاعری ہے جس پر پہنچ کر شاعر اپنے آقا، اپنے مولا، اپنی کائنات دل اور اس کے مالک سے پوری سچائی کے ساتھ کہہ سکتا ہے۔

اپنی یادوں سے سجایا آپؐ نے
دل کو آئینہ بنایا آپؐ نے

یہ مجموعہ مارچ ۱۹۸۸ء میں شائع ہوا ہے اور ہدیہ وہی بیس روپے۔ اس بات کو میں نے بار باریوں دہرایا کہ شاید نعتیہ مجموعوں کی آسمان سے باتیں کرتی ہوئی قیمتیں طے کرنے والوں کو کچھ خیال آئے۔ یہ ہدیہ تو جلد اور سرورق کے صرفہ کے لیے بھی مشکل ہی سے کافی ہوگا۔ مسرور کیفی صاحب کا نواں مجموعہ نعت ''حرف عطا'' کتابت کے مرحلوں سے گزر رہا ہے۔ اور اس سے پہلے سفینۂ نعت ان شاء اللہ شائع ہو جائے گا۔ یہ انتخاب اسی وقت انتخاب ٹھہرے گا جب مسرور کیفی صاحب اسے حضور اکرم ﷺ کے حضور پیش کریں گے۔

مسرور کیفی نعت گوئی کے پل صراط سے بامراد گزرے ہیں۔ سفر آغاز چراغ حرا سے ہوا۔۔ یہ جلوہ دور سے دیکھا گیا۔ آغاز بعثت کے مقام کو انھوں نے محل تناظر بنایا۔ اسی غار سے یہ

پڑھ لوگوں میں کرتا ہے، جو بقول مولانا کوثر نیازی ان نعتوں کو پڑھ کر ''جھوم جھوم'' اٹھیں گے۔

۵۔ نور یزداں:۔ نور یزداں کے ساتھ اشفاق احمد، ذاکر علی خان اور ایک شعر کے ذریعے جناب عبدالغفور صاحب بھی رائے کے بہانے ذکرِ مصطفیٰ کی سعادت سے بہرہ مندہ ہوئے ہیں۔ فلیپ پر ڈاکٹر مرتضیٰ اختر جعفری کا نثری تبصرہ موجود ہے۔ ۱۱۲ صفحات کا یہ مجموعہ اپریل ۱۹۸۳ء کو شائع ہوا۔ سال کا ہر مہینہ مہنگائی لے کر آتا رہا مگر ہدیہ وہی بیس روپے۔ میں نے اس کا ذکر یوں ضروری سمجھا کہ اس سے مسرور کیفی کی شخصیت کا عاشقانہ پہلو اور ابھر کر سامنے آتا ہے۔ ان کے یہ مجموعے بارگاہ رسالت (ﷺ) میں سالانہ نذرانے ہیں۔ جب نیا مجموعہ شائع ہو جاتا ہے تو وہ اس خنک شہر کا رخ کرتے ہیں۔ جہاں ہمارا آرام جہاں (ﷺ) آرام فرما ہے۔ امتی کے اس ہدیہ کی قبولیت کی نشانی یہی ہے۔ کہ اس کا رسول (علیہ الصلوٰۃ والسلام) تقریباً ہر سال اسے اذنِ حضوری عطا کرتا ہے۔

اشفاق احمد نے لکھا ہے کہ ''مسرور کیفی نعتوں کی روشنی کے سہارے روز جزا کے خوف سے بھی باہر نکل گیا ہے'' اور ''میرے خیال میں مسرور کیفی وہ واحد لکھی بنجارہ ہے جس نے اور سب چیزوں کو چھوڑ کر مدینہ سے اصل اور صحیح زر مبادلہ کمایا ہے۔'' محمد ذاکر علی خان کو مسرور کیفی کے ہاں ''والہانہ لگاؤ سادگی اور خواہش سپردگی'' نظر آئی ہے۔

اس مجموعے کے گرد سبز رنگ کا حاشیہ ہے اور ایک فانوس لٹک رہا ہے جو 'بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر' کے نور کو اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے۔

۶۔ میزاب رحمت:۔ مسرور کیفی کے چھٹے مجموعے ''میزاب رحمت'' میں نور کی بارش نظر آتی ہے۔ پس منظر میں میزاب رحمت مرکز میں ہے اور آب نور کے دھارے یا کرنیں اس سے نکل رہی ہیں۔ یہ مجموعہ مارچ ۱۹۸۴ء میں شائع ہوا۔ صفحات اور ہدیہ مسرور کیفی کی روایت کے مطابق۔ حرف آغاز لکھنے والے دوست محمد فیضی اور مولانا محمد ولی رازی۔ ایک وہ جس نے سیرتؐ کے بارے میں کتنی ہی تقریریں کیں۔ دوسرا ہادیٔ عالم کا مصنف۔ مسرور کیفی اپنے آقا کے غلاموں اور مدح خوانوں کو کس

طرح یاد رکھتے ہیں۔

۷۔ سید الکونین:۔ مسرور کیفی کا ساتواں مجموعہ ''سید الکونین'' مارچ ۱۹۸۶ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعہ کے ساتھ کوئی تقریظی تحریر شامل نہیں ہے۔ یہ وہ مرحلہ ہے۔ جہاں پہنچ کر شاعر نے رضائے رب اور خوشنودیٔ نبی کریم ﷺ کو اپنی جزا سمجھ لیا اس مجموعے کے لیے کیفی صاحب نے مختلف شعرا کے ۱۶ ایسے فارسی اور اردو شعر منتخب کر لیے جن میں نعت گوئی کے بارے میں کوئی نکتہ پیش کیا گیا ہے۔ اور ہر صفحہ کی پیشانی انھی اشعار سے مزین ہے۔ مہنگائی میں اضافہ کے باوجود ۱۱۲ صفحات کے اس مجلد مجموعے کا ہدیہ وہی بیس روپے ہے۔ مسرور کیفی تجارتی قیمت اور ہدیۂ محبت کے معانی اور فرق کو خوب سمجھتے ہیں۔

۸۔ سجدۂ حرف:۔ یہ ان کا آٹھواں مجموعہ ہے اور کسی کی تحسینی تحریر کے بغیر شائع ہوا ہے۔ یہ اس مرحلہ کی شاعری ہے جس پر پہنچ کر شاعر اپنے آقا، اپنے مولا، اپنی کائنات دل اور اس کے مالک سے پوری سچائی کے ساتھ کہہ سکتا ہے۔

اپنی یادوں سے سجایا آپؐ نے
دل کو آئینہ بنایا آپؐ نے

یہ مجموعہ مارچ ۱۹۸۸ء میں شائع ہوا ہے اور ہدیہ وہی بیس روپے۔ اس بات کو میں نے بار باریوں دہرایا کہ شاید نعتیہ مجموعوں کی آسمان سے باتیں کرتی ہوئی قیمتیں طے کرنے والوں کو کچھ خیال آئے۔ یہ ہدیہ تو جلد اور سرورق کے صرفہ کے لیے بھی مشکل ہی سے کافی ہوگا۔ مسرور کیفی صاحب کا نواں مجموعہ نعت ''حرف عطا'' کتابت کے مرحلوں سے گزر رہا ہے۔ اور اس سے پہلے سفینۂ نعت ان شاء اللہ شائع ہو جائے گا۔ یہ انتخاب اسی وقت انتخاب ٹھہرے گا جب مسرور کیفی صاحب اسے حضور اکرم ﷺ کے حضور پیش کریں گے۔

مسرور کیفی نعت گوئی کے پل صراط سے بامراد گزرے ہیں۔ سفر آغاز چراغ حرا سے ہوا۔۔۔ یہ جلوہ دور سے دیکھا گیا۔ آغاز بعثت کے مقام کو انھوں نے محل تناظر بنایا۔ اسی غار سے یہ

شرک بالرسالت کی پرچھائیاں نظر آتی ہیں۔لطیف آثر کا کہنا ہے

سُرمہ بنائیں خاکِ مدینہ کو اے آثر اتنا تو احترام مدینے کا ہم کریں

اور اِس ارادہ اور جذبہ کی جزا انھوں نے دانش کے طور پر طلب نہیں کی ہے، بات بس احترامِ مدینہ کی ہے اور یہی ہمارے لیے سب کچھ ہے۔

میں اِس وقت زیارتِ حرمین شریفین کے لیے پابہ رکاب ہوں۔طبیعت لکھنے پڑھنے پر آمادہ نہیں، لیکن رسولِ کریم ﷺ اور شہرِ دلبر کا تذکرہ لطیف آثر صاحب نے جس جس طرح کیا ہے اُس نے اِس تحریر کے لیے تحریک پیدا کی اور میں ان شاء اللہ مدینہ منورہ میں اِن احساسات کے عکس کے ساتھ پہنچوں گا

قدم قدم پہ درخشاں ہیں چاہتوں کے چراغ مدینہ کیا ہے، حقیقت میں ایک جنت ہے

○

دیارِ مصطفٰےؐ میں گھومتا ہوں بِرا دامن نہ میرے ہاتھ خالی

○

آپ کے شہر کا کیا ذکر کروں عرش کو دیکھ لیا ہو جیسے

ہماری نصف بہتر نے ایک قیامت بات کہی ہے کہ نعت صنفِ سخن نہیں بلکہ توفیقِ الٰہی ہے۔میں نے بھی جناب لطیف آثر کا مطالعہ اِسی قول کو سامنے رکھ کر کیا ہے۔اللہ تعالیٰ اِس نعتیہ مجموعہ کو حُسنِ قبول عطا کرے اور نبی کریم ﷺ کے حضور اِسے تحفہ اور ہدیہ کا درجہ عطا کیا جائے۔کہیں کہیں عشق آدابِ شریعت پر غالب آگیا ہے۔محمدؐ کے ساتھ ساتھ ربِ محمدؐ کے سامنے بھی ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔

(۱۹۹۴ء)

آرزو، صبا، آنسو اور شعر بھی ذکر رسول ﷺ کے حوالے بن جاتے ہیں۔ میزاب رحمت میں مدینہ کے ساتھ رنگ، نکہت، پھول اور روشنی کے تلازمے بار بار آتے ہیں۔ یوں رنگ و نکہت اور روشنی، اس بارش کے اجزائے ترکیبی بن جاتے ہیں جس میں بھیگ کر اہل ایمان کا وجود پاک کیا جاتا ہے۔

سید الکونین میں ایک بالکل ہی نئی کیفیت سامنے آتی ہے۔ سمٹنے اور بکھرنے کی کیفیت۔ آدمی یہاں بکھرتا ہے سمٹنے کا لیے۔ اور سمٹنا اپنی ذات کی تشکیل جدید کا نام ہے۔

جب بھی جاتا ہوں میں سر دربار
کیا بکھرتا ہوں کیا سمٹتا ہوں

بکھر جانا۔ عارضی دوری کا شکوہ، حضورؑ سے اپنی ذات سے دوری، آپؐ سے دور رہ کر غم زمانہ اور مدینہ کی فضائیں ہر درد کا ازالہ کر دیتی ہیں اور ان کے دربار سے کیا کچھ نہیں مل جاتا۔

طلب سے سوا دے دیا اللہ اللہ
عطا اور انؐ کی عطا اللہ اللہ

○

گنبد خضریٰ کی ساری دل کشی
میں نے آنکھوں میں چھپا لی مصطفےٰؐ

اور اب مسرور کیفی کی نعت گوئی اپنے آقا سے ایسا رشتہ بن گئی ہے کہ یادیں روشنی کے دھارے بن گئی ہیں، طیبہ کے کانٹے ان کے لیے پھول بن گئے ہیں۔ نعت گوئی کے لمحات چاند کی روشنی بن جاتے ہیں اور اب مدینے کی ہواؤں کے جھونکے طلبی کا مقدمہ اور پیش خیمہ بن کر ان تک پہنچتے ہیں۔

اب کچھ اس انتخاب کے بارے میں۔ غزل اور دوسرے اصناف سخن کا انتخاب خالص ادبی بنیادوں پر ممکن ہے۔ زبان کی برجستگی، مضمون کی صفائی، ندرت خیال، کسی نئے گوشے، کسی نئے اظہار کی بنا پر اشعار انتخاب کیا جا سکتا ہے۔ لیکن نعت کے ساتھ ساتھ یہ معاملہ نہیں کیونکہ نعت محض

صنف سخن نہیں، بلکہ اپنے رسول ﷺ سے ہم امتیوں کے تعلق کا اظہار ہے اور اس اظہار کی سطحیں، تہیں اور پہلو بے شمار ہیں۔ کبھی ان کی خدمت میں استغاثہ، کبھی ان کے دور کی یاد، کبھی ان کے فقر کا خیال، کبھی گالیاں سن کر دعائیں دینے کی عادت طیبہ کا دھیان، کبھی ہمارے احوال پر ان کی توجہ، کبھی ہماری لغزشوں پر ان کا تبسم۔ روضہ کی جالیوں حرم نبویؐ کے ستونوں اور مدینہ کی گلیوں اور خاک کے ذروں کا ذکر ارادۃً نہیں کیا کہ یہ مضامین تو بہر صورت ہمیں مسخر کر لیتے ہیں۔ اب نعت پڑھتے وقت قاری اور ناقد کی ذہنی کیفیات مختلف اوقات میں مختلف ہوں گی، اور اس کا انتخاب انھی کیفیات کا عکس ہوگا۔ یوں نعتیہ شاعری کا انتخاب بے حد مشکل کام ہے اور ویسے بھی نعت کے اشعار حذف کرنا گستاخی معلوم ہوتا ہے۔ آخر میں صرف یہ عرض کروں گا کہ میں نے جناب سرور کیفی کی کہکشان نعت کے تمام رنگ آپ تک پہنچانے کی کوشش ضرور کی ہے۔ اللہ میری کوشش کو قبول فرمائے۔ رہی سرور کیفی صاحب کی بات، سو وہ اس دربار کے حاضر باشوں میں سے ہیں۔ ان کی وجہ سے میں بھی اپنے آپ کو بقول جناب جمیل نقوی، ارباب حضوری میں شامل کرنے کی جسارت کرتا ہوں۔

میں بھی من جملہ ارباب حضوری ہوں جمیل
میری خاصان محمدؐ سے شناسائی ہے

پس یہ اپنے بارے میں کوئی دعویٰ نہیں، خاصان محمدؐ سے شناسائی پر اللہ تعالیٰ کے حضور تحدیث نعت ہے۔

(مقدمہ ''سفینۂ نعت''، ۱۹۹۰ء)

ایک قادرُ الکلام شاعر

بدایوں مدینۃُ الاولیا ہی نہ تھا بلکہ مصرِ شعروسخن اور دیارِ علم وفن تھا۔ بدایوں کی یہ حیثیت ہمارے عہد تک قائم رہی۔ آج بھی ارضِ پاکستان میں کئی ممتاز اور قدآور ادبی شخصیتیں ایسی موجود ہیں جن کا تعلق اسی سرزمینِ عشق وعلم سے ہے جناب عبدالجامع جامیؔ بدایونی ایسی شخصیتوں میں درجۂ امتیاز رکھتے تھے۔

ان میں اپنے نام کی جھلک موجود تھی۔ ان کے رَب نے ان کی ذات میں کئی شخصتیں جمع فرمادی تھیں۔ وہ عالم تھے صاحبِ تقویٰ مسلمان تھے، اچھے شاعر تھے۔ ان کے عشق رسولؐ اور شاعری کے ذوق نے ان کی نعت گوئی میں اپنا اظہار پایا۔ انہوں نے جامیؔ تخلص اختیار کر کے فارسی کے عظیم نعت گو مولانا جامیؔ سے اپنے رشتہ کا اظہار کیا ہے۔ بدایوں نے ایسے کئی شاعر پیدا کئے ہیں جنہوں نے نعت گوئی میں کمال حاصل کیا۔ اور عشقِ نبی کریم ﷺ کو دنیا میں اپنی شناخت اور آخرت کے لیے زادِراہ بنایا۔ حضرت مذاقؔ میاں بدایونی، اسیرؔ بدایونی اور ثاقبؔ بدایونی کے ساتھ ساتھ ایسے شعراء میں جناب جامیؔ بدایونی بھی شامل ہیں۔

نعت گوئی کا خلاصہ یہ ہے کہ ع

بعد از خُدا بزرگ توئی قصہ مختصر

لیکن عاشقانِ رسول مدنی ﷺ نے آئینۂ شام وسحر، زمین کی وسعتوں اور آسمان کی بے کرانیوں میں اپنے رسولِ ہاشمی ومکّی علیہ الصلوٰۃ وَالسلام کا جلوہ کس کس طرح دیکھا ہے اور کیسے کیسے پیرائے اپنی دید اور جذبات کے اظہار کے لیے اختیار کیے ہیں۔ یہی ان کی زندگی کا ماحصل ہے۔ یہ وہ رِند ہیں جو اسی سرمستی کو حاصلِ حیات سمجھتے ہیں: ع

مئے خانۂ عشق ساقی میں پینا ہے اُنہیں کا اے جامؔی
ہونٹوں سے لگا کر پیانہ جو ہوش میں آنا بھول گئے

اور اس فراموشی میں ہشیاری و بیداری کا ہر زاویہ اور ہر گوشہ موجود ہے جناب جامؔی بدایونی کے مجموعۂ نعت ''زادِ آخرت'' میں غزل بھی ہے، خمسہ بھی، مسدّس بھی، رباعی بھی۔ وہ ایک قادرُ الکلام شاعر تھے۔ اُن کی قدرتِ کلام میں فن پر گرفت اور زبان پر قدرت دونوں شامل ہیں۔ اور اس شاعری میں زندگی ان کے دلِ زندہ سے پیدا ہوئی ہے۔ اور عشقِ سرورِ کائناتؐ سے ان کا دل یوں دھڑک رہا ہے کہ اس کی دھڑکن دوسروں کے دلوں کو زندہ تر کر رہی ہے۔

جناب جامؔی بدایونی کی نعت گوئی میں ایک طرف حمدِ ربِّ محمدؐ ہے اور دوسری طرف منقبت صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین ہے۔ یہی وہ مقامِ تناظر ہے۔ جو نعت گوئی کو پیش منظر اور پس منظر عطا کرتا ہے۔ نبیٔ کریم ﷺ عالمِ انسانیت پر اللہ کے سب سے بڑے احسان اور فضل کا درجہ رکھتے ہیں اور صحابۂ کرام تاریخ سازی کے باب میں سرورِ کائنات ﷺ کے شاہکار اور زندہ دستاویز کا درجہ رکھتے ہیں۔

جناب جامؔی نے اپنے عشقِ رسولؐ کی قوّت سے کیسی کیسی سنگلاخ زمینوں کو موم کی طرح پگھلا دیا ہے۔

بزمِ جہاں میں بادۂ اطہر کی ہے تلاش
یعنی نگاہِ قاسمِ کوثر کی ہے تلاش
محشر میں اُن کے سامنے گزروں خدا کرے
جن کو غریب بیکس و مضطر کی ہے تلاش

ظہورِ قدسی کے موضوع پر اُن کی فکر نے اپنی وسعت کا اظہار کیا ہے اور ذکرِ ولادتِ مصطفویؐ کو سلام سے ہم رِشتہ کر دیا ہے۔ اردو میں کئی شعراء نے سلام کا حق ادا کیا ہے۔ حفیظ جالندھری، مولانا ماہر القادری اور جگن ناتھ آزاد وغیرہ! لیکن جناب جامؔی کا انداز ان شعراء

سے مختلف ہے انہوں نے دینی اور مذہبی پس منظر میں عالمِ انسانیت پر نبی کریمؐ کے احسانات کو پیش کیا ہے: ؎

سَلام اے آبرو بخشِ سبیل و کوثر و زمزم

سَلام اے رنگ افزائے بہارِ روضۂ رضواں

سَلام اے نقطۂ انعام پرکارِ خُداوندی

سَلام اے ابتدا و انتہائے رحمتِ رحمٰن

اس مجموعے میں ملّی موضوعات پر نظمیں بھی ہیں، ایسی رُباعیاں بھی ہیں جن میں مسلمان کے حالات پر تبصرے ہیں اور پیغامِ عمل ہے۔ ان سب کو زادِ آخرت قرار دینا مناسب ہے کیونکہ ہر عمل جس کی بناء رضائے الٰہی پر ہے وہ مسلمان کے لیے عبادت کا درجہ رکھتا ہے۔

خدا کرے کہ اس مجموعۂ نعت و منقبت کو مقبولیت حاصل ہو اور یہ مجموعہ ہمارے مرحوم شاعر کے لیے زادِ آخرت ثابت ہو۔

(''زادِ آخرت''، ۱۹۹۱ء)

چراغِ راہِ حرم

جناب لطیف آثر کے پہلے مجموعے ''حصارِ انا'' کے دیباچے میں، میں اُن کی ذات اور اپنے تعلقات کی داستان بیان کر چکا ہوں۔ اُس کے بعد دوسرا مجموعہ ''سیلِ تمنا'' شائع ہوا۔ اور اب وہ چراغِ راہِ حرم لے کر ہماری زندگی کی تاریک راہوں میں آرہے ہیں۔

یہ سطریں لکھتے لکھتے اِن تینوں مجموعوں کے ناموں کے ربط کی طرف ذہن اچانک منتقل ہوگیا۔ لطیف آثر صاحب نے بجا طور پر اپنے ادبی سفر کے آغاز کو حصارِ انا کا عنوان دیا۔ ادب انا کا اعلان ہی تو ہے۔ یہ میں ہوں، مجھے دیکھو، میری آواز سنو۔ دید اور شنید کی یہ دعوت لکھنے والے اور پڑھنے والے کے درمیان رابطہ قائم کرتی ہے۔ سیلِ تمنا، انا کے سفر کی شدّت کا اشاریہ ہے۔ ''تمنا'' کی اصلاح کے امکانات دیکھنے ہوں تو صرف غالبؔ سے رجوع کیجیے

تماشا کر اے محوِ آئینہ داری تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

○

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب ؟ ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا، پایا

بظاہر غالبؔ نے اِسی دُنیا کو، ہماری آپ کی دُنیا کو، دشتِ امکاں قرار دیا ہے، اور ہر دُنیا جو انسان کے زیرِ قدم آئے گی، دشتِ امکاں کہلائے گی۔ ''چراغ راہِ حرم'' کو سیلِ تمنا کے ساتھ وابستہ کیا تو معلوم ہوا کہ تمنا کا دوسرا قدم ہی جہانِ محمدی ﷺ ہے۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔ یہی وہ مقام اور راہ ہے جہاں تمنا، سیل اور سفر کے مرحلے سے گزر کر قیام پذیر ہو جاتی ہے اور مُسافر کو اپنا ٹھکانا مِل جاتا ہے۔ یہ مرحلہ آئینہ خانہ کے بغیر طے نہیں ہوتا۔ ہر طرف آئینے ہی آئینے ہوں۔ اُن میں ذات و کائنات کو دیکھتے رہیے اور پھر سارے آئینوں میں ایک ہی عکس نظر آنے لگتا ہے اور یہ سارے

عکس چراغِ راہِ حرم کی روشنی میں نظر آتے ہیں۔ رقصاں رقصاں، مُنظّم مُنظّم ۔آئینے لطیف اثر صاحب کا تیسرا مجموعہ ہے جس کے ہر شعر میں آئینے کا استعارہ اور ردیف استعمال کی گئی ہے۔ یہ مجموعہ ایک نئی مثال بن کر ہماری شاعری کی تاریخ میں اُبھرے گا۔ آئینہ کا استعارہ فارسی اور اُردو غزل کے کتنے مناظر، چہروں اور خدوخال کا محیط ہے، مگر اثر صاحب نے اس کے امکانات کو نئے انداز اور بڑی جامعیت کے ساتھ اُجالا ہے۔

جیسا میں نے عرض کیا کہ اِن آئینوں کا انعکاس، چراغِ راہِ حرم کا مرہونِ منت ہے۔ آئینے سے پہلے اِس نعتیہ مجموعے کی اشاعت میری ضد کا نتیجہ ہے۔ بہر حال ان مجموعوں کی معنوی ترتیب یہی رہے گی۔ حصارِ انا، سیلِ تمنا، آئینے اور چراغِ راہِ حرم۔

یہ چراغِ راہِ حرم اثر صاحب کے لیے روشنی کا منبع ہے۔ اِسی چراغ کی روشنی میں انھوں نے زندگی اور اُس کے مناظر کو دیکھا، اور حرم زندگی کا استعارہ ہے۔ یہ ہماری زندگی کی راہوں کا چراغ ہے۔ راہِ حیات کے چراغ کا اسم اور علَم محمدؐ ہے۔ اِس چراغ سے چودہ صدیوں میں کتنے چراغ روشن ہوئے ہیں۔ والذین معہ، ۔ وہ چراغوں کا ایک جلوس تھا جس نے تاریخ کی راہوں کو ہمیشہ کے لیے منور کر دیا۔ محمد رسول اللہ۔ اِس سراجِ مُنیر کی روشنی ہمارے وجود میں سوئی ہوئی حقیقی شخصیت کو جگا دیتی ہے، اُسے اندھیرے سے اُجالے میں لے آتی ہے اور منور کر دیتی ہے۔ اِسی چراغ کی روشنی کا عکس ابوبکرؓ کے صدق میں ہے، عُمرؓ کی رُوح کے سوز میں ہے، عثمانؓ کی حیا میں ہے اور علیؓ کے علم میں ہے۔ اِسی روشنی کا عکس اِس اُمت کے عُلما، فقہا اور ادبا و شعرا کے افکار و خیالات میں ہے۔ یہ روشنی ہمارے دِلوں کے چراغوں کو بھی روشن کر دیتی ہے۔

پھرتا ہوں سرِ عام دیے دِل کے جلا کے　　دیکھے تو مدینے کی حدوں میں کوئی آ کے

لطیف اثر صاحب عاشق ہیں۔ اِسی عشق نے انھیں شاعر بنا دیا اور اُن کی آنکھوں کے آنسوؤں کو شعر کے قالب میں ڈھال دیا۔ اب اِس سیلِ تمنا کو ساحلِ محمدی ﷺ مِل گیا۔ لیکن یہ مجموعہ دوسروں کے دلوں کے سمندر میں سیلِ تمنا پیدا کر دیتا ہے۔ ربِ محمد ﷺ کا کرم اور احسان ہے

کہ کتنے ہی دوستوں اور شاعروں نے ذکرِ محمد مصطفےٰ ﷺ میں مجھے شرکت کا موقع عنایت فرمایا۔ آج ایک مجذوب شاعر کے نعتیہ کلام پر قلم اُٹھاتے ہوئے ادبی اور تنقیدی نظم وضبط کے ہر اصول کو توڑنے کو دِل چاہ رہا ہے۔ ہوتا تو یہ ہے کہ نقاد پُورے مجموعے کو پڑھے، اپنا انتخاب کرے، پھر اُس انتخاب کو ایک صورت اور ترتیب دے اور اِن مرحلوں سے گزرنے کے بعد اپنے خیالات کا اظہار کرے۔ لیکن آج سوچا یہ ہے کہ جو اشعار سامنے آتے جائیں اُن کو آپ کی خدمت میں پیش کرتا جاؤں۔ ایسے شعر جو شاعر کا اہم تجربہ یا تاثر معلوم ہوں، یا میرے لیے اُن کا پڑھنا تجربہ بن جائے۔ قاری ادب کی تفہیم میں مصنّف کا شریک ہوتا ہے۔ دونوں مِل کر ادبی اقدار کا انکشاف کرتے ہیں ۔انکشاف کے لفظ سے یہ بات یاد آئی کہ بعض شاعر آہستہ آہستہ اپنے آپ کو اپنے قاری پر منکشف کرتے ہیں اور ایک بار سے زیادہ اپنے مطالعہ کا مطالبہ کرتے ہیں۔ لطیف آثر صاحب بھی ایسے ہی شاعر ہیں۔ ممکن ہے کہ ان کے بعض اشعار سے آپ پہلی بار سرسری گزر جائیں اور دوسری بار پڑھتے ہوئے وہی شعر جہانِ دیگر معلوم ہو۔ آثر صاحب کی جس نعت کا مطلع میں آپ کی خدمت میں پیش کر چکا ہوں، اب اُس کا یہ شعر ملاحظہ ہو

مِل جائیں جو نقش آج بھی اُن کے کفِ پا کے
معراج کی منزل پہ پہنچ جائیں زمانے

اقبالؔ کے بعد شاید ہی کسی شاعر نے معراج اور حیات و تاریخِ انسانی کے رشتے کو یوں پیش کیا ہو۔ اقبالؔ نے خطبات میں اِس خیال کا اظہار کیا ہے کہ نبی کا کوئی تجربہ محض انفرادی نہیں ہوتا بلکہ اجتماعی پہلو بھی رکھتا ہے، مثلاً معراج کی ماہیّت اور کیفیّت کو اللہ جانے اور اُس کا رسول ﷺ لیکن معراج میں سرکارِ دو عالم ﷺ کو قربتِ الٰہی اور مشاہداتِ غیب کے ذریعہ جو قوت عطا کی گئی اُس سے آپؐ نے تاریخ اور زمان و مکاں کے رُخ کو بدل دیا۔ معراجِ محمدی ﷺ معراجِ بنی آدم ہے۔ یہ معراج گردوں کے عالمِ بشریّت کی زد میں ہونے کی بشارت تھی۔ پھر معراج کا تحفہ نماز ہے اور الصلوٰۃ معراج المومنین ۔ یوں اِس معراج نے ہمارے احوال وکوائف کے مطابق اُمتِ مُسلمہ کو بھی ایک معراج عطا کر دی۔ اور اِس معراج کا رشتہ نقشِ کفِ پائے محمد ﷺ سے ہے۔ عُرُج بلندی کی

طرف اور بلندی پر چڑھنے کو کہتے ہیں۔ پھر یہ لفظ سیڑھی کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ سفرِ اسریٰ، ایک سیڑھی کا خالق اور عبد کی ملاقات کے لیے۔ اور ہماری معراج، عبدیتِ مصطفویﷺ سے رشتۂ طاعت قائم کرنا اور رکھنا ہے۔ ہمارا رب ذی المعارج ہے۔ اُس نے معراجِ کبریٰ سے تو اپنے عبدﷺ کو نوازا اور اُن کے اسوۂ حسنہ اور اعمال کی پیروی کے انعام میں انسان کو بھی معراج یعنی بلندیاں عطا کیں۔ تعلق بالرسول کا انعام یہی معراجِ آدم ہے۔

ابھی تعلق بالرسولﷺ کا ذکر کیا گیا۔ یہ تعلق زمان ومکاں کے تصورات بدل دیتا ہے۔ غیب حضور بن جاتا ہے۔ اپنے دل سے لے کر ہر ذرّہ کے اندرون تک میں مدینہ کے مناظر نظر آنے لگتے ہیں اور جب یہ منزل آتی ہے کہ اپنے مستقبل، اپنی عاقبت کی فکر میں مبتلا اور مصروف مومن کو اپنی منزل کا پتہ چل جاتا ہے

ذرّہ ذرّہ میں ہے مدینہ آثرؔ　　فکرِ منزل بھی کیا کرشمہ ہے

اور جب کوئی مجذوب سالک اِس منزل پر پہنچ جائے تو زندگی کا ہر نفس صدائے لبیک بن جاتا ہے۔ کوئی مقام ہو روح لبیک کی صدا بلند کرتی ہے۔ مدینہ کے جلوے آدمی کو اپنے حصار میں لے لیتے ہیں۔ اِس تحریر کے شروع میں لطیف آثر صاحب کو مجذوب کہا گیا تھا، مگر حق یہ ہے کہ وہ مجذوب سالک ہیں یا سالکِ جذب آشنا

ہو کتابِ زندگی کے ہر ورق پر اُن کا نام　　ہر نفس لبیک کی تکرار ہونا چاہیے

یہی سلوک اور جذب شاعر کو دیارِ دیدہ وری میں لے گیا ہے۔ سب سے معتبر دانش وری، بصیرت اور دیدہ وری خاکِ مدینہ سے آدمی کا ربط اور قُرب کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اقبالؔ نے شہرِ فلسفۂ فرنگ میں اپنی زندگی کا بڑا حصّہ گزار دیا مگر یوں کہ

خیرہ نہ کرسکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ　　سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ ونجف

علی (رضی اللہ عنہٗ) بلاشبہ بابِ مدینۃ العلم ہیں، اور اقبالؔ کا عشقِ رسول حرفِ مُعتبر ہے جس کے بارے میں میرا یقین ہے کہ دفترِ سرکارِ دوعالمؐ میں رقم ہے لیکن دوسرے مصرعے میں مجھے

شرک بالرسالت کی پرچھائیاں نظر آتی ہیں۔لطیف آثر کا کہنا ہے

سُرمہ بنائیں خاکِ مدینہ کو اے آثر　　اتنا تو احترام مدینے کا ہم کریں

اور اِس ارادہ اور جذبہ کی جزا انھوں نے دانش کے طور پر طلب نہیں کی ہے، بات بس احترامِ مدینہ کی ہے اور یہی ہمارے لیے سب کچھ ہے۔

میں اِس وقت زیارتِ حرمین شریفین کے لیے پابہ رکاب ہوں۔طبیعت لکھنے پڑھنے پر آمادہ نہیں، لیکن رسولِ کریم ﷺ اور شہرِ دلبر کا تذکرہ لطیف آثر صاحب نے جس جس طرح کیا ہے اُس نے اِس تحریر کے لیے تحریک پیدا کی اور میں ان شاءاللہ مدینہ منورہ میں اِن احساسات کے عکس کے ساتھ پہنچوں گا

قدم قدم پہ درخشاں ہیں چاہتوں کے چراغ　　مدینہ کیا ہے، حقیقت میں ایک جنت ہے

○

دیارِ مصطفٰیؐ میں گھومتا ہوں　　بھرا دامن نہ میرے ہاتھ خالی

○

آپ کے شہر کا کیا ذکر کروں　　عرش کو دیکھ لیا ہو جیسے

ہماری نصف بہتر نے ایک قیامت بات کہی ہے کہ نعت صنفِ سخن نہیں بلکہ توفیقِ الٰہی ہے۔میں نے بھی جناب لطیف آثر کا مطالعہ اِسی قول کو سامنے رکھ کر کیا ہے۔اللہ تعالیٰ اِس نعتیہ مجموعہ کو حُسنِ قبول عطا کرے اور نبی کریم ﷺ کے حضور اِسے تحفہ اور ہدیہ کا درجہ عطا کیا جائے۔کہیں کہیں عشق آدابِ شریعت پر غالب آگیا ہے۔محمدؐ کے ساتھ ساتھ ربِ محمدؐ کے سامنے بھی ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔

(۱۹۹۴ء)

تلوار کی دھار پر چلنے والا نعت گو

میں جناب پیامؔی مراد آبادی کو بہت دنوں سے جانتا ہوں۔ادب کے سلسلہ میں ذاتی شناسائی یا تعلقات کا میں نے شاید کبھی ذکر نہیں کیا،لیکن نعت کے سلسلے میں یہ بات ایک معنویت رکھتی ہے۔پیامؔی صاحب کے لیے نعت محض شاعری نہیں یہ اُن کی زندگی کی سمت بھی ہے۔اُن کے نزدیک ہر راستہ مدینہ کی طرف جاتا ہے اور ہر راستہ حرمِ مصطفوی سے نکلتا ہے۔

آپ ملاحظہ کریں گے کہ ان کی نعتوں کی سادگی گفتگو کی سرحد سے جاملتی ہے۔اور کئی نعتیں خطابیہ ہیں۔وہ جسمانی طور پر مدینہ منورہ سے دُور سہی لیکن ذہنی اور قلبی طور پر مدینہ منورہ کے شہری ہیں اور اپنی نعتوں میں وہ دست بستہ ،نظریں جھکائے ہوئے مسجد نبوی شریف میں کھڑے نظر آتے ہیں۔

ہیں غرقابِ عِصیاں جو ہم یامحمدؐ
کرم یامحمدؐ ، کرم یامحمدؐ

○

دستِ عاصی میں دامن تمھارا
ہے جو دونوں جہاں کا سہارا

جن نعتوں میں سرورِ کون ومکاں ﷺ سے خطاب نہیں ہے۔ان میں بھی حضوری کی کیفیت اور فضا ہے ’’بعد از خدا‘‘ اُن کا دوسرا نعتیہ مجموعہ ہے۔ثنائے حبیب کے نام سے اُن کا پہلا نعتیہ مجموعہ ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا تھا۔گیارہ سال کی مدّت میں انھوں نے بہت زیادہ نعتیں نہیں کہی ہیں۔میرا خیال ہے کہ جب خیالِ مدینہ اور آقائے دوجہاں کے تصّور سے انھیں فرصت ملتی ہے تو وہ

زبان و بیان کی دنیا میں آجاتے ہیں۔اس مجموعے کا آغاز ایک حمد یہ نعتیہ قصیدے سے ہوتا ہے اس میں ایک مستزاد بھی ہے، متفرق اشعار بھی، لیکن زیادہ تر نعتیں غزل کی ہیئت میں ہیں۔اس کا سبب یہ ہے کہ غزل مجازی محبت کی آئینہ دار ہی نہیں بلکہ عشقِ حقیقی کے بارِ گراں کو بھی نہایت نزاکت کے ساتھ برداشت کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

''بعد از خدا'' میں مختصر بحروں کے ساتھ طویل بحروں میں بھی نعتیں ہیں، اور حق یہ ہے کہ پیامؔی صاحب دونوں پیمانوں کا استعمال اور صَرف جانتے ہیں۔

وہ بیاں جو ختم نہ ہو سکے، وہ بیاں بیانِ رسول ﷺ ہے
جو بلند ہوتی رہے سَدا، وہی شان شانِ رسول ﷺ ہے
یہ جو کائنات میں حُسن ہے، یہ انھیں کا نورِ جمال ہے
ہیں کمال جتنے جہان میں، یہ انھیں کا فیضِ کمال ہے

میرا تجربہ ہے کہ نعت کا شعر ذہنِ شاعر میں اپنی مکمل شکل میں آتا ہے۔یہ کم ہوتا ہے کہ آدمی قافیے سامنے رکھ کر مصرع ثانی کہے اور پھر اُن پر مصرعے لگائے، اسی لیے کہیں کہیں علمِ بیان کے مطابق غلطیاں بھی ہوتی ہیں، لیکن یہ غلطیاں نعت گو شاعر کو عزیز ہوتی ہیں۔اگر یہ بات پڑھنے والوں کی سمجھ میں آجائے تو وہ نعت کے مطالعہ کا رخ سمجھ لیں گے۔نعت تو حُسنِ خیال اور صَفائے قلب کی معراج ہے اور اس راستے کی لغزشیں عجب حُسن رکھتی ہیں۔

نعت گوئی کے بارے میں جناب پیامؔی مُرادآبادی نے اپنے خیالات و نظریات بڑے سلیقہ سے ایک نعت میں نظم کر دیے ہیں۔

نعت میں ، حمد میں ہم کو کیا چاہیے
اللہ اللہ ، صلِّ علیٰ چاہیے
نعت گوئی تو تلوار کی دَھار ہے
احتیاطی گذر ہوش کا چاہیے

دوسرے شعر میں عُرفی کے خیال کو یوں پیش کیا ہے کہ پیامیؔ صاحب کا ذاتی تجربہ بن گیا ہے۔ ''احتیاطی گذر'' کیسا اچھا اظہار ہے۔

اللہ پیامیؔ صاحب کے رُوحانی مراتب کو بلند فرمائے اور وہ ایسی نعتیں کہتے رہیں جو اُن کا روحانی سفرنامہ بن جائیں۔

(''بعد از خدا''، نومبر ۱۹۹۴ء)

اثباتِ حیات

سرکارؐ کی نعتیں سرکارﷺ کی ثنا بھی ہیں۔ان کے حضورؐ بیتے ہوئے لمحوں کی یاد بھی ہیں اور اپنے شب و روز کا حساب بھی ہیں،ان نعتوں کے لفظ کیفیتِ حضوری کی خوشبو کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے پھولوں کی طرح ہیں اور ان کی خوشبو قاری کی طرف منتقل ہوتی ہے۔نعت میں اپنی ذات کا احساس اور میں کا استعمال بظاہر کوئی مستحسن بات نہیں،لیکن اگر آدمی اس مرحلۂ محبت پر پہنچ گیا ہو جہاں اپنی یاد ان کے حوالے سے آئے اور تحدیث نعمت کے طور پر تو یہی احساس ذات حسن ہی نہیں بلکہ کلمۂ اعتراف اور حرفِ سپاس بن جاتا ہے۔اسی مرحلے پر پہنچ کر حسرت موہانی نے کہا تھا۔

ترے عشق میں کیا سے کیا ہو گئے ہم
سیہ کار تھے ، باصفا ہو گئے ہم

اور یہ حرف سپاس آج بھی لبوں پر اور قلم پر اور قرطاس پر اور ذہن میں طاری ہے۔جوئے نورِ مستانہ سفر طے کر رہی ہے اور ہمارے ظاہر کو اور ہمارے باطن کو بدل رہی ہے۔

ہمارے ہاتھوں میں کچھ نہیں تھا مگر درِ مصطفےٰؐ سے اختر
عنایتیں بے حساب لائے ،نوازشیں بے شمار لائے
سمتِ منزل ملی اور زادِ سفر میں اجالے ملے
کشتیِ جان و دل کا کھلا بادباں ان کی دہلیز پر
درِ نبیؐ سے بہت شاد و کامیاب چلے
ہتھیلیوں پہ سجائے ہم آفتاب چلے
درِ سرکارؐ سے ہاتھوں کو میرے

بہاروں کا علم بخشا گیا ہے

میرا خیال ہے کہ سرکار کی کوئی نعت ایسی نہیں جس میں سرکار ﷺ کی عطا کا ذکر اپنی ذات کے حوالے سے نہ کیا گیا ہو۔ یہی وہ وادی ہے جس میں عشق کا قافلۂ سخت جاں طوافِ دیارِ نور کرتا ہے۔ صرف یہیں یہ بات باعث شکر ہے کہ ہمارے کاندھوں پر سر ہے جو ان کے حضور جھکتا ہے، ہمارے چہرے پر آنکھیں ہیں جن میں گنبدِ خضراء کا عکس ان سے رشتہ کا پیامبر بن کر جھلکتا ہے، ہم ہونٹ بھی رکھتے ہیں جن سے اسم محمد ﷺ اظہار مدعا کی صورت ادا ہوتا ہے۔ بصورت دیگر ہمیں سر کاٹنا اور اپنی آنکھوں کی شمعیں بجھا دینا بھی آتا ہے۔ سونکتہ یہ کھلا کہ اثبات حیات صرف سرکارؐ کے وسیلے ہی سے ممکن ہے اور الحمدللہ اختر لکھنوی کی نعتیں احساس ذات اور اثبات حیات کی روداد ہیں۔

(''سرکار ﷺ''، ۱۹۹۵ء)

افسر ماہ پوری کی نعتیہ شاعری

جناب افسر ماہ پوری سے جب ملاقات ہوتی تو بزرگوں کی یاد تازہ ہو جاتی۔ اس جملہ کی تفسیر یہ ہے کہ بدلے ہوئے اور بدلتے ہوئے حالات میں انھوں نے اپنے طرزِ حیات، انداز زیست اور مشرقیت کی حفاظت کی۔ ان کا دل جناب جمیل الدین عالی کی اصطلاح میں ''وضع بزرگاں'' تھا۔ بہار، یوپی اور اس خطہ کے مسلمان خاندانوں کی روایت کا ایک بڑا حصہ متاع مشترک تھا۔ افسر ماہ پوری نے نئے حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے اس متاع عزیز کو عزیز جانا۔ وضع داری، دوست داری، علم و ادب سے شغف اور زندگی میں مذہب کا رچاؤ۔ اس انداز زیست کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ دوسروں کی خوشی اور غم میں شرکت کی جائے، مگر اپنے مسائل کو اپنی ذات تک محدود رکھا جائے۔

جناب افسر ماہ پوری دو، ہجرتوں کے کرب سے گزرے اور یوں کہ تعمیر ذات سے غافل نہیں ہوئے۔ مشرقی پاکستان میں انھوں نے بنگلہ زبان خوب سیکھی اور بنگلہ ادب کے اچھے نمونوں سے اردو کے دامن کو پُر مایہ کیا۔ انگریزی زبان میں بھی وہ اظہار خیال پر قادر تھے۔ مشرقی پاکستان جب مرحوم ہو گیا تو وہ کراچی آئے اور زندگی کی بساط پھر سے یوں بچھائی جیسے کہیں کوئی رخنہ نہ پڑا ہو۔ دن کو دیوار رزق کو چاٹنا اور راتوں کو محفل آرائی اور بزم آفرینی۔ ان کی زندگی کئی محفلوں اور حلقوں سے عبارت تھی۔ انھیں محفلوں میں مجلس احباب ملت تھی جس کے ماہانہ مشاعروں کے لیے انھوں نے پابندی سے حمدیں اور نعتیں لکھیں۔ ان مشاعروں کے لیے جو نعتیں انھوں نے لکھیں وہ اپنی جگہ، لیکن ایسے نعتیہ کلام کی بھی کمی نہیں جو انھوں نے ہنگامہائے حیات کو سہل بنانے کے لیے لکھے۔ نعت فرد کا نغمۂ تنہائی اور استغاثۂ شخصی بھی ہے اور ایک مسلم معاشرہ میں ایک اجتماعی سرگرمی اور تقریبوں کی بنیاد اور اساس بھی ہے۔

افسر ماہ پوری صاحب کی نعت گوئی کا علم تو ان کے دوستوں اور ادبی حلقوں کو تھا، لیکن بہت سے لوگوں کو ان کے نعتیہ مجموعے پر حیرت ہوگی۔ ان کے لائق صاحب زادے ڈاکٹر حامد ظہیر لائق مبارک باد ہیں کہ وہ اپنے والد مکرم کی غیر مطبوعہ کتابوں کی اشاعت کا آغاز اس نعتیہ مجموعے سے کر رہے ہیں۔

نعتیہ شاعری کے لیے شعرا نے اصناف کا انتخاب اپنے ذوق اور مزاج کے مطابق کیا ہے۔ افسر ماہ پوری مرحوم نظم اور غزل دونوں کے آدمی تھے اور جب ہم ''نظم'' کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو اس میں کئی اصناف آجاتی ہیں۔ مسدس، ترکیب بند، مثنوی، نظم آزاد وغیرہ۔ افسر صاحب کی شاعری میں کئی اصناف کا جلوہ نظر آتا ہے، مگر ان کی نعتیہ شاعری بڑی حد تک غزل کے پیکر میں لکھی گئی ہے۔ اس کے کئی اسباب ہیں۔ غزل کی مقبولیت، شاید اسی لیے ہماری نعتیہ شاعری کا بڑا حصہ ''غزل'' پر مشتمل ہے اور پھر مجلس احباب ملت کے طرحی مشاعرے۔

جناب افسر ماہ پوری کی نعتوں میں کتنے ہی رنگ مل کر ایک ہوگئے ہیں۔ عصری تقاضے، ملت اسلامیہ کے مسائل اور اس کا حادثات کا ہدف بننا شعور و آگاہی کے اس دور میں رفعت محمدیؐ کے کتنے ہی پہلو ابھرے ہیں اور افسر صاحب نے ان کی طرح اشارے کیے ہیں، لیکن اس کی شاعری کا سب سے نمایاں پہلو سرور کائنات ﷺ سے ان کا ذاتی تعلق اور اس کا اظہار ہے۔ ان کے ایسے اشعار میں پڑھنے والوں کو اپنے نقطۂ نظر اپنے جذبات اور اپنے رسولؐ کے ساتھ اپنے رشتے کا اظہار نظر آتا ہے۔ یوں ان کی نعت گوئی ہمارا تجربہ بن جاتی ہے۔

نعت کے لیے عشقیہ اسلوب اختیار کرنا اور غزل کی زبان علامات کو استعمال کرنا ایک بہت نازک بات ہے۔ ذرا سی بے احتیاطی، گستاخی میں بدل سکتی ہے اور نعت کا شعر غزل کا روایتی شعر بن سکتا ہے جناب افسر ماہ پوری اس مرحلہ نازک سے بہت کامیابی کے ساتھ گزر گئے ہیں۔

ان چند معروضات کے بعد میں شاعر مرحوم کی نعتوں سے چند مثالیں آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ یہاں پر عرض کرنا مناسب ہوگا کہ ان مثالوں کے انتخاب میں کسی کاوش سے کام نہیں

لیا گیا ہے اس لیے یہ مثالیں ان کی مجموعہ نعتیہ شاعری کی بھی ترجمانی کرتی ہیں۔

جناب افسر ماہ پوری کے تصور نعت کو اس شعر کی مدد سے سمجھا جا سکتا ہے۔

سلیقہ چاہیے مدح نبیؐ کا
کہ اک پہلو ہے یہ بھی بندگی کا

سلیقہ زندگی اور محبت کی پہلی شرط ہے۔ پھر دیکھیے کہ اللہ اور رسول کے رشتہ کی کیسی واضح تصویر اس شعر میں ملتی ہے۔ رسولؐ مومنوں پر اللہ کا سب سے بڑا احسان ہے۔۔ اس کے سوا کسی اور احسان کا قرآن حکیم میں تذکرہ نہیں ملتا۔ یوں نعت گوئی، دراصل بندگی کا پہلو بھی ہے اور اظہار بھی۔ مومن اللہ کا شکر ادا کرتا ہے کہ اس نے نبی کریم ﷺ کی صورت میں ہمیں سلیقۂ زیست اور زندگی کرنے کا سہارا عطا کر دیا۔

جناب افسر ماہ پوری کے ہاں مدینہ کی فضاؤں، آسمان، نسیم جاں بخش کا تذکرہ بار بار ملتا ہے۔ اسی طرح رسول اکرمؐ ان کے لیے نور ہیں، رنگ و نکہت ہیں، سائبان ہیں اور پناہ گاہ ہیں۔ شعر دیکھیے:

کیا چیز ہے نسیم مدینہ کی تازگی
تشنہ لبوں کے واسطے یہ سلسبیل ہے

پانی اور ہوا کے درمیان انھوں نے کیسی مطابقت تلاش کی ہے۔ کبھی حبس کے عالم میں ٹھنڈی ہوا کا کوئی جھونکا اچانک آپ کے چہرہ کو چھوتا ہوا گزرے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ پانی نے تشنگی کو رفع کر دیا۔ یہ تلازمہ خیال، حقیقت اور تخیل کا عجب امتزاج ہے۔

جناب افسر ماہ پوری کا نعتیہ مجموعہ دراصل حضور اکرم ﷺ کے اذکار و بیان کی محفل ہے جس میں وہی حاصل حیات و کائنات معلوم ہوتے ہیں اور اس محفل میں بیٹھے ہوئے زندگی کے ہر سود و زیاں سے بلند ہو جاتے ہیں۔

اے خوشا آپ کے اذکار و بیاں کی محفل
پھر کہاں یاد ہمیں سود و زیاں کی محفل

اللہ تعالیٰ نے ہمارے شاعر خوش بیاں کو جوارِ رحمتہ للعالمین میں جگہ دے کہ اس کی بدولت ہمیں اس محفل جاوداں میں چند ساعتیں نصیب ہو جاتی ہیں۔

(''طور سے حرا تک''، ۱۹۹۶ء)

اجملؐ و اکملؐ

محسن احسان کی نعتیہ شاعر پوری ذات کی شاعری ہے۔ قرآن حکیم نے دین کے بارے میں کہا ہے کہ: ''اے اہل ایمان! اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ۔'' یہی بات دینی شاعری کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہے۔ جب تک شاعر کا ذہن، اس کی فکر، اس کا جذبہ اور اس کا فن۔ سب ہم ردیف نہ بن جائیں، دینی خیالات شعر نہیں بن پاتے۔

محسن احسان نے غزل میں اپنا نقش قائم کر لیا اور پھر اپنی تمام فنی صلاحیتوں اور کرداری محاسن کے ساتھ وہ درگاہ خیر البشر صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہوئے اور یوں کہ ان کی ذات میں خوابیدہ شرر، شعلۂ رقصاں بن گیا۔ شعلۂ ذات اور شعلۂ فکر جس کی روشنی ان کی ذات کے ساتھ ساتھ ان کے ماحول اور حمد کو روشن کر رہی ہے۔

محسن احسان کے اس مختصر سے نعتیہ مجموعے میں نظمیں بھی ہیں مگر انھوں نے غزل کے پیکر کو حرفِ نعت کا اجالا عطا کیا ہے۔ شعر اپنی بہترین تنقید آپ ہے۔

بشر کو آپؐ نے ادراکِ بندگی بخشا
جہاں میں ورنہ تصورہی کچھ خدا کا نہ تھا
ہے انؐ کا نام لرزتے لبوں کی زیبائش
وگرنہ اور حوالہ کوئی دعا کا نہ تھا
میں کیسے وصفِ پیغمبرؐ میں لب کشا ہوتا
کہ یہ مقام مرے حرفِ نارسا کا نہ تھا

محسن احسان کو مبارک ہو کہ ان کے حرفِ نارسا کے ماتھے پر خاک درِ نبیؐ قائم رہے

والانشان بن گئی ہے۔

کاش اس مجموعے میں ''یثرب'' کے لفظ کی اتنی تکرار نہ ہوتی۔ ویسے بھی طیبہ اور یثرب کے لفظ کو تاجدارِ مدینہ نے پسند نہیں فرمایا، اسی لیے اقبال اور ظفر علی خان کے ہاں اس لفظ کا استعمال سند نہیں بن سکتا۔

(ماہنامہ ''رابطہ''، جولائی ۱۹۹۷ء)

نعت میری زندگی

جناب طاہر سلطانی ایک مخلص اور دیانت داری آدمی ہیں، ایسے آدمی کے ہر عمل میں خلوص اور دیانت کا رنگ ضرور نظر آتا ہے۔

طاہر سلطانی صاحب نے اپنے آپ کو حمد و نعت کے فروغ کے لیے وقف کر کے اپنے لیے ایک آبرومندانہ حیثیت حاصل کرلی ہے۔ ان کے حالیہ نعتیہ مجموعہ کا نام ہے "نعت میری زندگی"...... خدا کرے یہ نام ان کی زندگی اور فکر کا عنوان بن جائے۔

طاہر سلطانی اس نکتے سے خوب واقف ہیں کہ ہر عظمت سرورِ کائنات ﷺ کی خاکِ اقدس کو اپنی پلکوں سے صاف کرنے اور اسے اپنے وجود کا حصہ بنا لینے سے عبارت ہے۔ طاہر سلطانی نے اس شعر میں اس نکتہ کی وضاحت بھی کی ہے:

مجھ پہ جب سرکار ﷺ کی مدحت کے دروازے کُھلے
سلسلہ در سلسلہ عظمت کے دروازے کُھلے

میں اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ عظمت کے دروازے ان پر کُھلتے جائیں۔

(۱۹۹۷ء)

نعت کی دنیا کا شہری

جناب عبدالغفور قمر کی خوش بختی اور سعادت میں کون شک کر سکتا ہے؟ اُن کے شب و روز نعت کے مطالعے میں گزر رہے ہیں۔ نعت پڑھتے ہوئے سرکارِ ختمی مرتبت ﷺ کی جاوداں سیرت کی تصویریں ہماری نظر سے گزرتی ہیں، ہمارا ذہن اُن کے مرتبے اور شخصیت کے مختلف پہلوؤں کی تکمیل اور جامعیت کے متعلق سوچتا ہے، ہمارا دل اُس کے نام پر دھڑکتا ہے جو اِس کائنات کی وجہ تخلیق ہے۔ مجھے یقین ہے کہ نعت کے مسلسل مطالعے نے جنابِ قمر کو ''خلق مصطفوی (الف الف سلام علیٰ صاحبہا) سے بہت قریب کر دیا ہوگا اور اُن کے آنسوؤں میں گنبدِ خضریٰ چمکتا اور دمکتا ہوگا۔

ہمارا یہ دور نعت گوئی کے ساتھ ساتھ انتخابِ نعت کا دور بھی ہے۔ شفیق بریلوی مرحوم ،ڈاکٹر آفتاب نقوی مرحوم، جنابِ حفیظ تائب، راجہ رشید محمود، صبیح رحمانی سلمہٗ اور کئی دوسرے صاحبان نے نعت کے اچھے انتخابات مرتب کیے ہیں۔ نور احمد میرٹھی صاحب نے غیر مسلم شعرا کی نعت گوئی کے انتخاب کو نئی وسعت عطا کی ہے، لیکن جناب عبدالغفور قمر صاحب نے انتخاب کو اپنی ذات کے اظہار کا وسیلہ بنالیا ہے۔ اب تک انتخابِ نعت کی چار ضخیم جلدیں شائع ہو چکی ہیں اور ان شاء اللہ یہ سلسلہ جاری رہے گا کیونکہ نعت اُن کے لیے وَرَفَعۡنَا لَکَ ذِکۡرَکَ کی شکل ہے۔ وہ رفعِ ذکر کے عمل میں مسلسل مصروف ہیں۔

میں اِس سے پہلے اپنے تبصرے میں یہ عرض کر چکا ہوں کہ قمر صاحب نے ہر نعت گو شاعر کے لیے ایک یا دو نعتوں کی کوئی شرط عائد نہیں کی ہے۔ جس شاعر کی جتنی نعتیں اور شعر پسند آتے ہیں وہ اپنے انتخاب میں شامل کر لیتے ہیں، اِس طرح ہمیں اپنے ممتاز شاعروں کی نعت گوئی کے بارے میں صحیح رائے قائم کرنے کا موقع حاصل ہو جاتا ہے۔ ''انتخابِ نعت'' ماضی کی نعتیہ روایات کا سفینہ

بھی ہے اور آج کی نعت کا اشاریہ بھی۔

قرآنِ حکیم کا ارشاد ہے کہ ہم تمھیں وہاں سے رزق عطا کرتے ہیں جس کے بارے میں تم سوچ بھی نہیں سکتے۔ جنابِ قمر کا رزق نعت ہے، اور اللہ تعالیٰ کے کرم سے نعتیہ مجموعے اُن تک فراوانی کے ساتھ پہنچتے رہتے ہیں اور ایسے حلقوں اور ذریعوں سے جن کے بارے میں انھوں نے سوچا بھی نہ ہوگا۔

وہ اسی بیاسی سال کی عمر میں بھی جوان ہیں اور جوانوں کے عزم اور حوصلے سے اپنے کام میں مصروف ہیں۔ یہ عشقِ رسول عربی کا ثبوت بھی ہے اور اُن کی مُنظّم اور زندگی کا اشاریہ بھی۔

خدا کرے اُن کا یہ سفر جاری رہے۔ اِس دنیا میں اللہ کا کرم اُن کی ذات اور قلم پر سایہ فگن رہے اور اُس دنیا میں انھیں قربتِ رسولِ مدنیؐ حاصل ہو۔ مجھے اپنی اِس دعا کی قبولیت کا یقین ہے۔

(۱۹۹۷ء)

جوئے نور کی ایک موج

اردو زبان کو کبھی ہندی، کبھی ہندوی اور کبھی ریختہ کہا گیا۔ ہر علاقے نے اسے اپنی زبان کہا اور ہر علاقے میں اس کی مخالفت بھی کی گئی، خاص طور پر اس کی مخالفت کی مسلسل تحریک ہندوؤں نے ۱۸۶۷ء میں شروع کی۔ مگر یہ زبان نت نئے علاقے تسخیر کرتی رہی اور آج ہندوستان پاکستان، بنگلہ دیش، عرب امارت، سعودی عرب، ماریشس کے علاوہ امریکہ، برطانیہ اور جنوبی افریقہ وغیرہ میں اس کے بولنے والوں کے علاقے ہیں۔ اسے دیارِ غرب اور امریکہ میں بھی برِعظیم جنوبی ایشیا سے نقلِ مکانی کرنے والوں کے رابطہ اور اظہار کے ذریعے کا درجہ حاصل ہے۔

اس صورتِ حال کے کئی اسباب ہیں۔ اردو کی لسانی لچک اور امکانات ایک بڑا اور بنیادی سبب سمجھا جاتا ہے مگر راقم الحروف کے نزدیک اردو کو یہ حیثیت اسلام کے حقائق کے بیان اور ثنائے محمد عربی ﷺ نے عطا کی ہے۔ ویسے تو زبانوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا مگر اس سے کون انکار کرے گا کہ عربی، فارسی اور اسلام کی زبانیں ہیں۔ آج تو یہ بات بڑے اعتماد اور یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ اردو کے دامن میں دین کا جو علمی سرمایہ اور خزینہ ہے۔ اس کی بنا پر وہ عربی کے بعد سب سے ''سرمایہ دار'' اور مالامال زبان ہے اور جہاں تک شعروسخن کا سوال ہے اردو اپنے امتیازات پر فخر کرسکتی ہے۔ اردو کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ بیسویں صدی میں حمد و نعت کا جیسا سرمایہ اردو میں سامنے آیا ہے، اس میں کوئی دوسری زبان اس کی مدمقابل نہیں۔ ہمارا یہ عہد تو نعت کا عہد زریں ہے۔ نعت کی کہکشاں اردو شاعری کے آسمان پر جگمگا رہی ہے اور اللہ اور اس کے رسول کی مدح کی جوئے نور ہماری زبان کی وادیوں سے مستانہ وار گزر رہی ہے۔

جناب صوفی جاوید اقبال معصومی کا نعتیہ مجموعہ ''محبوب ﷺ'' بھی اس جوئے نور کی ایک

موج ہے۔روشنی کا ایک دھارا ہے۔جس میں ہمارے رسولؐ ہمارے آرام جاں ہادیٔ کون ومکاں کے ذکر کی روشنیاں ہیں۔

بلوچستان براہوی، بلوچی اور پشتو زبانوں کی خوبصورت سرزمین ہے لیکن مدتوں سے بلوچستان کے غیور اور محبت کرنے والے اہل قلم اردو کو بھی اپنا ذریعۂ اظہار بنائے ہوئے ہیں۔اردو کو اسلامی افکار وخیالات کی ترجمانی اور ذکر محمد عربی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کی ثقافتی اور تہذیبی زبان بنادیا ہے۔

بلوچستان میں اردو کے اس فروغ میں بعض اداروں اور افراد کی منظم کوششوں کا دخل بھی ہے۔قلم قبیلہ اور انجمن دبستان بولان نے بلوچستان میں اردو شعروادب کی روایات کو استحکام بخشا ہے۔افراد میں بہت اہم اور نمایاں نام استاد رشید انجم کا ہے۔جنھوں نے بلوچستان کے بہت سے شعرا کی فنی تربیت میں حصہ لیا ہے۔

جناب صوفی جاوید اقبال معصومی بھی ان کے حلقہ کے ایک شاعر ہیں۔استاد رشید انجم اپنے شاگردوں کی انفرادیت کا احترام کرتے ہیں اور ان کی اصلاح کے دائرے کو اس قدر نہیں بڑھاتے کہ شاگرد کا شعراس کا نہ رہے۔

اس مجموعہ (ﷺ) میں فنی طور پر کمزور شعر بھی ہیں زبان وبیان کی غلطیاں بھی ہیں لیکن شاعر کی محبت اتنی سچی اور کھری ہے کہ نبی ﷺ کے وابستگان کی نظر میں صوفی صاحب کی محبت ہی معتبر ٹھہرتی ہے۔صوفی صاحب کی شاعری دماغ کی شاعری نہیں بلکہ دل کی شاعری ہے۔انھوں نے رسول کائنات ﷺ کی ذات گرامی سے اپنے رشتہ کو سیدھے سادے انداز میں پیش کردیا ہے۔یہی رشتہ اور نبی اکرم ﷺ سے یہی وابستگی ان کا اور ان کی زندگی کا اعتبار ہے۔ایسے نعتیہ اشعار میں ''میں'' صرف ایک فرد نہیں' یہ محض جناب صوفی جاوید اقبال نہیں بلکہ اس ''میں'' کے پردے فرد میں حضور ﷺ کا ہر امتی اپنے آپ کو دیکھتا ہے۔چند اشعار ملاحظہ ہوں:

درودِ لب ذکرِ نبیؐ رخ ہے مدینے کی طرف
رنگ لاتا ہے عجب وابستگی کا اعتبار

○

آئی جب طیبہ سے ان کے نقش پا کی روشنی
دل کے ہر گوشے میں اتری مصطفیٰؐ کی روشنی

○

خزاں شامل نہیں ہوتی مدینہ کی بہاروں میں
کہ جنت کے نظارے ہیں وہاں کے سب نظاروں میں

○

سلامت ساحلِ امید تک للہ پہنچادو
ڈراتی ہے مجھے ہر موج طوفاں یا رسول اللہ

○

یہ آقا کی عنایت ہے کہ مجھ کو
شناسا کر دیا ہے بندگی سے

صوفی صاحب کے نعتیہ کلام میں فریاد کی لے بھی ہے اور سرخوشی کے نغمے بھی۔ وجہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کی ذات ان کے لیے امید کا سرچشمہ بھی ہے اور ہر خوشی کا منبع بھی۔ وہ مقامِ نبوت سے آگاہی رکھتے ہیں اور انھیں معلوم ہے کہ انبیائے کرام علیہم السلام در بالخصوص سرورِ کائنات ﷺ اس کائنات میں انسانوں کا رشتہ، اللہ تعالیٰ سے جوڑنے اور قائم کرنے کے لیے آئے۔

جناب صوفی جاوید اقبال معصومی کے بہت سے نعتیہ اشعار میں ہمیں اپنی آواز سنائی دیتی ہے اور اپنی تمنائیں نظر آتی ہیں۔ یہ بڑی بات ہے۔ اللہ سرورِ عالم ﷺ سے ان کے رشتہ کو مضبوط تر فرمائے۔

(''محبوب ﷺ''، ۱۹۹۷ء)

شوکت عابد

غزل کے پیکر کو نعت گوئی کے لیے استعمال کرنے والے شعرا پر تحدید اور تنگ دامانی کا الزام لگانے والے نقادوں کے بیشتر ممدوح شعرا غزل گو شاعر ہی ہیں۔ کیا یہ ایک تضاد نہیں؟

فراق صاحب نے غزل کے بارے میں اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ یہ حیات و کائنات کا ایسا آئینہ ہے جو مختصر ہونے کے ساتھ ساتھ ہمہ گیر اور کُل شناس ہے۔

شوکت عابد کی نعتیں پڑھتے ہوئے یوں محسوس ہوا کہ ان کے ہاتھوں میں کتنے ہی آئینے ہیں اور ہر آئینے میں اسم محمد ﷺ بھی ہے اور صفات محمدی ﷺ بھی۔ یہی غزل کے فارم کا کمال ہے۔

روایتی ہیئت میں اپنے شخصی جذبہ کی نمود — اس پر شوکت عابد کو ناز کرنے سے زیادہ اپنے رب کا شکر ادا کرنا چاہیے — شوکت عابد زمینوں کے انتخاب اور تکرار ردیف کے ہنر سے بھی آگاہ ہیں اور اس نکتے سے بھی واقف ہیں کہ شاعر دوسروں سے پہلے، اپنے ساتھ کلام کرتا ہے۔

جب بھی نعت کا مصرعہ لکھ
پہلے نام خدا کا لکھ
چوم کے روضۂ انور لکھ
مدحت ساقیِ کوثر لکھ

شوکت عابد کی غزلیہ نعتیں یہ احساس دلاتی ہیں کہ ثنائے محمد ﷺ کا یہ سوتا، ان کی ذات کی گہرائیوں سے، ابھر کر اور رِس رِس کر وادیٔ قرطاس تک آیا ہے۔ ان کے نعتیہ قطعات میں بات کے مکمل ہونے کا عجب احساس ملتا ہے اور یہی قطعہ نگاری کا ہنر ہے۔

(''نعت رنگ''، ستمبر ۱۹۹۸ء)

یعقوب لطیف

نعت رنگ کے صفحات پر آہنگ نو اور طرح نو کا ذکر کئی بار مختلف پہلوؤں سے کیا جا چکا ہے۔ حق تو یہ ہے کہ نیا آہنگ اور حقیقی جدّت، اپنے ادبی سرمایہ سے آگاہی، مشاہدے کی ''انفرادیت''، ''ذاتی تفکر''، اپنے لہجے میں اپنی بات کی ادائی کی صلاحیت سے پیدا ہوتی ہے۔

یعقوب لطیف نے اردو شاعری کا جس گہرائی اور سنجیدگی سے مطالعہ کیا ہے اس کی مثال ملے گی مگر مشکل سے اور سرورِ کائنات میں وہ اپنی محبت میں امت مسلمہ کے ایک فرد ہیں۔ نہ اس سے کم نہ زیادہ۔

وہ شعر فکر اور تامل سے کہتے ہیں۔ ان کے ہاں فکر اور جذبہ کی ہم آہنگی ہے مگر وہ سطحی جذباتیت سے دامن کشاں رہتے ہیں۔ ان کا اسلوبِ شعر ن م راشد اور عزیز حامد مدنی کا تسلسل ہے اور اس روایت کی توسیع بھی۔

ارتقا انسان کی کہانی ہے۔ وہ انسان جو اپنے ارتقا سے تھک کر نسیم سے التجا کرتا ہے کہ اگر بطحا جانا تو

ز احوالم محمدؐ را خبر کُن

''خلاباز'' اور ''بوریانشین'' ایک فکری نظم، مکالمہ یا ڈراما ہے جو خلا سے آگے گزر کر لامکاں کی خبر دیتا ہے۔ شاید یہ نظم امیر خسرو کے اس شعر کی ڈرامائی شکل ہے۔

خدا خود میر محفل بود اندر لامکاں خسرو
محمدؐ شمع محفل بود شب جائے کہ من بودم

ہمارا خیال ہے کہ یعقوب لطیف صاحب کو اپنے اس خیال کو مزید وسعت کے ساتھ پیش

کرنا چاہیے۔ خدا کرے ان کا سفر جاری رہے۔

خسرو سے یعقوب لطیف کے رشتے کی شہادت ''زحال مسکیں'' سے بھی ملتی ہے۔ خالص تغزّل کو انھوں نے ایک اُمتی کے عرض تمنا کے سانچے میں ڈھال لیا۔

(''نعت رنگ''، ستمبر ۱۹۹۸ء)

والی آسی

والی آسی، مولانا عبدالباری آسی کے صاحب زادے ہیں، اوران کی علمی اورادبی روایات کے امین۔

شعر بہت سجا کے کہتے ہیں۔ یہ آرائش جوان کی غزلوں میں کہیں کہیں تکلّف کے درجہ تک پہنچ جاتی ہے جب ایوان نعت رسول عربی کے کام آتی ہے تواپنی خوش بختی پر ناز کرتی ہےاوران کے قارئین پر یہ نکتہ وا ہوتا ہے کہ لمحے کے ٹھہراو، ایک ہی مصرع میں معنوی ولغوی وقف نے ان کی شعری آواز کی تعمیر میں کیسا حصّہ لیا ہے۔

والی آسی آج کے تاریک عہد (رات) میں اسم محمد (ﷺ) کے چراغ سے اپنی راہوں کو ہی روشن نہیں کررہے ہیں بلکہ تاریکیوں اوراندھیروں سے نبردآزما ہیں۔ یہی نعت گوئی کا حقیقی منصب اور مفہوم ہے۔

والی آسی نے شاعرانہ تخیل، تاریخی شعوراور محبت کو ملاکر حیات نبوی اور عہد نبوی کے بعض واقعات اورلمحات کوشعر بنادیا ہے۔

(''نعت رنگ''، ستمبر ۱۹۹۸ء)

صلِّ علیٰ نبیّنا کی صدائے باز گشت

آج کا انسان بالخصوص ہمارا شاعر، اس عہد میں جب ہم اپنی شناخت کھو رہے ہیں، اپنے آپ سے دور ہوتے جا رہے ہیں اور اپنی تہذیبی اقدار سے بے تعلق اور لاتعلق ہو رہے ہیں، اپنی تلاش میں دیارِ مصطفیٰ علیہ السلام تک پہنچ گیا ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت اور اظہار ہے کہ وہی ذاتِ گرامی ہماری پہچان اور شناخت ہے۔

ہمارا عہد ادبی طور پر نعت کا عہد ہے۔ گزشتہ چند برس سے شاخِ حمد پر بھی فکر وفن کے پھول کھل رہے ہیں اور یہ بات نہایت منطقی ہے۔ نبی کریم علیہ السلام اس زمین پر اللہ کی حجت، اور بُرہان میں اُن کی سیرت اور اُن کا قول وجودِ خداوندی کی دلیل ہے۔

جناب انصار الحق قریشی (گہرؔ اعظمی) کا مجموعہ ''ربّ العالمین ورحمۃ للعالمین'' حمد و ثنائے محمد علیہ السلام کی یکجائی کا اُفق ہے۔ اس اُفق پر گہرؔ اعظمی صاحب کے فکر اور تخیل کی کرنوں کی تابنا کی پڑھنے والوں کی نشاط بھی عطا کرتی ہے اور روشنی بھی بخشتی ہے۔

گزشتہ برسوں میں ایسے حمدیہ اور نعتیہ مجموعے شائع ہوئے ہیں جن میں اسماء الحسنیٰ اور سرکارِ دو عالم علیہ السلام کے اسمائے گرامی کو ردیف بنایا گیا ہے۔ اس سلسلے میں لطیف اثر صاحب کا نام خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے، لیکن جناب گہرؔ اعظمی صاحب نے اپنا راستہ خود تراشا ہے۔ انھوں نے اسما الحسنیٰ اور اسمائے ختم المرسلین کو ردیف بنانے کی جگہ انھیں اپنے اشعار میں اس طرح سمویا ہے کہ وہ اُن کے تخیل اور فن کا حصّہ بن گئے ہیں۔ یہ مشکل کام تھا۔

اسما الحسنیٰ کی برکت سے کون انکار کرے گا، لیکن انھیں اپنے تخیل اور فن کا حصّہ بنانا خونِ جگر کا تقاضا کرتا ہے۔ گہرؔ صاحب کے اس مجموعے میں پہلی حمد میں مناجات اور دعا بھی آگئی ہے۔ دعا جو عبادت کا مغز ہے اور انھوں نے دعا بھی نہایت جامع چُنی ہے۔

ربنا اغفرلنا ربنا اغفرلنا

گہرؔ صاحب نے محض اسماالحسنیٰ ہی جمع نہیں کر دیے ہیں۔ اگرچہ یہ بھی ایک قابلِ قدر کوشش ہوتی۔ اُن کے شاعرانہ تخیل اور فکر و تدبّر نے بعض اسماالحسنیٰ کے سلسلے میں نئے مفاہیم بھی پیش کر دیے ہیں۔ حروفِ مقطعات کا مفہوم بھی ہمارے لیے ایک اعتبار سے غیب کا درجہ رکھتا ہے۔ یہ شعر ملاحظہ ہو:

عالم الغیب ہے، جانتا ہے تو ہی　　　معنیٰ حام میم و الف لام میم

گہرؔ صاحب نے اللہ کی حمد اور ذکر کا رشتہ مومنوں کی صفات سے بھی جوڑا ہے۔ وہ جو ہماری شہ رگ سے بھی قریب تر ہے، مومنوں کا ولی اور دوست ہے۔ مومن کی زندگی صدق سے عبارت ہوتی ہے۔ کیونکہ مومن جانتا ہے کہ صدق میں نجات اور جھوٹ میں ہلاکت ہے۔ اسی طرح مومن انفاق کے ذریعے اپنی ذات کی تعمیر کرتا ہے، وہ یک سُو ہو کر اللہ سے رجوع کرتا ہے۔ صبر اُس کا ہتھیار ہے، تقویٰ اُس کی ڈھال ہے اور اجتماعیت اُس کی پہچان ہے۔ مومن کی صفات کو گہرؔ صاحب نے کس خوبی سے جمع کر دیا ہے۔

اللّٰہ یحب المحسنین　　　اللّٰہ یحب الصدقین

اللّٰہ یحب المتقین　　　اللّٰہ یحب القنتین

اللّٰہ یحب الصابرین　　　اللّٰہ یحب الصالحین

اللّٰہ یحب المتقین　　　اللّٰہ یحب المومنین

اللّٰہ یحب الراکعین　　　اللّٰہ یحب الساجدین

اللّٰہ یحب العالمین　　　اللّٰہ رب العالمین

گہرؔ صاحب کے کلام میں عربیت کا پہلو نمایاں ہے، مگر یہ عربیت اُن پڑھنے والوں کے لیے لغتِ غریب نہیں بنے گی، جو کتابِ الٰہی سے رشتہ رکھتے ہیں۔

کتاب اللہ سے گہرؔ صاحب کا یہ گہرا تعلق نعت کے سلسلے میں بھی نظر آتا ہے۔ نعت

بر اسماء النبی ﷺ میں تو اُنھوں نے سرورِ کونین ﷺ کے صفاتی نام جمع کر دیے ہیں لیکن اس خاصی طویل نظم کے اختتامی حصے میں انھوں نے اپنے جذبات کا اظہار بڑے سلیقے سے کیا ہے۔ یہی سلیقہ، یہی ادب نعت کی اساس ہے کیونکہ درگاہِ نبی ﷺ میں جنید وبایزید بھی نفس گم کردہ حاضری دیتے ہیں۔ یہاں تو اہلِ ایمان اپنی سانسوں اور الفاظِ زیرِلب کے آہنگ کا بھی یہی لحاظ رکھتے ہیں۔ اس نظم کے آخری بند کو پڑھتے ہوئے قاری کے وجود پر ''صلِ علیٰ نبینا'' کی صدائے بازگشت چھا جاتی ہے۔ ''صلِ علیٰ نبینا'' کا نغمہ چودہ صدیوں سے زمین سے آسمان تک گونج رہا ہے اور یہی بازگشت تخلیقِ کائنات کا حاصل اور مدّعا معلوم ہوتی ہے۔

نبی آخرالزّماں ﷺ کی نعت ان الفاظ کی مدد کے بغیر نہیں لکھی جا سکتی جو قیامت تک ہمارے لبوں سے ادا ہوں گے۔ منبر و محراب کی زینت بنے رہیں گے اور جن کی حفاظت کی ذمے داری خالقِ کائنات نے خود اپنے ذمے لی ہے۔ قرآنِ عظیم کتابِ ہدایت اور نسخۂ کیمیا ہونے کے ساتھ ساتھ ذکرِ محمدِ عربی بھی ہے۔ وَرَفَعنَا لَکَ ذِکرَکَ اور اِنَّآ اَعطَینٰکَ الکَوثَر

اس حمدیہ و نعتیہ مجموعہ کا ایک علمی پہلو بھی ہے۔ اس میں حواشی اور ضمیمے بھی موجود ہیں جو قاری کے لیے اس شاعرانہ خزینہ کو زیادہ مفید بنا دیتے ہیں۔

مدتوں کے بعد ایک ایسا مجموعہ نظر سے گزرا ہے جو عقل اور دل دونوں کو سیراب کرتا ہے اور اس بات پر ہمارے یقین کو پختہ تر کر دیتا ہے کہ علم کے بغیر نہ اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہوتی ہے نہ مرتبۂ محمدِ عربی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی آگاہی مل سکتی ہے اور نہ ربّ العالمین، رسولِ ربّ العالمین اور عالمین کا رشتہ سمجھ آ سکتا ہے۔

مجھے اس بات نے بھی متاثر کیا ہے کہ شاعر نے اپنے استاد پروفیسر سید اقبال عظیم اور اپنے دوست و رفیق آفتاب عظیم کا ذکر بڑی محبت سے کیا ہے، یہ بھی سنّتِ رسول کریم ﷺ ہے۔ ہمارے آقا ﷺ کا ارشاد ہے ''من لایشکر الناس لایشکر الله'' اللہ تعالیٰ اس مجموعے کے ذریعے پڑھنے والوں کے دلوں میں حُبِّ رسول کریم ﷺ کی روشنی اور خوشبو میں اضافہ کرے۔

(''ربّ العالمین و رحمت للعالمین''، اپریل ۱۹۹۹ء)

صحن مسجد نبوی کی ایک تحریر

گنبد خضریٰ کو دیکھ رہا تھا بلکہ یوں کہوں کہ گنبد خضریٰ کو مرکز تناظر بنا کر افق اور فضائے بسیط کو دیکھ رہا تھا اور یہ غور کر رہا تھا کہ یہ گنبد افق کی کیمیا اور وجود کو کیسے بدل رہا ہے کہ اچانک نعت رنگ کا ایک ٹائٹل ذہن کی اسکرین پر روشن ہو گیا اور تخلیق اپنے خالق کی یاد دلاتی ہے اور اس وقت تو صبیح رحمانی میرے ساتھ مسجد نبوی کے صحن میں موجود ہیں۔

یہ بارگاہ محبت بھی عجیب ہے۔ اس سے پہلے تو صبیح میرے ساتھ نہ ہوتے ہوئے بھی ہمیشہ اس جگہ میرے ساتھ ہی رہا ہے۔ اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں رہا ہے۔ نبی اکرم ﷺ آج چودہ صدیوں کے فاصلے پر اہل ایمان کے درمیان محبت اور مودّت کے پل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مدینہ میں کتنے چہرے کسی دوست کی یاد دلاتے ہیں۔ یاد آیا ایک بار حرمین آنے سے پہلے عزیز حامد مدنی کو دیکھنے پیر کالونی گیا تھا وہ بہت بیمار تھے۔ میں نے نہ جانے کیوں ان کو تسلی دیتے ہوئے کہا آپ زیارت حرمین سے پہلے اس دنیا سے نہیں جائیں گے اور صفہ پر میں نے اپنے سے آگے تیسری صف کو مدنی صاحب کو بیٹھے دیکھا میرے دل نے کہا کہ مدنی صاحب مدینہ آ گئے اور اب اپنے آخری سفر پر رخصت ہونے والے ہیں یا رخصت ہو چکے ہیں۔

میرے اور صبیح کے رشتہ کی بنیاد ہی مدینہ، مدینہ والا (ﷺ) اور رب محمد ہیں۔ اس رشتہ میں کوئی ملاوٹ نہیں یہ بالکل ''خالص'' محبت ہے۔ خالص کے لفظ سے مجھے دودھ والے یاد آ گئے۔ یہ اصطلاح بنیادی طور پر انہیں کی ہے۔ دودھ سرکار ﷺ کو بہت پسند تھا۔ فرماتے تھے کہ یہ مشرب بھی ہے اور غذا بھی اور بھوکے ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) کے ذریعہ اصحاب صفہ کو بلایا اور دودھ کا پیالہ انہیں کے ذریعہ سب کو پلوایا اور ابو ہریرہ سوچتے کہ مجھے کیا ملے گا اور پھر وہ بھی چھک گئے، سیراب ہونے میں

وہ مزہ کہاں جو چھک جانے میں ہے اور آخر میں سرکار نے خود نوش فرمایا۔ یہ واقعہ معجزہ تو ہے ہی مگر مجھے ایک تمثیلی معلوم ہوتا ہے۔ قیامت، حوض کوثر اور تشنگانِ اُمت کی۔

یہی شیر خالص مسجد نبوی میں اور میرے اور صبیح کے وجود کو سیراب کر رہا ہے۔ دس سال کی مدت کوئی کم نہیں ہوتی مگر مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ صبیح ہمیشہ سے میرے ساتھ ہے۔ قدمین شریفین میں گزرے ہوئے چند لمحے ابد معلوم ہوتے ہیں اور اگر باہمی تعلقات کی بنیاد حب مصطفیٰ پر ہو تو یہ دوستی بھی ابدی معلوم ہوتی ہے۔

گزشتہ چند ماہ میری علالت کے دوران صبیح صحت کے پیغام کی طرح آتے جاتے رہے۔ وہ ہی میرے لیے پھر سے لکھنے پڑھنے کی تحریک ہے۔ ''ارے اب آپ کیا لکھیں گے؟ ....سب کچھ کہہ چکے۔'' ''قلم تو اٹھائیے۔آپ کب لکھتے ہیں۔قلم آپ کا ہوتا ہے، خیالات کوئی دیتا ہے۔'' .....کبھی طنز، کبھی تسلی.....اور صبیح نے غزل میں نعت کی جلوہ گری اور دیگر مضامین لکھوا ہی لیے۔

اللہ پر صبیح کا توکل، حضور سے تعلق کا ایک اظہار ہے۔ حضور ہی تو اللہ کی شان رحمت اور شان عطا کا اشارہ ہے۔

اور آج صبیح مسجد نبوی کے صحن میں رحمتوں کا منتظر ہے۔اس کا پورا وجود دامانِ طلب ہے۔ دیکھیے کیا کیا عطا ہوتا ہے۔

(صحن مسجد نبوی، ۱۵؍رمضان المبارک ۱۴۲۱ھ۔۱۹۹۹ء)

ترے غضب اور عذاب کا عکس
ہر دیار تباہ میں ہے
مِرا عمل اور میرا ایماں
بس ایک تیری نگاہ میں ہے

اور اللہ جل جلالہ کی اس حمد کے ساتھ اس کی نعت ہم ردیف ہے۔ جس کے ذریعہ ہم بارگاہ صمدیت واحدیت میں پہنچے۔ خدا کے وجود کی ہر دلیل پر گفتگو ہو سکتی ہے، مخالف دلیل پیش کی جاسکتی ہے۔ لیکن اس کے وجود کی ایک دلیل ایسی ہے جس کو ''کوئی'' رد نہیں کر سکتا۔

اس وضاحت کی ضرورت نہیں کہ ''کوئی'' سے مراد ایک شخص ہے جو ذہن کے ساتھ دل رکھتا ہو، تاریخ انساں کے ہر باب پر جس کی نظر ہو اور وہ دلیل یہ ہے کہ ''مصطفیٰ ﷺ نے اس کے وجود، اس کے اختیار کُل کی خبر دی ہے۔'' حمد اور نغمۂ مصطفیٰ مل کر وہ سازینہ بن جاتے ہیں جس میں تخلیق آدم، تکوینِ دو عالم اور حدیث امروز وفردا سب سما جاتے ہیں۔

جو رحمتوں کی بہار بن کر
دکھی دلوں کی پکار سُن کر

○

کرم کے موتی لٹا رہا ہے وہ مصطفیٰؐ ہے
جو بارشِ سنگ میں مجسّم دعا بنا ہے وہ مصطفیٰؐ ہے

○

جو عاصیوں کو بلا کے اپنا بنا رہا ہے وہ مصطفیٰؐ ہے
جو حکمِ ربّی سے سب کا ملجا بنا ہوا ہے وہ مصطفیٰؐ ہے

ہماری موسیقی کا وقت سے گہرا رشتہ ہے۔ یہ صبح کا راگ ہے، یہ شام کا نغمہ ہے، اس راگ سے رات نئے پیکر میں ڈھلتی ہے اور اس راگ میں پچھلے پہر کا سوز ہے، لیکن روح انسانی کی التجا جس

نغمے کا نام ہے سارے وقت اس کے ہیں، وہ ہر پہر میں گونجتا ہے اور ہماری روح کو اپنی نمی اور حدت سے آبگینہ بنا دیتا ہے۔ وہ آبگینہ ثبات، جس کی صفت ہے۔

غزل کی ہیئت میں بھی حسن کمال نے جو نعتیں لکھی ہیں۔ ان کا ''ذائقہ'' بھی سب سے الگ ہے۔ یہ نعتیں، نعت کہلانے کے شوق میں نہیں لکھی گئیں بلکہ ان میں عطا کا رنگ ہے۔ شعروں اور مصرعوں میں جو وسعت ہے اس سے عطا کا مفہوم آشکار ہو جاتا ہے۔ ''یہ التفات سیدِ سادات'' کے سوا کچھ اور نہیں۔

التفات سیدِ سادات کب محدود ہے
وسعتِ دامن بھی دیتے ہیں عطا کرتے ہوئے

(حفیظ تائب)

کاش اس وقت مجھے اتنی فرصت ہوتی کہ ان نعتوں پر تفصیل سے گفتگو کر سکتا۔ یہ چند سطریں ذکرِ خواجۂ کون و مکاںؐ کی سعادت میں شرکت کی غرض سے تحریر کی گئی ہیں، مگر ایک دو نکتوں کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔

میرے مرحوم دوست اور صاحب اسلوب، غزل سرا سید حسن نعیم مرحوم کا کہنا تھا کہ غزل میں مطلع کے ''آرٹ'' پر لوگوں نے کم توجہ دی ہے۔ مطلع خاور غزل کا دروازہ ہے۔ جس سے غزل اپنا جلوہ دکھاتی ہے۔ اچھا غزل گو اکثر مطلع سے آغاز کرتا ہے۔ مطلع، غزل کا مقام تناظر بھی ہے اور فریم بھی۔ حسن اکبر کمال کی ان نعتیہ غزلوں کے مطلعے آپ کی خاص توجہ کے طالب ہیں۔

مرے آقا زمینیں اور زمانے آپ کے ہیں
جو ہیں کون و مکاں میں، کُل خزانے آپ کے ہیں

○

رکھتا ہے اندھیروں میں روشن مرے سینے کو
آباد کیے رکھنا اس دل میں مدینے کو

یقین ہے وہ مری التجا نہ ٹالیں گے
یقین ہے وہ مدینے مجھے بلالیں گے

○

کرم یا نبیؐ، ہر زباں پر یہی ہے
وظیفہ غلاموں کا دن بھر یہی ہے

○

عزم سفر جو طیبہ کا ہو، نکلیں وقت سے ہم آگے
دل آنکھوں سے آگے، آنکھیں دل سے ایک اور قدم آگے

ایمان کے اس مرحلے پر یہ آدمی مبارک باد کا مستحق ہے جس کے لیے طیبہ کا عزم سفر، ہماری محدود بساط کے اندر ایک معراج ہے۔ کتنا عظیم تھا ہمارا نبی کہ اس کی معراج مسلمانوں کے لیے معراج کا دیباچہ بنی۔ الصلوۃ معراج المومنین.....اور مسلمانوں کی زندگی میں ایسی کئی معراجیں ہیں۔

آخری بات یہ کہ حسن اکبر کمال کی نعتوں کا شاید کوئی شعر ایسا نہیں ہے جسے سرکار ختمی مرتبت علیہ الصلوۃ والسلام کے علاوہ کسی اور ذات سے متعلق قرار دیا جاسکے۔ اہل بیتِ اطہار کی قدس نفسی اور صحابۂ کرام کا رتبہ عالی، یہ سب سرکارِ دو عالم کی ذات اور صفات کی جہتیں ہیں۔

(''التجا''، ۲۰۰۲ء)

نعت کی تخلیقی سچائیاں

ہمارا عہد مغالطوں کے ساتھ ساتھ سچائیوں کا عہد بھی ہے۔ ان کا ساتھ ساتھ ہونا اور ان کی باہمی آویزش بھی ایک صداقت ہے۔

دانش وری کے ہزاروں مغالطوں کے درمیان معرفتِ رتبۂ خیر البشر صلی اللہ علیہ وسلم کا آفتاب ہمارے ہی دور میں ایک نئے افق پر ابھرا ہے...... ادبی افق پر۔ اردو میں نعت کے بہت سے شاعروں کی آمد اور نغمہ سرائی کے بعد نعت فہمی اور نقدِ نعت کا دور پوری قوت، وسعت اور نظر کی گہرائی اور گیرائی کے ساتھ شروع ہوا ہے۔

آج سے پندرہ بیس سال پہلے نعت کی تعریف کرنے والے نقاد اور اہلِ ادب بھی نعت کو ایک مستقل ادبی صنف قرار دینے کے باب میں شک اور تذبذب کا شکار تھے، لیکن آج نعت کی یہ حیثیت مسلم ہو چکی ہے۔

فضا کی یہ تبدیلی اچانک اور بے سبب نہیں ہے۔ چند اہلِ قلم نے اِس مسئلے کو چھیڑا اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض سے انھیں کامیابی نصیب ہوئی۔ ''نعت رنگ'' اِس راستے کا پہلا مسافر تھا، اور اب ایک قافلۂ نعت شناسی ہمیں ادب کی بلند ترین منزل کی طرف بڑھتا ہوا نظر آتا ہے۔

عزیز احسن اس قافلے کے اوّلین راہیوں میں سے ایک ہیں، جن کو اُن کی محنت، مطالعے اور ذوق نے اِس قافلے کے سالاروں میں شامل کر دیا ہے۔ عزیز احسن صاحب کے مضامین میں نعت کے فنی تقاضوں، اسلوب کے مسئلوں، موضوع کے مطالبوں...... اور دوسرے تخلیقی پہلوؤں کا جائزہ بڑی وضاحت کے ساتھ ملتا ہے۔ وہ خالص ادبی نقطۂ نظر سے نعت کا مطالعہ کرتے ہیں اور

فقہی خارزاروں میں الجھ کر اپنے دامن کو تار تار نہیں ہونے دیتے۔

عزیز احسن صاحب نے نعت کا تخلیقی مطالعہ کیا ہے وہ نعت گو شعرا کے فہرست ساز نہیں۔ زیرِ نظر کتاب ان کے اِس سفر کا دوسرا سنگِ میل ہے اور دیکھنا یہ ہے کہ وہ تمنا کا تیسرا قدم کن بلندیوں پر تلاش کریں گے۔

(''اقلیم نعت''، مارچ ۲۰۰۳ء)

عبدالمالک مضطر کا نعتیہ کلام

ہمارا دور فروغِ نعت کا عہد قرار دیا جاسکتا ہے۔ ریڈیو اور ٹیلویژن پر نعتیں پہلے سے زیادہ پیش کی جارہی ہیں، نعتیہ مشاعرے ملک کے ہر شہر میں منعقد ہورہے ہیں اور پابندی کے ساتھ۔ اب ہر رسالے کا آغاز حمد و نعت سے ہوتا ہے۔ جتنے نعتیہ مجموعے حالیہ برسوں میں شائع ہوئے ہیں، اردو زبان کی تاریخ میں اُس کی مثال نہیں ملتی۔ سب سے بڑی تبدیلی یہ رونما ہوئی ہے کہ نعت کو اب بھی ایک موقر صنفِ شاعری تسلیم کرتے ہیں، ورنہ نعت تو 'تبرک' ہی سمجھی جاتی تھی۔ اس خوشگوار تبدیلی کے باوجود بیشتر شاعر روایتی نعت کہہ رہے ہیں، جس میں شخصیت کی نمود کی کمی کے ساتھ مقامِ محمدِ عربی علیہا الصلوٰۃ والسلام کے مرتبۂ عظیم سے باخبری اور آگاہی بھی کم ہی نظر آتی ہے، اور زیادہ تر شاعر غزل کے فارم میں نعت کہہ رہے ہیں۔ اِس پیکر کی تاثیر اور ابلاغ کی سہولت مجھے تسلیم، لیکن غزل میں محمد رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ابدی پیغام، اسلامی تعلیمات، صحابہ کرام، نقشِ سیرت اور دور کو پیش نہیں کیا جاسکتا۔ یہ کام تو مثنوی، مسدس اور نظمِ آزاد کے ذریعے ہی ممکن ہے۔

محسنؔ کاکوروی کے نعتیہ قصیدے اور نعتیہ مثنویاں آج بھی حرفِ تازہ کا درجہ رکھتی ہیں، مسدسِ حالیؔ میں حالیؔ کے نعتیہ شعر ہمارے حافظے کی آبرو ہیں۔ پچھلی صدی میں شاہنامۂ اسلام کے بعد عبدالعزیز خالدؔ کی فارقلیط، عمیقؔ حنفی کی صلصلۃ الجرس اور قمرؔ ہاشمی کی مُرسلِ آخر، ایسی نظمیں ہیں جن میں تسلسل اور وسعت نظر آتی ہے۔

عبدالمالک مضطرؔ صاحب کی نظم (یا نظموں کا مجموعہ) ''آرزو'' جدید نعتیہ شاعری کی وسعت کی ایک سمت کا درجہ رکھتی ہے۔ عبدالمالک صاحب ایک ذی علم آدمی ہیں۔ حقیقی علم نے اُنھیں صحتِ عقائد بھی عطا کی ہے، اور اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک قلب سوزاں کے مالک ہیں۔ اُن

کے جذبات میں شوریدگی نہیں بلکہ تہذیب ہے۔ اِن تمام باتوں کا اظہار 'آرزو' میں ہنرمندی کے ساتھ ہوا ہے۔ عبدالمالک صاحب نے مسدس کی ہیئت کا انتخاب کیا ہے جو وسعت بھی رکھتی ہے اور قوت و جوش کے اظہار کا شعری وسیلہ ہے۔ پھر عبدالمالک صاحب اس حقیقت سے بھی آگاہ ہیں کہ اسلام اور اُس کے پیغام کو نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ طیبہ کے حوالے ہی سے پیش کیا جاسکتا ہے، اور وہ اس رمز کو بھی جانتے ہیں کہ صحابہِ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین شاہکارِ نبوت ہیں اور اُن سے بہتر کسی انسانی جماعت پر سورج طلوع نہیں ہوا۔ مضطؔر کے ذہن میں نعت اور نبی کریمؐ کی مرکزیت کا نہایت صحیح احساس اور شعور موجود ہے۔ حضور ﷺ کی سیرت اور اسوہ کی روشنی میں اسلام، اخلاق اور زندگی کی اعلیٰ قدروں کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ صحابہؓ کرام کا تذکرہ بھی آپ نے بڑے سلیقے سے کیا ہے۔ ان ستاروں کے بغیر اُس سراجِ منیر کی عظمتوں کو سمجھنا محال ہے۔

اللہ تعالیٰ نے عبدالمالک مضطؔر کو ایسی قوتِ نظم اور شاعرانہ صلاحیتیں عطا فرمائی ہیں کہ ماشاءاللہ انھوں نے اپنے موضوع کے ساتھ انصاف کیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ''آرزو'' سے متاثر ہو کر شعرائے کرام اُس وسعت کو اختیار کریں گے جس کا صنفِ نعت تقاضا کر رہی ہے اگر جذبہ سچا ہو تو اس کی ادائیگی میں بھی تاثر اور تاثیر کا جلوہ نظر آتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جس طرح مضطؔر کے جذبات اور قوتِ کلام نے مجھے متاثر کیا ہے، دوسرے پڑھنے والے بھی ضرور اثر قبول کریں گے۔

(''آرزو''، اپریل ۲۰۰۲ء)

افتخار عارف

افتخار عارف نے اپنے حافظے اور علم و معلومات کے ذریعے اپنا تعارف کرایا اور پھر غزل کے اس دور میں اُس کی غزل گوئی نے سماعتوں میں اپنی جگہ بنائی۔ اُس کے اس شعر کو ضرب المثلی کا درجہ حاصل ہوا:

مرے خدا مجھے اتنا تو معتبر کردے
میں جس مکان میں رہتا ہوں اُس کے گھر کردے

اُس کی یہ دعا بارگاہ ایزدی میں جس طرح قبول ہوئی اس کا تصور بھی اُس کے ذہن میں نہیں ہوگا۔ وہ کسی مکان، کسی نگر اور کسی دیار میں رہے، اللہ پاک نے مدینہ منورہ کو اُس کی حقیقی شخصیت کا گھر بنا دیا ہے اور جب اُس کے رب نے اُسے یہ دولت عطا کردی تو اُسے خبر ہوئی اور بے اختیار دل سے آواز اُبھری:

عمر بھر ٹھوکریں کھاتا نہ پھروں شہر بہ شہر
ایک ہی شہر میں اور ایک ہی در پر رکھا

اور اس شعر میں اُسے مدحتِ شافع محشر ﷺ پر مقرر کیا گیا۔ آدمی کو چاکری ملے تو ایسی کہ شہنشاہ بھی رشک کریں۔

شعر کے بارے میں کئی نظریات، تصورات اور خیالات ہیں۔ مجھے ان میں تضاد نظر نہیں آتا بلکہ یہ ایک دوسرے کا تکملہ معلوم ہوتے ہیں۔ شاعری کی ایک ادا بے ساختہ پن ہے اور ایک شیوہ آراستگی ہے۔ شاعری سادگی بھی ہے اور مرصع ساز کا کام بھی۔ افتخار عارف کی شاعری اور بالخصوص نعت میں سارے رنگ موجود ہیں۔ بحریں ایسی کہ اُن میں نغمگی لفظ بہ لفظ آگے بڑھتی ہے اور مصرع

ختم کرنے کے بعد اُس کی لہریں ذہن میں پھیلتی جاتی ہیں۔ لفظ ایسے جیسے عقیدت اور محبت مقامِ محمدی ﷺ کے باب میں سوچ رہے ہوں۔ فکر اور جذبہ کا ایسا امتزاج آج کے کم ہی نعت گو شاعروں کے ہاں نظر آئے گا۔

افتخار عارف کی ان نعتوں میں سرکار ختمی مرتبت ﷺ کی ازاول تا ابد وقت پر حاوی شخصیت اور رسالت کے پہلوؤں کے ساتھ ساتھ اہلِ بیت اور محبان اہلِ بیت کی محبت کی شادابی بھی ہے۔

بعض لوگ جو کٹر مذہبی دکھائی دیتے ہیں، اندر سے دنیادار نکلتے ہیں اور بعض نظر بظاہر دنیا میں ڈوبے ہوئے لوگ حقیقی مذہبیت سے مالا مال ہوتے ہیں کہ ایسی مذہبیت حب رسول ﷺ سے عبارت ہوتی ہے۔

افتخار عارف کی نعتوں کے مطالعے سے میری بات آپ پر واضح ہو سکے گی۔

(''نعت رنگ''، فروری ۲۰۰۴ء)

مولانا کوکب نورانی

عزیزم مولانا کوکب نورانی اوکاڑوی، ان علماء میں ہیں جو خوش گفتار ہونے کے ساتھ ساتھ تحریر میں ''خوش اسلوب'' بھی ہیں۔ ان کی تحریروں میں علم کے ساتھ ساتھ شگفتگی اور زندگی کی وہ لہر بھی ہے جو چھیڑ چھاڑ کے لطف سے باخبر ہے۔

مولانا نے نعت پر جو کچھ لکھا ہے اس میں ادیب کی نعت شناسی اور مفتی کی شرعی گرفت کا امتزاج ہے اور یوں وہ نعت کے ناقدین میں عجب انفرادیت کے مالک ہیں۔ اگرچہ راقم الحروف ان کے التفاتِ خاص سے نوازا گیا ہے مگر اس کے باوجود وہ مولانا کی تحریروں کے حُسن اور افادیت کا قائل ہے۔ دعا ہے کہ ان کے نقدِ ادب کا یہ سلسلہ جاری رہے اور وہ ہماری زبان کو قائم رہنے والی تحریریں دیتے رہیں۔

(تاثرات، ''نعت اور آدابِ نعت'' دسمبر ۲۰۰۴ء)

روشنی کے خدوخال ۔ ایک شاعرانہ انجیل

جناب رفیع الدین رازؔ کا مسدس نورِ مسلسل کی طرح قاری کو دیارِ نور میں پہنچا دیتا ہے۔ تکرارِ تجلّی یہی تو ہے ''مرحبا صلِ علی اے آئنہ اے روشنی''۔ مسدس کا نام ہے ''روشنی کے خدوخال'' ربّ ذوالجلال کو روشنی کو مجسم کرنا تھا اور اس غرض کے لیے اس نے رسول اکرم ﷺ کی بعثت فرمائی، یوں بندۂ خاک نہاد بندۂ مولیٰ صفات اور انسان اپنے رب کے اخلاق کا آئینہ بن گیا۔

مرحبا صلِ علیٰ اے آئنہ اے روشنی، اس مصرع میں دو دعائیہ یا تہنیتی کلمات ہیں۔ چاہیں تو آپ انھیں درود اور سلام کا صیغہ کہہ سکتے ہیں اور اس کے بعد دو خطابیہ کلمات ہیں۔ ''اے آئنہ اے روشنی'' اس مصرعے میں شاعر کا مفہوم ہم پر مدعائے خداوندی کی طرح روشن ہو جاتا ہے۔ سرکار دو عالم کے لیے آئنہ اور روشنی کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ حضور ﷺ کی تخلیق تو مٹی سے ہوئی لیکن آپ کا وجود سراپا روشنی تھا۔ آپ کی صفات کا دائرہ اسمائے الٰہی تک پھیلا ہوا ہے۔ قرآن نے آپ کو رؤف الرحیم قرار دیا۔ بالمومنین رؤف الرحیم (۱۲۸/۹) آپ کو بھیجنے والے نے نور قرار دیا۔ قرآن نے آپ کو سراجاً منیرا یعنی چمکتا ہوا سورج کہا۔ نور اس ذات کو کہتے ہیں جو خود بھی روشن ہو اور دوسروں کو بھی روشن کرے۔ معراج بندگی یہی ہے کہ بندہ اپنے مولیٰ کے اخلاق کا آئینہ بن جائے۔ اس کو قرآن کی اصطلاح میں اللہ کا رنگ کہا گیا ہے اور اللہ کے رنگ سے بہتر کون سا رنگ ہے۔ صاحب مقامِ محمود ﷺ اس دنیا میں اللہ کی آیت تو تھے آئندہ آنے والے زندگی میں وہ صاحب مقامِ محمود بھی ہیں۔ وہ صفات خداوندی کا آئینہ ہیں۔ رفعی الدین رازؔ صاحب نے اپنے مسدس کے ٹیپ کے مصرعے میں ان سب کو حقائق کو سمو دیا ہے۔ اس مصرعے میں کوئی فعل استعمال نہیں کیا گیا لیکن مفہوم نہایت درجہ واضح ہے۔ فعل میں کوئی نہ کوئی زمانہ ضرور آتا ہے۔ ختم الرسل ﷺ کی رسالت

اور ذات ہر قیدِ زماں سے بالاتر ہے، اسی لیے وہ کسی زمانے تک محدود نہیں۔ جلوۂ محمدی بے قیدِ زمان و مکاں ہے۔

(۲)

نعت پر میرے مضامین کے مطالعے کے بعد بعض حضرات نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ میرے خیال میں غزل کا پیکر نعت کے لیے سب سے زیادہ موزوں ہے اور میں طویل نعتوں کے حق میں نہیں ہوں۔ یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں ہے۔ میں نے مسلسل یہ لکھا ہے اور یہ عرض کیا ہے کہ غزل کے پیرائے میں شاعر اور پڑھنے والے کے درمیان ابلاغ کی کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی۔ پھر غزل کی ہیئت کے اعتبار سے نعت کے اشعار جلوہ گاہِ صفات محمدی بن جاتے ہیں اور ہمارے حافظے کا حصہ بن کر ذہن میں گونجتے رہتے ہیں اور یوں ذکر اور فکر کی ایک دنیا تعمیر کرتے ہیں۔ بیشتر طویل نظمیں یا تو بے کیف تفصیلات کا مجموعہ بن جاتی ہیں یا ان میں شعرانہ عنصر معروضی (خارجی) تفصیلات سے مغلوب بن جاتا ہے اور بیانیہ عنصر شاعرانہ سفر میں رکاوٹ بنتا ہے۔ اس کی نمایاں ترین مثال شاہنامہ اسلام ہے۔ جس میں ایک طرف دعائے صحرا جیسا شاعرانہ تاثر موجود ہے وہاں دوسری طرف بے رنگ تفصیلات کا ہجوم شاعرانہ تاثر پر غالب آجاتا ہے۔ طویل نعتیہ نظموں کے لیے بھی ایک شاعرانہ دروں بینی ضروری ہے۔ شاعر خارجی تفصیلات میں الجھنے کے بجائے نظم کا ربط موضوعات کے داخلی اور فکری عناصر کی مدد سے قائم کرے۔ زماں و مکاں کی ترتیب اور تعلق کو پیشِ نظر ضرور رکھا جائے مگر ان کی صورت گری تاثر اور جذبات کی بنیادوں پر کی جائے۔ جناب رفیع الدین راز اس کوشش میں بڑی حد تک کامیاب رہے ہیں۔ انھوں نے اس نعتیہ مسدس کی ترتیب حیاتِ محمد کی مدد سے کی ہے اور حضور ﷺ اس دور میں ابدی قدروں کے امین بن کر مطلعِ زیست پر نمودار ہوئے۔

کر چکا تھا آدمی ایک ایک سچائی کو رد
روشنی سے بے خبر تھا ، آئینے سے نابلد

اور پھر راز صاحب آئینے اور روشنی کی تلاش میں اس خاک دانِ ارضی میں تہذیبی اقدار

کے سفر اور تلاش میں انسانی تاریخ کے مختلف ادوار سے گزرے۔ انھوں نے انسانی تاریخ اور نبی اکرم ﷺ کی بعثت کے پس منظر کی تلاش میں تاریخ کا سفر کیا اور اقدار حیاتِ انسانی کی بازیافت میں نبوت اور رسالت کی اہمیت کو سمجھا۔ وہ عورت کی بے حرمتی کو تہذیب کی بے حرمتی قرار دیتے ہیں:

رقص کرتی پھر رہی تھی چاک دامانی کی خو
کوئی بھی ایسا نہ تھا کرتا جو دامن کو رفو

محمد عربی ﷺ نے عورت کو حرمت وعزت کی ردا عطا فرمائی۔ عورت مرد کی قوت بن گئی اور حیاتِ انسانی کے ارتقا کی عظیم قوت۔ اس قوت نے عورت کو انسانی ثقافت اور تاریخ کے ارتقاء کا موثر ترین وسیلہ سمجھ لیا۔ ہم جس جاہلیت کے دور سے گزرر ہے ہیں، اس میں عکاظ کے بازار کی جگہ ثقافتی مظاہروں، اسٹیج اور ٹی وی کی اسکرین نے لے لی ہے اور عورت برہنہ ہوکر اپنے مظاہرے کو آزادی سمجھ رہی ہے۔ اسے احساس تک نہیں کہ کنیزوں کی منڈی کی صورت بن گئی۔ بعثتِ نبوی سے پہلے حیاتِ انسانی کے تمدنی اور معاشرتی رویوں کی بنیاد ہی انسانوں کا اندازِ نظر تھا جو ہر اعلیٰ قدر سے دور تھا۔ رفیع الدین رازؔ کے اس نعتیہ مسدس سے یہ نکتہ ابھر کر سامنے آتا ہے کہ انسان کا یہی غلط اندازِ نظر اور فکر بھی جاہلیت کی اساس تھا جب:

آدمی اپنی انا کو کہہ رہا تھا آگہی

اور

آدمی آزاد تھا اخلاق کی زنجیر سے
روح کی دنیا تھی عاری عقل کی تنویر سے
آپ نے فکر برہنہ کو ردائے عقل دی

رفیع الدین رازؔ نے یہ نکتہ سمجھ لیا ہے کہ وہ ردائے عقل ہی نئے دورِ تمدن کا اشاریہ ہے جو وحیٔ الٰہی کے تار و پود سے بُنی گئی ہے۔ وحی الٰہی جو روشنی ہی روشنی ہے۔

آپ نے خورشید رکھا فکر کی بنیاد میں
اک نیا موسم اُتر آیا دلِ ناشاد میں

ان دو مصرعوں کا اسلوب اظہار خارجی اور معروضی حقائق کو کس طرح ایک شاعرانہ تجربے سے ڈھال رہا ہے اس کے بغیر واقعات کا بیان شاعری نہیں بن سکتا۔ یہی تغزل نظم کو شاعری بنا دیتا ہے۔ اقبال اور ہمارے دوسرے اہم شاعروں کی نظموں میں یہی ''غزل سامانی'' ملتی ہے جس کی وجہ سے ان کی نظموں کے اشعار، نظموں سے الگ ہوکر بھی اپنی معنویت نہیں کھوتے اور ہمارے حافظے کا حصہ بن جاتے ہیں:

آخرِ شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ
صبح دم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا

اس نعتیہ مسدس میں یہی غزل سامانی بہت سے مقامات میں نظر آتی ہے۔ مثال کے طور پر اسی شعر کو لے لیجیے جو میں نے ابھی پیش کیا:

آپ نے خورشید رکھا فکر کی بنیاد میں
اک نیا موسم اُتر آیا دلِ ناشاد میں

اسی غزل سامانی نے اس نعتیہ مسدس کو ہماری نعتیہ شاعری کے لیے ایک نئے موسم کا درجہ عطا کر دیا ہے۔

یہ مسدس اپنی ایک فضا رکھتا ہے جو ہمارے شعر و ادب کی مانوس فضا ہے اور فارسی عناصر کے باوجود اردو کا مخصوص مزاج ہر جگہ برقرار رہتا ہے۔ کئی مقامات پر ہندی الفاظ فضا کو مجروح نہیں کرتے بلکہ ''اردوئیت'' کو اُجاگر کر دیتے ہیں۔

گھپ اندھیر خیمہ زن تھا، جسم و جاں کے درمیاں

○

خود کو گھائل کر رہا تھا آپ اپنے تیر سے

○

مدتوں کے بعد اس دھرتی پہ آئی ہے بہار

○

جانے کیا رُت تھی جب ابراہیم نے کی تھی دعا

رفیع الدین رازؔ نے بعثتِ محمدیؐ سے پہلے انسانیت اور کائنات کی تصویر نہایت بلیغ انداز میں پیش کی ہے اور یہ تصویر بعثتِ محمدی کے پس منظر کا درجہ رکھتی ہے۔

یہ متضاد منظر، انسانی تاریخ کی تمام تفصیلات کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہیں اور قاری پر یہ نکتہ آشکار ہو جاتا ہے کہ شعر کس طرح ہمیں اپنی تاریخ کے باطن میں جھانکنے کا موقع دیتا ہے۔ تفصیلات، اس تضاد کو اس طرح نہیں سمیٹ سکتیں جس طرح شاعرانہ استعارے، کنائے اور اسالیب سمیٹ سکتے ہیں۔

آپ کے پرتو سے جب امکان کی شمعیں جلیں
سرزمین قیصر و کسریٰ کی بنیادیں ہلیں

○

درد کو لہجہ ملا انفاس کو شائستگی
مرحبا صلِ علیٰ اے آئینہ ، اے روشنی

عہد جاہلیت کے بعد ایک طرف انسان کو شائستگی کی متاع گراں ارض ملی اور دوسری طرف علوم کا وہ دور شروع ہوا جس میں علم ضمنی نہ رہا بلکہ معرفتِ خداوندی کے طفیل یقینی اور افادی بن گیا۔ یہ علمی نکتہ جو فلسفہ و دنیائے افکار کی ارتقا کی کہانی اپنے دامن میں رکھتا ہے فلسفہ و تہذیب کی تاریخ میں مختلف عنوانات کے تحت تفصیل سے لکھا گیا ہے اور اس کے بہت سے پہلو آج بھی ہمارے مطالعے کا موضوع ہیں لیکن شاعر نے یہ پوری داستان دو مصرعوں میں بیان کر دی ہے۔

مصطفیٰ کے نقشِ پا ہیں گوہر گنجِ علوم
رازؔ ان کو سر پہ رکھ اپنے ،انھیں ہونٹوں سے چوم

سرورِ کائنات علیہ ﷺ کے لائے ہوئے انقلاب کی داستان بھی اس مسدس میں بیان کی گئی ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ قرآنِ ناطق علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حیاتِ طیبہ کے مختلف پہلو اور مختلف ادوار میں مسدس میں نظروں کے سامنے آتے جاتے ہیں۔آپ نے اللہ کے پیغام کو پیش کرتے ہوئے ہر استبداد اور ظلم کا مقابلہ کیا۔ یہ ظلم دھوپ کی طرح تھے اور اس دھوپ میں الطافِ الٰہی ایک ابر کی طرح سرکارِ دوعالم ﷺ کے وجود پر سایہ فگن تھے اور اس ابر کے سائباں کے نیچے آپ نے انسانیت کے لیے جو خواب دیکھے آپ کے رب نے ان خوابوں کو قائم رہنے والی حقیقتوں کا پیکر عطا کیا اور انھیں انسانیت کا مقدر اور مستقبل بنا دیا ہے۔ رفیع الدین رازؔ نے اس دورِ ظلم و ستم میں حضور ﷺ کے اسلوبِ حیات کو یوں شعر کا پیکر عطا کیا ہے:

دھوپ میں بیٹھا ہے ابراہیم کا یہ جانشیں
ہاں مگر آنکھوں میں خیمہ زن ہے اک خوابِ حسیں

ہجرت ختم رسول ﷺ کی زندگی کا ایک عنوانِ جلی ہے۔آپ کی ہجرت نے تاریخ اور جغرافیہ دونوں کو بدل دیا اور قومیتِ مسلم ہجرتِ مصطفیٰ سے صورت پذیر ہوئی ہے۔ہجرت ہی اسلامی ریاست کا سنگ بنیاد ہے۔ہجرت کا ہمہ پہلو واقعہ ہی اسلامی تقویم کا صورت گر ہے۔ رفیع الدین رازؔ کا یہ مصرع ،مفہوم ہجرت کو سمجھنے کی کلید ہے اور یہ مصرع کسی الہامی لمحے میں انھیں عطا کیا گیا ہے:

آپ کی ہجرت ہے یا اللہ کا طرزِ خطاب

اور شاہراہ ہجرت کے معانی اس شعر میں ہماری تاریخ کے ورق پر پھیلے ہوئے نظر آتے ہیں:

یہ جو رستہ ہے حرا سے ثور تک پھیلا ہوا
اس کے ہر ذرّے پہ ہے اک عہدِ نولکھا ہوا

ہجرت ہی عہدِ نو کی تاریخ کا رنامہ ہے اور تاریخِ انسانی کا یہ شرف ہے کہ وہ بعنوان محمدؐ لکھی جائے۔

میں نے اس نعتیہ مسدس کے چند پہلوؤں کی جھلک پیش کی ہے اور روشنی بردار آئینہ میں سیرتِ محمدی کا مطالعہ کیجیے اور یہ اندازہ کیجیے کہ سرکار کا نام شاعرانہ تخیل کے لیے کس طرح پرِ پرواز بنتا ہے۔

(۲۰۰۵ء)

لاریب

اللہ ،قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم، الحمداللہ اقبال حیدر کی شخصیت کے اجزائے ترکیبی ہیں۔ اِن کا ذکر اُن کے لیے شاعری نہیں بلکہ گفتگو اور اپنی ذات کا اظہار ہے۔ یہ بات بہت کم شاعروں کے لیے کہی جا سکتی ہے۔ اقبال حیدر کے حمدیہ اور نعتیہ کلام میں شعرسازی اور ''شعر بنانے'' کا کوئی مقام نہیں آتا ہے۔ دین کی سیدھی راہ پر چلنے کی تمنا اور کوشش جب عمل کے ساتھ کلامِ موزوں کے قالب میں ڈھلتی ہے تو اقبال حیدر کی حمد یہ نعت یا اسلام کے بارے میں اُن کا شعر بن جاتی ہے۔

میں نے اکثر احباب سے یہ بات عرض کی ہے اور شاید تحریری طور پر بھی پیش کی ہے کہ اردو میں نعت کی شاعری میں بلند سطح نظر آتی ہے۔ شعر، جذبہ اور خیال کی سطح، لیکن حمدیہ شاعری بہت رسمی اور خیالی ہے۔ ہمارے شاعروں نے رسولِ عربی ﷺ کے ساتھ اپنے ''عشق'' کے بہت دعوے کیے ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے یہ بات کہلوائی ہے کہ ''اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میرا اتباع کرو، اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے گا اور تمھارے گناہوں کی مغفرت فرمادے گا۔''

اقبال حیدر نے خشیت الٰہی میں ''حب الٰہی'' کے پہلو پیدا کر دیے ہیں اور اُن کے ہاں خشیت، محبت بن گئی ہے۔ یہ تزکیۂ نفس اور احسان کا راستہ ہے۔ اللہ تعالیٰ بیشک خالق کائنات ہے، ہر بلند و پست، خشک و تر پر اُسی کی حکمرانی ہے مگر یہ بات بھی مسلمان کے پیش نظر رہنی ضروری ہے کہ ''اللہ تعالیٰ اُن لوگوں کا دوست ہے جو ایمان لائے، اور وہ انھیں ظلمات سے نکال کر نور کی طرف لاتا ہے۔'' اللہ تعالیٰ سے یہ محبت، قربتِ الٰہی کی بنیاد بنتی ہے اور ایسی سچی گفتگو شعر کے پیراہن میں اُبھرتی

ہے۔

میرا سچا دوست ہے تو | سب سے اچھا دوست ہے تو
کوئی شریک نہیں تیرا | ایک اکیلا دوست ہے تو
تو نے نعمت عظمیٰ دی | کتنا پیارا دوست ہے تو

ایسی حمد یہ گفتگو کہیں اور، اور اتنی کثرت سے نظر آئے تو مجھے مطلع فرمائیے۔ ''ایک اکیلا'' میں واحد اور احد کا جلوہ دیکھیے۔

اور اپنے بندوں کے ساتھ حق تعالیٰ جل جلالہ کی دوستی کا سب سے بڑا ثبوت بعثتِ مصطفیؐ ہے۔ ایسی نعمتِ عظمیٰ عطا کر کے اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو ظلمات سے نکال کر دیارِ نور میں پہنچا دیا۔ وہ نور جو دائمی اور ابدی ہے۔ ہمارے ایک بڑے نقاد نے مسدسِ حالی کے بے مثال نعتیہ اشعار کے بارے میں طنزاً کہا تھا کہ اپنے، پرائے کا غم کھانے کے لیے حالی کافی تھے۔ یہ مقامِ رسالت نہیں۔ حالی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور نبوت کے ساتھ ساتھ اُن کی سیرت کے نقش کو بھی اُبھارا ہے اور اس طرح کہ ''مسلم اول'' ہر دور کے مسلمان کے لیے اعلیٰ ترین مثالیہ کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔ یہ دونوں رُخ ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔

دل مطمئن ہے آقاؐ کے قدموں میں بیٹھ کر
آقاؐ کا امتی ہوں، یہ میرا مقام ہے

لبیک یا رسول اللہ ﷺ رسالت کے اتباع کی خواہش کا نعرۂ عمل ہے۔

آقاؐ اے میرے آقاؐ اپنا بنائے رکھنا
شیطانی وسوسوں سے، نفسانی خواہشوں سے
مجھ کو بچائے رکھنا، اپنا بنائے رکھنا

اللہ اور رسولِ کائنات ﷺ سے اِسی تعلق اور رشتے کی بنیادوں پر اقبال حیدر کا اسلام اور ایمان قائم ہے۔

میں حاضر ہوں میں حاضر ہوں

اللہ مرے ، میں حاضر ہوں

اور حاضری کی اس شاعری کو سچی گواہی کا درجہ حاصل ہے۔ اِس میں مدینہ کے شہر محبت کے نقوش، حرم کعبہ کی فلک مآبی، حرمین کے سارے مناظر موجود ہیں۔ لاریب

اللہ ہمارا رب ہے ۔ لاریب فیہ

قرآن اللہ کی گفتگو ہے اپنے بندوں کے ساتھ

۔لاریب فیہ

محمد رسول اللہ ﷺ ہدایتِ کبریٰ کا نشان ہیں

۔لاریب فیہ

یہی اقبال حیدر کی شاعری ہے۔ اِس وقت جب میں حرمین شریفین کی زیارت کے لیے پابہ رکاب ہوں، الفاظ میرا ساتھ چھوڑ چکے ہیں اور اِس سچی شاعری کو پڑھنے اور برداشت کرنے کی سکت مجھ میں نہیں۔ یہ چند سطریں اعترافِ حقیقت کے طور پر لکھی گئی ہیں۔ کسی ادبی تنقیدی تحریر کے لیے اِس شاعری کو بار بار پڑھنے کی فرصت چاہیے۔ ان شاء اللہ میں اقبال حیدر کی اسلامی شاعری کے بارے میں تفصیل سے لکھوں گا۔ باذن ربی

(''لاریب''، یکم اگست ۲۰۰۵ء)

بہر زماں بہر زباں

جب ''بہر زماں بہر زباں'' کا ایک نسخہ جناب نور احمد میرٹھی نے عطا فرمایا تو میں خاصی دیر تک اس نام کو پڑھتا رہا اور پھر کتاب کی ورق گردانی کی منزل آئی۔ مجھے کتاب کا نام ہی ''عطا'' معلوم ہوا.... اور اسی کے ساتھ ساتھ اپنی ذات سے میرا مکالمہ جاری رہا۔

''کتاب کا نام کیا ہے''

''جلی حروف میں لکھا تو ہے، ''بہر زماں بہر زباں'' .....

''مگر یہ نام تو ادھورا ہے۔ اس انتخاب اور تذکرہ کا نام ہے، ''بہر زماں بہر زباں ﷺ'' پر دور میں ہر زبان پر ﷺ کے الفاظ ہی گونجتے رہے ہیں، ذہن میں اور فضاؤں میں دائرے بناتے رہے ہیں۔''

اور پھر میں نے نور احمد صاحب سے کہا:

''یہ نام آپ کو خوب ملا۔''

اور انھوں نے جواب دیا:

''آپ نے سچ کہا۔ یہ نام میں نے نہیں رکھا۔ مجھے ملا ہے، عطا ہوا ہے۔''

زندگی میں، ادب میں، مختلف شعبوں میں بعض چیزیں آدمی کو عطا کی جاتی ہیں۔

اس دار العمل میں بھی بعض سعادتیں ''توفیق الٰہی'' ہوتی ہیں۔ جناب نور احمد میرٹھی کا یہ تذکرہ ان کے لیے یہ عطائے رب ہے، لیکن عطا کے لیے آدمی کا انتخاب اس کے ذوق، اس کی لگن، اس کے اخلاص اور جد و جہد و سعی کی بنا پر کیا جاتا ہے۔

جناب نور احمد میرٹھی نے غیر مسلم شعرا کی نعتیہ شاعری کا انتخاب ''نورِ سخن'' کے نام سے

پیش کیا، لیکن وہ اپنے کام سے فارغ نہیں ہوئے۔ اس انتخاب کے بعد وہ اپنے کام میں مصروف رہے اور انھوں نے کئی برس کی محنت اور کاوش کے بعد غیر مسلم نعت گو شعرا کا یہ تذکرہ مرتب کیا اس تذکرے میں انتخاب بھی شامل ہے اور تذکرہ کی روایت کے مطابق انھوں سے بیش تر شاعروں کے کلام کے تفصیلی مطالعے کے بعد انتخاب مرتب کیا ہے۔

جناب نور احمد میرٹھی نے اس تذکرے کا تفصیلی مقدمہ بھی تحریر فرمایا ہے، ''غیر مسلموں کی نعتیہ شاعری۔ تاریخ و تجزیہ'' اس تحریر سے اپنے موضوع ان کے مطالعے کی وسعت اور ان کی فکری و فنی گرفت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ تمام مصادر و منابع ان کے سامنے ہیں۔ انھوں نے اپنے تمام پیش روؤں کی محنت اور کام کا اعتراف کیا ہے اور پھر اس باب میں بڑی وسعت قلب کا اظہار کیا ہے۔ یہ وسعت قلب علمی اعتبار سے بھی قابل قدر ہے اور اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ نور احمد میرٹھی صاحب حضور اکرم ﷺ کے اسوۂ حسنہ پر عمل کرنے کی کیسی کوشش کرتے ہیں۔ سرکار ختمی مرتبت ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ ''جو انسانوں کا شکریہ ادا نہیں کرتا، وہ اپنے اللہ کا بھی شکر ادا نہیں کرتا۔'' انھوں نے اپنے احباب، بزرگوں اور تعاون کرنے والوں کا تفصیلی شکریہ ادا کیا ہے اور اس تفصیل کا سبب میری دانست میں یہی قول سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام ہے۔

اس تذکرے کے نعتیہ انتخاب کا تفصیلی تنقیدی مطالعہ اب ہم سب کا کام ہے۔ جناب نور احمد میرٹھی نے نہایت اہم مواد ہمارے لیے مہیا کر دیا ہے۔ غیر مسلموں کے اعتراف عظمت محمدی ﷺ کا سلسلہ ابو جہل سے ہمارے عہد تک جاری و ساری ہے۔ جذباتی اور شعری سطح پر بھی اور فکری سطح پر بھی۔ فلسفی اور مفکر بھی کمال فکر محمد ﷺ کے آستانے پر سر جھکائے نظر آتے ہیں۔

اس انتخاب میں اصناف سخن کا تنوع بھی نظر آتا ہے اور انداز فکر کے مختلف پہلو اور گوشے ہمارے سامنے آتے ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ شعرا کے ادوار کی ذہنی اور شعری فضا اور روایات کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

جناب نور احمد میرٹھی نے انتخاب اور ترتیب و تدوین کے فن کی تمام نزاکتوں اور تقاضوں کو

خوب سمجھا ہے اور بڑے سلیقے سے اپنے ادبی کاموں میں ان کا اظہار کیا ہے۔

یہ تذکرہ اپنے حسن ترتیب اور حسن صورت کی بنا پر ہماری ادبی تاریخ میں یاد رکھا جائے گا۔ ان شاءاللہ

مجھے امید ہے کہ نور احمد میرٹھی صاحب کی تالیفات کا سلسلہ جاری رہے گا۔ تریب و تدوین کی اہمیت کو ہماری ادبی وعلمی دینا میں پوری طرح نہیں سمجھا گیا ہے لیکن نور احمد جیسے اصحاب کی کاوشوں سے اب لوگوں کو ایسے کاموں کے پھیلاؤ اور افادیت کا احساس ہونے لگا ہے۔

(''بہر زماں بہر زباں''، ۲۰۰۶ء)

سیرت کی نثری کتب پر مضامین

ہادیٔ اعظم........ایک تاثر

ایمان کی تکمیل کے لیے محمد عربی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا دنیا کے ہر فرد اور ہر شے سے زیادہ محبوب ہونا شرط ہے اور اس محبت کی شہادت کے طور پر اندازِ زیست، طرزِ حیات، افعال و اقوال کو پیش کیا جاتا ہے۔ خوش نصیب ہیں وہ صاحبانِ فکر و اہل قلم، جن کی فکر کا محور اور جن کے قلم اور فن کا مرکز ذات رسالت مآب ﷺ ہے۔ سید فضل الرحمٰن ایسے ہی خوش بختوں میں شامل ہیں جو اپنے عمل، اپنی زبان اور اپنے قلم کے ذریعے رفع ذکر محمد عربی ﷺ میں مصروف ہیں۔

سرورِ دنیا و دیں کی رسالت کا دامن فردائے قیامت سے بندھا ہوا ہے، اور وقت کی تیز رفتاری اور تلون سے ہم سب واقف ہیں۔ وقت کی ہر موج اور ہر لحہ حضور ﷺ کے کمالات کے کسی نہ کسی پہلو کو اُبھار رہا ہے اور کوئی نہ کوئی گوشہ یوں سامنے آتا ہے جو ماضی سے وابستہ ہونے کے باوجود ماضی کی تکرار نہیں ہوتا۔ اس لیے اس بات پر حیرت کا کوئی سبب نہیں کہ سیرۃ النبی (شبلی نعمانی، سلیمان ندوی) اور رحمۃ للعالمین (سلیمان منصور پوری) کے بعد سیرت مبارکۂ نبوی پر کیسی کیسی کتابیں اردو میں لکھی گئیں۔ سید فضل الرحمٰن کی کتاب سیرت ''ہادیٔ اعظم'' سرکار دو عالم کے حالات، واقعات اور اقوال کا ایسا آئینہ خانہ ہے کہ آنکھیں روشن ہو جاتی ہیں مگر یوں کہ فرطِ نور کے باوجود چکا چوند کا عالم نہیں ہوتا بلکہ ہر نقش، خط نور بن کر ہماری بصارت و بصیرت کو اعتبار بخشتا ہے۔

ہادیٔ اعظم کے ابتدائی پانچ سو صفحات آپ ﷺ کی حیات طیبہ سے عبارت ہیں اور اس طرح کہ اہم واقعات کی تاریخ سازی اُبھر کر سامنے آجاتی ہے۔ آپ ﷺ کی ازواجِ مطہرات اور اولاد کا ذکر مختصر ہونے کے باوجود تمام اہم نکات کا احاطہ کر لیتا ہے۔

کتاب کا دوسرا حصہ آپ ﷺ کے عادات و اخلاق کا احاطہ کرتا ہے۔ اسوۂ حسنہ کا یہ مرقع

احادیثِ نبوی سے مرتب کیا گیا ہے، یوں یہ کتاب مجموعۂ احادیث بھی ہے۔ سیرت کی دوسری کتابوں میں بھی شمائل و عادات و اخلاق کا مآخذ حدیث ہی ہوتی ہے، لیکن سید فضل الرحمٰن نے ابواب و عنوانات مقرر کر کے حوالوں کی حد درجہ احتیاط کے ساتھ یہ حصہ مرتب کیا ہے۔

ارشاداتِ رسول...... کتاب کا یہ جز بھی احادیث کا انتخاب ہے۔ مگر اس میں آپ کے عادات و اخلاق کے تذکرے کے بعد اسلام کے بنیادی عقائد و ارکان و تعلیمات کو پیش کیا گیا ہے۔

ہادیٔ اعظم میں احادیث و تعلیمات نبوی کو اس طرح پیش کر دیا گیا ہے کہ یہ کتاب عام پڑھنے والے کے لیے ذکرِ رسول عربی ﷺ بھی ہے اور آئینہ سنت بھی۔ کتاب کی ترتیب تائید الٰہی کی شہادت دیتی ہے۔

سید فضل الرحمٰن سلمہ اللہ تعالیٰ کی ''ہادیٔ اعظم'' ایک ایسی کتاب ہے جسے رفیق کہنے کو جی چاہتا ہے۔ فرصت کے لمحات میں یہ کتاب محفلِ سرکار دو عالم میں حاضری کا راستہ ہے۔

(''ہادیٔ اعظم''، اکتوبر ۱۹۹۱ء)

نورِ مبین

سیرتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام الفاً الفاً پر تحریر و تقریر کا سلسلہ چودہ صدیوں سے جاری ہے اور ان شا اللہ یوم الدین تک جاری رہے گا۔ ذہنِ مسلم اور قلبِ مومن ہر خوبی، ہر سعادت، ہر تعمیر کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے دیکھتا ہے اور اُس کی قدر کا تعین کرتا ہے۔ یہ زندگی اور یہ کائنات اِس حقیقت کی شاہد ہے کہ:

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو
از کہ از خاکش بروید آرزو
یا زنورِ مصطفیٰ او را بہاست
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰ ست

اور مسلمان کی اِس توفیق اور اُس پر اللہ کے اِس کرم کو تو دیکھیے کہ وہ نورِ مصطفیٰؐ سے روشن بھی ہے اور اُس کی تلاش میں مصروف بھی ہے۔

محبی سید حامد حسن بلگرامی کی کتاب نورِ مبین بھی تلاشِ مصطفیٰؐ کی ایک صورت اور نورِ مصطفیٰؐ کا ایک آئینہ ہے۔ اِس ناچیز تک کسی بزرگ کا یہ قول پہنچا ہے کہ شخصی طور پر نسبتِ محمدیؐ ہی آدمی کو ارتداد سے دور رکھتی ہے۔

حضور علیہ ﷺ کے دابستگانِ دامن کو درگاہِ الٰہی سے مضامین بھی عطا ہوتے ہیں اور اسلوب بھی۔ سید بلگرامی صاحب کی یہ کتاب اِس نکتے کی تفسیر ہے کہ مسلم معاشرہ اور مسلم تاریخ صحابہ کرامؓ، اہلِ بیت، تابعین، تبع تابعین، صلحائے امت اور شہدائے کبار رضی اللہ عنہم اجمعین کے اُس نور سے منور ہے، جو دراصل سرکارِ دوعالم ﷺ کا نورِ نبوت ہے اور یوں قلوبِ منورہ کے وسیلے سے جاری و ساری

رہے گا۔

سید صاحب موصوف کی کتاب خزینۂ عشق ہے۔ اِس کے علاوہ ان کی کتاب سے یہ نکتہ بھی اُبھر کر سامنے آتا ہے کہ مختلف فتنوں کا در سرورِ کائنات کی محبت اور اتباع کے ذریعے ہی بند ہو سکتا ہے۔ ناصبیت بھی ایسا ہی فتنہ ہے۔ میں شکر گزار ہوں کہ سید صاحب نے میری کتاب کے حوالے اپنی تالیفِ لطیف میں شامل کر کے مجھے بھی ذکرِ محمدیؐ کی محفل میں اپنے ساتھ بٹھالیا ہے۔

اللہ تعالیٰ اِس کتاب کے نور کو اِس معاشرے میں عام فرمائے جس میں ظلمتیں مختلف صورتوں میں ہم پر یلغار کر رہی ہیں۔

(''نورِ مبین''، ۱۹۹۲ء)

مسندِ صحابیات

نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ کچھ لوگ اپنی عبادت و ریاضت سے قربِ الٰہی حاصل کرتے ہیں اور کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کو اللہ اپنے لیے منتخب فرما لیتا ہے۔ جمیل نقوی صاحب کا معاملہ کچھ ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ انھیں سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سلسلۂ نسب سے وابستہ کر کے ربِ کریم نے سرفرازی عطا فرمائی اور پھر دلِ گداختہ دے کر حلقۂ عشاق میں شامل فرمایا۔ علم سے بھی انھیں حصۂ وافر عطا کیا گیا اور علم بھی وہ جو اشیا کو اسی طرح دیکھتا اور دکھاتا ہے جیسی وہ ہیں۔

گزشتہ چند برسوں میں وہ علمِ ظنی وقیاساتِ گماں کے دائرے سے نکل کر قرآنِ عظیم اور حدیث صادق و امین ﷺ کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں۔ ایک طرف تو انھوں نے قرآن حکیم کے ایک نسخے کی ترتیب و تکمیل میں عجب انداز سے حصہ لیا، اور دوسری طرف قرآنِ حکیم کے اردو تراجم پر ایک کتاب پیش کی۔ آج کل وہ اردو تفاسیر کے تفصیلی جائزے میں مصروف ہیں۔(۱) اسی کے ساتھ ساتھ مُسندِ علیؓ اور مسندِ عائشہؓ کی ترتیب و تالیف کی سعادت سے انھیں نوازا گیا اور اب وہ مُسند صحابیات کے مؤلف کی حیثیت سے ہمارے سامنے آرہے ہیں۔ اس مُسند میں حضرت صدیقہؓ کی روایت کردہ احادیث شامل نہیں ہیں کیونکہ وہ ایک مستقل اور جداگانہ حیثیت سے پیش کی جارہی ہیں۔

مُسند صحابیات میں باون صحابیات رضی اللہ تعالیٰ علیہن اجمعین کی مروی احادیث شامل کی گئی ہیں۔ ایک ایسے معاشرے میں جہاں پڑھے لکھے افراد کی فہرست نہایت مختصر تھی، باون صحابیات کا راویانِ حدیث میں شامل ہونا خود ایک معجزۂ سرورِ کائنات ﷺ ہے۔ اسلام نے تاریخ عالم میں پہلی بار عورت کی شخصیت کی تمام جہتوں کا ذہنِ انسانی سے اعتراف کرایا اور ہر سعادت و کمال میں

اسے مرد کا شریک بنایا۔ اسلام، عبادت، زہد، علم، جہاد اور سیاست ...... ہر شعبہ میں نسائی ذات کے امکانات کا محافظ اور سمت نُما ہے۔

حضرت اُم عمارہؓ ان چند برگزیدہ ہستیوں میں سے ایک ہیں جو غزوۂ احد میں شمع رسالت کی حفاظت کے لیے حصارِ آہنی بنیں، غزوہ خندق میں حضرت صفیہؓ کا کارنامہ معروف ہے، جنگ یرموک میں حضرتِ اسما بنت ابوبکرؓ، حضرت امِ حکیمؓ، حضرت جویریہؓ اور بعض دوسری صحابیات نے دادِ شجاعت دی۔ بحری معرکوں میں بھی صحابیات نے حصہ لیا۔ اشاعت اسلام میں بھی خواتین کا حصہ ہماری تاریخ کا ایک عنوان جلی اور باب زریں ہے۔ راہ ایمان میں حضرت فاطمہؓ بنت خطاب کی پامردی نے فاروق اعظمؓ کو مجبور کر دیا کہ وہ آستان نبوت پر گردن جھکا کر قبول اسلام کے لیے حاضری دیں۔ حضرت ابوطلحہؓ نے حضرت امِ سلیمؓ کی تبلیغ کے نتیجے میں اسلام قبول کیا۔

جہاد کا تعلق اسلامی ریاست کی بقا سے ہے۔ یوں جہاد کا رشتہ سیاستِ ملیّ سے واضح ہے۔ عورت کے سیاسی اختیارات اس قدر وسیع ہیں کہ وہ دشمنوں کو پناہ دے سکتی ہے اور امام اس کی امان کو برقرار رکھ سکتا ہے۔ سنن ابی داؤد میں لکھا ہے کہ فتح مکہ کے زمانے میں حضرت ام ہانیؓ نے جو حضرت علیؓ کی ہمشیرہ تھیں، ایک مشرک کو پناہ دی تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔ ''تم نے جس کو پناہ یا امان دی ہم نے بھی دی۔''(۲)

زیرِ نظر مُسند سے علم حدیث میں صحابیات کے حصے اور مرتبے کا اندازہ آپ کو ہو سکے گا۔ حضرت عائشہؓ تاریخ فنِ فقہ میں امامت کے درجے پر فائز نظر آتی ہیں اور ان کے اسی مرتبے کے پیش نظر سید جمیل صاحب نے مسند عائشہ الگ مرتب کی ہے۔ ''فن حدیث میں درایت کا بڑا مرتبہ ہے، لیکن حضرت عائشہؓ کو حقیقتاً اس کا مؤسس کہنا چاہیے کیونکہ سب سے پہلے آپ نے اس اصول کو استعمال کیا۔''(۳)

اس مسند میں جو احادیث ہیں وہ ایمانیات، عبادات، آدابِ معاشرت، حدود دریاست (امارۃ) اور حقوق وفرائض ...... سبھی شعبوں کا احاطہ کرتی ہیں۔ عورت کی روایت کا اس سے بڑا اعتبار

اور کیا ہوگا۔ مسند عائشہ کو اسی مُسند کا ایک حصہ سمجھنا چاہیے۔ حضرت عائشہؓ ان صحابہ میں شامل ہیں جو درجۂ اجتہاد رکھتے تھے۔ اور اس حیثیت سے وہ اس قدر بلند ہیں کہ بے تکلف ان کا نام حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، عبداللہ بن مسعودؓ اور عبداللہ بن عباسؓ کے ساتھ لیا جاسکتا ہے۔ وہ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ کے زمانے میں فتوے دیتی تھیں اور اکابر صحابہ پر انھوں نے جو دقیق اعتراضات کیے ہیں ان کو علامہ سیوطی نے ایک رسالے میں جمع کردیا ہے۔''

حضرت عائشہؓ سے ۲۲۱۰ احادیث مروی ہیں، وہ تاریخ عرب، شاعری اور علم الانساب میں درجۂ کمال رکھتی تھیں۔ حضرت عائشہؓ کے بعد امہات المومنین میں علمی طور پر حضرت ام سلمیٰؓ کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ محمود بن لبید کے الفاظ میں ''آنحضرت ﷺ کی ازواج احادیث کا مخزن تھیں، تاہم عائشہؓ اور ام سلمہؓ کا ان میں کوئی حریف اور مقابل نہ تھا۔''(۴)

حضرت ام سلمیٰؓ سے ۳۷۸ حدیثیں مروی ہیں اور وہ ''محدثین صحابہ کے تیسرے طبقے میں شامل ہیں'' وہ نہایت معتبر فقیہہ تھیں اور ان کے فتاویٰ پر سبھی کا اتفاق ہے۔ حضرت عبدالرحمان بن ابی بکرؓ، حضرت اُسامہ بن سعیدؓ، مصعب بن عبداللہ، عبداللہ بن رافعؓ جیسے اکابر، علم حدیث میں ان کے شاگرد ہیں۔

اُمہات المؤمنینؓ سے مروی احادیث کی تعداد، بنات النبی ﷺ سے روایت کی ہوئی احادیث سے کہیں زیادہ ہے اور صاجزادیوں میں غالباً صرف حضرت فاطمہؓ ہی محدثہ ہیں۔ اس کا سبب واضح ہے۔ یہ ازواج کا حق اور فرض تھا کہ وہ اسلام کی ''آدھی دنیا'' یعنی خواتین کے بارے میں احادیث بیان کریں کیونکہ وہ حضور ﷺ کی خلوت وجلوت کی امین تھیں اور رسول اکرم ﷺ سے ان کا رشتہ اور تعلق انسانی معاملات وجذبات کے تمام پہلوؤں پر محیط تھا۔

امہات المومنین اور بنات النبی ﷺ کے بعد ان خواتین کو حضور ﷺ سے فیض حاصل کرنے کا زیادہ موقع ملا جو آپ کی قرابت دار تھیں، مثلاً حضرت صفیہ بنتِ عبدالمطلب۔ یہ حضور ﷺ کی پھوپھی اور خالہ زاد بہن تھیں۔ ان کی شرکتِ جہاد خواتین کی ذمے داریوں اور اسلامی معاشرے

میں ان کی بلند حیثیت کی ایک دلیل ہے۔ حضرت امِ ایمن کو حضور ﷺ نے اپنی ماں کہا اور سمجھا، ان سے بھی چند احادیث مروی ہیں۔ دوسری صحابیات سے روایت کردہ احادیث بھی اس مجموعے میں ملاحظہ کریں گے۔

اس مُسند سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ حقیقی اسلامی معاشرت میں عورت پر کوئی ایسی قدغن نہیں لگائی جاتی جو اس کی ذات کی نمو اور ارتقا کو مجروح کر سکے۔ پھر اسلامی معاشرے میں عفت و عصمت، دل و نگاہ کی پاس داری اور زبان کی حفاظت کے تمام آداب کے ساتھ ساتھ زندگی کے کسی بھی شعبے کے کسی بھی اہم مسئلے کے اظہار پر کوئی پابندی نہیں۔ جنسی زندگی کے معاملات بھی اُمہات المؤمنینؓ اور صحابیات نے بیان فرمائے اور اسی کے ساتھ ساتھ نسوانی معاملات بھی۔ یہ سب کچھ یوں کیا گیا کہ صرف علم کو سر بلندی اور سرفرازی نصیب ہو اور ان باتوں سے لذت صرف بیمار اور مریض ذہنوں کو مل سکتی ہے۔ زندگی کے ایسے پہلوؤں سے متعلق احادیث کے پیشِ نظر یہ بات کہنے کو جی چاہتا ہے کہ ہماری بہت سی خود ساختہ پابندیوں نے شرم و حیا کا جو معیار آج قائم کیا ہے اس کا اسلام سے کوئی واسطہ نہیں۔ ہیولاک ایلس نے بھی یہ اعتراف کیا ہے کہ بانیانِ مذاہب میں صرف محمد عربی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جنسی معاملات کو انسانی رفعتوں اور معاشرتی تقاضوں سے ہم آہنگ کیا ہے۔

اس مجموعے کی احادیث کے مطالعے سے یہ بات بھی ذہن میں آئی کہ احادیث کی تفسیر و شرح کی بھی آج ضرورت ہے۔ مثلاً نماز کی سنتوں کے فضائل کے باب میں اُم المؤمنین حضرت ام حبیبہؓ کی حدیث کے الفاظ یہ ہیں کہ ''چار رکعتیں ظہر سے پہلے، دو رکعتیں ظہر کے بعد، دو رکعتیں مغرب کے بعد، دو رکعتیں عشا کے بعد اور دو رکعتیں نماز فجر سے پہلے۔'' اس حدیث میں ظہر سے مراد، ظہر کی فرض رکعتیں، مغرب سے مراد مغرب کی فرض رکعتیں، عشا سے مراد عشا کی فرض رکعتیں اور نماز فجر سے مراد فجر کی فرض رکعتیں۔ نماز کا لفظ فرض نماز کے لیے استعمال ہوا ہے۔

اسی طرح بعض احادیث کے سمجھنے کے لیے موضوع (باب الحدیث) سے ان کا تعلق سمجھنا

ضروری ہے۔ اردو کے ایک اچھے شاعر، معقول نقاد اور غالب کے خاصے معتبر شارح، جمیل نقوی صاحب کی مسند صحابیات کے مسودے پر نظر ڈال رہے تھے کہ حضرت اُم حرامؓ کی اس حدیث پر رکے کہ ”دریا کے سفر میں اگر سر گھومنے سے قے ہوجائے تو اس کو ایک شہید کا ثواب ملتا ہے۔“ اس پر انھوں نے فرمایا کہ یہ نہایت...... معقول حدیث ہے۔ میں اسے تسلیم نہیں کرتا (نعوذ باللہ) عجب بات یہ ہے کہ یہ صاحب غالب کے اشعار میں بین السطور اور لفظوں کے پیچھے معانی کی تلاش کرتے ہیں، استعاروں کے پردوں کو پلٹتے ہیں، لیکن ایک حدیث کے بارے میں کسی سعی و کاوش کے قائل نہیں اور نہ علم حدیث سے انھیں کوئی واقفیت ہے۔

یہ ابوداؤد کی حدیث ہے۔ اس کا عنوان جہاد ہے۔ گویا ہمارے سامنے یہ بات آئی کہ دریا کا یہ سفر جہاد کے سلسلے میں ہے۔ جہاد کا سفر ویسے بھی شہادت کا سفر ہوتا ہے۔ آدمی اپنی جان کی قیمت پر اپنے عقیدے پر گواہی دینے کے لیے گھر سے باہر نکلتا ہے۔ پھر بحری جہاد میں عربوں کے لیے خطرات زیادہ ہوتے تھے کیونکہ وہ سمندری سفر کے عادی نہ تھے۔ رہی بات دورانِ سر کی، سو جو صاحبان اِس تجربے سے گزرے ہیں وہ شہادت دیں گے کہ دوران سر سے متلی کے وقت یوں محسوس ہوتا ہے جیسے بدن کے روئیں روئیں سے جان کھنچ رہی ہو۔ پھر اصولِ حدیث کے طالب علم جانتے ہیں کہ جو احادیث، احکام، حدود، نصاب اور تعزیر سے تعلق رکھتی ہیں ان کی جرح اور تعدیل میں سختی سے کام لیا جاتا ہے۔ سلسلۂ روایت اور راوی کے مرتبے کو پرکھا جاتا ہے اور درایت و مطابقتِ حدیث و قرآن سے کام لیا جاتا ہے لیکن نیکی پر اکسانے اور آمادہ کرنے والی احادیث میں اس درجہ سختی نہیں برتی جاتی۔ علاوہ ازیں احادیث کے درجے قائم ہیں اور صحت کے اعتبار سے ان کے مختلف اصطلاحی نام ہیں۔ ضعیف حدیث قوی اور صحیح حدیث کے مقابلے میں کم تر سہی، لیکن یہ بات ہرگز لازم نہیں آتی کہ اسے وضعی سمجھا جائے۔

مجھے یقین ہے کہ ان شاء اللہ اس مسند کے مطالعے سے قارئین کو فیض پہنچے گا۔ حدیث کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ بات ذہن میں ہمیشہ رہے کہ جیسے ہم نبی کریم ﷺ کی محفل میں حاضر ہیں۔

باوضو ہو کر ادب سے مطالعۂ حدیث کیا جائے۔ پھر حدیث کا مطالعہ محض ایک علمی کاوش نہیں، یہ تو ایمان میں اضافے کا وسیلہ ہے۔

اس مسند کے آخر میں صحابیات کا مختصر تذکرہ بھی جناب جمیل نقوی نے شامل کر دیا ہے۔ یہ تذکرہ بہت مفید ہے اور اسے بیشتر پڑھنے والوں کے علم میں یقیناً اضافہ ہوگا۔

دعا ہے کہ خدائے محمد ﷺ جمیل نقوی صاحب کی اس کاوش کو قبول فرمائے اور حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں یہ ارمغان قبول ہو۔

(مقدمہ "مسند صحابیات"، ۱۹۹۳ء)

حواشی

۱۔ تفاسیر کا یہ جائزہ ۱۹۹۲ء میں مقتدرہ قومی زبان نے شائع کر دیا ہے۔

۲۔ سعید انصاری، سیر الصحابیات، صفحہ ۱۹ نیشنل بک فاؤنڈیشن پاکستان، ۱۹۷۳ء

۳۔ نیاز فتح پوری، صحابیات صفحہ ۲۲ اور ۲۳ نفیس اکیڈمی، کراچی، ۱۹۶۲ء

۴۔ سعید انصاری، سیر الصحابیات، ص ۲۹

سیرت احمد مجتبیٰ ﷺ
کے مولف کا سفر، زماں و مکاں میں

جناب شاہ مصباح الدین شکیل کی سیرت احمد مجتبیٰ ﷺ کو جو قبول عام حاصل ہوا، وہ راقم الحروف کے نزدیک بارگاہ رب محمد عربی ﷺ اور دربار نبوت میں مقبولیت کا ایک اشارہ ہے۔ اللہ کی رضا کے بغیر کوئی نتیجہ مرتب نہیں ہوتا اور درگاہ نبوی میں عقیدت کے وہی پھول منتخب کیے جاتے ہیں جن میں اخلاص کی بو ہو۔

مصباح الدین شکیل صاحب ۱۳۹۳ھ (۱۹۷۹ء) سے ذکر سرور کائنات ﷺ کی دنیا میں اپنے شب و روز گزارے ہیں۔ اس دنیا کی شہریت انھیں حاصل ہے اور وہ ان لوگوں میں شامل ہیں جو مولانا ظفر علی خان کے یہ الفاظ دہرا سکتے ہیں۔

ہم جس میں بس رہے ہیں وہ دنیا تمھی تو ہو

ذرا اس سعادت پر غور کیجیے کہ ایسی کاوش اور سعی محبت کے ساتھ وہ ایک صدی ہجری سے دوسری ہجری صدی میں داخل ہو گئے۔ دعا ہے کہ وہ باکرامت زندہ رہیں اور اپنی سعادتوں میں اضافہ کرتے ہوئے اکیسویں صدی عیسوی میں بھی ذکر احمد مجتبیٰ ﷺ کی شمعیں روشن کریں۔ اپنے اس کارنامے کے ساتھ ساتھ محب گرامی مصباح الدین شکیل صاحب نے ''سیرت النبی الم'' کی پیش کش کے ذریعہ ہمارے اور آنے والی نسلوں کے لیے حضور علیہ الصلوٰۃ السلام کے نقوش حیات، مقامات سفر اور سیرت کو کس اختصار، جدت اور سلیقہ کے ساتھ پیش کیا ہے۔ جب فخر موجودات اور صاحب کوثرؐ کی حیات اور سیرت قیامت تک اہل ایمان کے لیے مکمل اور بہترین نمونہ قرار دی گئی تو یہ کیسے ممکن تھا کہ اس اسوۂ حسنہ کو ہر دور کے مزاج، ہر زمانے کے مذاق اور ہر عہد کے محاورے کے

کی دل آویزی، سلیقۂ ترتیب کے سہارے سفر ممکن نہیں ہے۔ سیرت نگاری کی شرط اول حُبِّ رسول کریم ﷺ ہے۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے سیرت نگار کی افتادِ طبع اور مزاج ایسا ہو کہ وہ ذات محمدی کی دنیا کا شہری بن سکے۔ اس محبت اور عقیدت کے ساتھ ساتھ اس کی طبیعت میں سلامت روی کے ساتھ ذوق تحقیق ہو۔ یوں ہر سیرت نگار کے زاویۂ نظر اور موضوع سے نئے نتائج سامنے آتے ہیں۔ سیرت نگار کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ مطبوعہ مواد اور بالخصوص اوّلین مصادر و منابع کا امکان بھر مطالعہ کرے۔ اوّلین کتب سیرت کے بڑے حصہ کا اردو میں ترجمہ بھی ہو چکا ہے، اسی لیے ان تک رسائی ان سیرت نگاروں کے لیے ممکن ہوگئی ہے جو عربی زبان پر دسترس نہیں رکھتے۔

پھر سیرت نگار کا اسلوب تحریر ایسا ہو جو عامی اور عالم دونوں کے ذوق کی تسکین کر سکے۔ یہ بات کلام اللہ اور احادیثِ نبوی کے مطالعے سے پیدا ہو سکتی ہے۔ اللہ کا کلام تو خیر معجزہ ہی ہے، اس ربّ العزت نے اپنے رسول ﷺ کے اقوال کو بھی اختصار، وضاحت، بلاغت اور دلوں میں گھر کر لینے کی صلاحیت یوں بخشی ہے کہ حدیث بھی آپ ﷺ کا معجزہ بن گئی ہے۔ حضور نبی کریم ﷺ نے اپنی فصاحت کا خود بھی ذکر فرمایا ہے۔ آپؐ فصیح ترین انسان تھے اور آپؐ کے جوامع الکلم تو معانی کا قطرہ نما سمندر ہیں جو شخص آپ کی ذات عالیہ سے جس قدر قربت حاصل کرے گا اس کی عادات و اطوار، نشست و برخاست، کلام اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں اسی قدر آپ کی ذات کا رنگ جھلکے گا۔

آپ کی زندگی کا مطالعہ کرنے والا اپنے آپ کو ذہنی طور پر عہد رسالت مآب ﷺ میں موجود پاتا ہے اور احادیث کے مطالعہ کے سلسلے میں یہ بات معروف ہے کہ حدیث کی کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے یا حدیث کی کسی محفل میں شرکت کرتے ہوئے ہمیں اپنے آپ پر ایسی کیفیت طاری کرنی چاہیے جیسے ہم مونس روح و جاں، ہادی آخرالزماں ﷺ کی مجلس میں بیٹھے ہیں۔

اب آپ ان معروضات کی روشنی میں سیرت النبیؐ، (مولانا شبلیؒ و سلیمان ندویؒ) رحمۃ للعالمین (قاضی سلیمان سلمان منصور پوریؒ) اور نبیؐ رحمت (مولانا سید ابوالحسن ندوی) کا مطالعہ فرمائیں تو ان مصنفین کا یہی ذوق حضوری ان کے اسلوب میں ملے گا۔ اس اسلوب کے اعتبار

اللہ جل جلالہ کی غیرت اس بات کو کیسے قبول کر لیتی کہ حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ ﷺ کے والد گرامی کے نام میں اس کے سوا کسی اور کی نسبت موجود ہوتی۔

اردو میں سیرت کی کم ہی کتابوں میں اسلام کے شہید اوّل حضرت حارثؓ ابن ابی ہالہ کا ذکر نظر آئے گا۔

"تبلیغ اسلام کے ابتدائی برسوں میں ایک دن خاتم النبیین ﷺ نے حرم کعبہ میں اعلان توحید فرمایا۔ کفار قریش کے نزدیک یہ حرم کی توہین تھی۔ ہر طرف سے پل پڑے۔ ایک ہنگامۂ آہ و بکا برپا ہو گیا۔ اہل ایمان کو اطلاع ہوئی تو دوڑے آئے۔ ان ہی میں حضرت حارثؓ ابن ابی ہالہ (حضرت خدیجہؓ کے پہلے شوہر کے بیٹے) بھی تھے۔ شمع رسالت کو بچانے کے لیے پروانہ وار ٹوٹ پڑے۔ ہر طرف سے تلواریں پڑیں۔ جاں نثار نقد جاں ہار گیا۔ حرم کعبہ میں حق و باطل کی پہلی آویزش میں کسی حق پرست کا یہ اولین نذرانۂ جان و تن تھا۔" (ج ۱، ص ۳۸۸)

ذرا نبی کریم ﷺ کی صداقت اور آپؐ کی شخصیت کی کشش و جاذبیت کی اس شہادت کو دیکھیے کہ "سوتیلے بیٹے نے کس طرح آپؐ کے وجود کو اپنی جان پر فوقیت دی۔ زیدؓ و حارثؓ آپ کی عمیق محبت کی ہمیشہ قائم رہنے والی مثالوں کے طور پر یاد رہیں گے۔

مصباح الدین شکیل صاحب نے کئی مقامات پر ایسے ہی بے حد اہم نکتے بلا تصریح درج کر دیے ہیں اور یوں کہ پڑھنے والا مطبوعہ نتائج تک خود پہنچ جائے۔ بنات النبی کے حق میں قرآن حکیم کی شہادت موجود ہے، اب ذرا حضرت فاطمہؓ کے حوالے سے شاہ صاحب کا یہ جملہ ملاحظہ ہو۔

"آپؓ (فاطمہ) نے اپنی بیٹیوں کے نام اپنی بہنوں کے نام پر رکھے۔" (ج ۱، ص ۲۴۱)

حضرت زینبؓ اور حضرت ام کلثومؓ، جناب فاطمہؓ کی حقیقی بہنیں تھیں اور یہی آپ کی صاحبزادیوں کے نام تھے۔

سیرت احمد مجتبیٰ ﷺ میں ابواب بہت طویل نہیں ہیں۔ مختصر ابواب، کتاب کی قرأت کو قاری کے لیے آسان بنا دیتے ہیں۔ جلد اول (پہلے ایڈیشن) میں ۴۹۲ صفحات پچیس ابواب پر

مشتمل ہیں۔ جلد دوم میں ۵۳۱ صفحات ،۲۸ ابواب اور جلد سوم میں ۸۳۲ صفحات اور ۳۲ ابواب ہیں۔اسی کے ساتھ ساتھ ہر باب کئی ذیلی ابواب پر مشتمل ہے۔شاہ صاحب نے موضوع سے پیوستہ اور ہم آہنگ مصرعوں، ترکیبوں اور ٹکڑوں کو عنوان بنایا ہے اور یوں ہر عنوان ایک ذیلی باب بن گیا ہے۔اب یہ اسلوب عام ہوتا جارہا ہے اور یہ شاہ صاحب کی مقبولیت اور اس اسلوب کی دل آویزی کا ثبوت ہے۔اس سے پڑھنے والے کو راحت اور تغیر لطیف (Relief) حاصل ہوتا ہے اور موضوع کے مختلف مضامین آسانی سے ذہن نشین ہو جاتے ہیں۔چند نمونے ملاحظہ ہوں:

بیت اللہ کے تعارف کے سلسلہ میں

بیت اللہ۔خلیلؑ ایک معمار تھا جس بناء کا (ج ا،ص ۷۸)

عرب کی بت پرستی کے سلسلہ میں

قبیلہ قبیلہ کا بت اک جُدا تھا (ج ا،ص ۹۳)

پہلی وحی الٰہی اقراء کے سلسلہ میں

یہ پہلا سبق تھا کتابِ ہدیٰ کا (ج ا،ص ۳۱۸)

پہلے مسلمانوں پر مظالم کے بیان کے سلسلہ میں

......دارورسن کی آزمائش ہے (ج ا،ص ۴۲۱)

طائف کے ذکر میں

زخموں سے لہو گر کے قدم چوم رہا ہے (ج ا،ص ۵۸۸)

نبی اکرم ﷺ کی اونٹنی کے سلسلہ میں (کہاں بیٹھے گی؟)

چلی بھی جا جرس غنچہ کی صدا پہ نسیم (ج ۲،ص ۳۷)

درس گاہِ صفہ کے وابستگان کے لیے

سینے علم کے گنجینے (ج ۲،ص ۱۰۴)

اذان کے آغاز اور کلماتِ اذان کے سلسلہ میں

ہوتا رہے گا ذکرِ محمد ﷺ خدا کے ساتھ (ج ۲،ص ۲۲۱)

میرا خیال ہے کہ ان مثالوں سے شاہ مصباح الدین شکیل کے ادبی اسلوب اور ذوق شعری کے ساتھ اپنے موضوع کی گہرائیوں کو پالینے کی صلاحیت کا بھی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔اس کتاب کا مطالعہ وقت میں سفر کی فضا تعمیر کرتا ہے اور پڑھنے والا اپنے آپ کو تاریخ اور وقت کا ایسا مسافر خیال کرنے لگتا ہے جو مسافتوں کو پاٹتا ہوا اور زمان ومکاں میں سفر کرتا ہوا ایسے دیار میں پہنچ گیا ہو جہاں ذرّے ہیروں کی طرح چمک رہے ہیں، جہاں راستے کسی کی خوشبو سے معطر ہیں۔کوئی ابھی تو ان راہوں سے گزرا ہے۔ذات رسالت مآب ﷺ نے رنگ ونسل کی زنجیریں کاٹ دیں، اور توحید الٰہی کی اساس محکم پر وحدت انسانی کی عمارت عظیم بلند کی لیکن صد حیف کہ آج اسی کے نام پر تفریق ملت کا کاروبار ہو رہا ہے۔

شاہ مصباح الدین شکیل صاحب نے پوری کتاب میں ہر جگہ تمام روایتوں کے ساتھ انصاف کیا ہے اور کہیں شخصی ترجیحات سے کام لیتے ہوئے کسی مناسب اور مروّجہ روایت کے ساتھ ظلم نہیں کیا۔مثال کے طور پر نبی اکرم ﷺ کی تاریخ ولادت باسعادت کے سلسلہ میں تمام روایات درج کردی گئی ہیں۔اسی طرح نکاح کے وقت حضرت خدیجۃ الکبریٰ کی عمر کے مسئلہ کو نزاعی مسئلہ نہیں بننے دیا گیا۔وجہ یہ ہے کہ شاہ صاحب ایسی باتوں کو غبار راہ بنا کر نقوش سیرت کو دھندلا بنانے کے قائل نہیں۔یہ سلامت روی بھی سیرت کے اثرات کا ایک نقش ہے۔

اللہ تعالیٰ انھیں یوں ہی نشۂ توحید و رسالت کی سرمستیاں عطا کرتا رہے اور رقص قلم وذات جاری رہے۔

یہ چند سطریں حضور ﷺ کے ایک سیرت نگار کے اکرام میں لکھی گئی ہیں جن سے اس کی توقیر میں کوئی اضافہ نہیں ہوا لیکن اس لکھنے والے کو اس تذکرۂ فخر آدم و عالم ﷺ کے صفحات میں ضرور جگہ مل گئی ہے۔میرے رب نے مجھے کس کس طرح سے نوازا ہے اور کس کے طفیل؟ میں اپنے مقدر پر کیوں نہ نازاں ہوں؟ (۱۹۹۶ء)

تیرا وجود الکتاب

جناب پروفیسر محمد اقبال جاوید اردو کے ایک مستند اور صاحب نظر ادبی نقاد ہیں، بالخصوص اردو شاعری پر وہ جو کچھ لکھتے ہیں اُس میں بصیرت کے ساتھ توازن بھی ہوتا ہے۔ اردو کے دس عظیم شاعر، اس کی مثال ہے۔

انھوں نے اپنی صلاحیتیں بڑی حد تک دین اور دینی ادب کے لیے وقف کردی ہیں۔ تیرا وجود الکتاب اولیائے کرام رحمہ اللہ علیہم کی نعتیہ شاعری کا ایک تنقیدی جائزہ ہے۔ ان شعرا میں فارسی اور اردو کے چودہ نعت گو صوفی شامل ہیں۔ ان میں سے کچھ تو ولی اللہ اور ارباب طریقت کے طور پر معروف ہیں۔ حضرت عبدالقادر جیلانیؒ، خواجہ معین الدین چشتیؒ، حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ، حضرت بوعلی قلندرؒ، حضرت امداد اللہ مہاجر مکیؒ، حضرت مہر علی شاہؒ، حضرت خواجہ محمد یار اور کچھ وہ ہیں جنھوں نے ادبیات کی تاریخ میں اپنا نقش دوام قائم کیا ہے اور وقت کی موجِ رواں پر اپنا نام تحریر کیا ہے۔ حضرت احمد جام زندہ پیر، شیخ سعدی، رومی، مولانا جامی، مولانا احمد رضا خاں، قاضی محمد سلیمان منصور پوری، بیدم شاہ وارثی رحمہ اللہ۔

پروفیسر محمد جاوید اقبال کی تنقید میں علمی شعور، تاریخ کا زندہ احساس اور ذوقِ لطیف کی وہ نمود ہے جس کے بغیر ادبی تنقید وجود میں نہیں آسکتی۔ ان کی تنقید کو مجموعی طور پر تاثراتی اور جمالیاتی کہا جاسکتا ہے اور اس کو ان کے دینی مطالعے نے گہرائی بخشی ہے۔

پروفیسر جاوید اقبال صاحب کے اسلوب میں تخلیقی شان ہے جو اُن کی تنقید کو بھی تخلیق کی سطح پر پہنچا دیتی ہے۔ تیرا وجود الکتاب کے صفحات میں ان کے خوبصورت اسلوب کے جلوے ہر جگہ موجود ہیں۔ ایک مختصر اقتباس نمونے کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔

الوہی تعلیمات ہمیشہ گردش وقت پر خندہ زن رہا کرتی ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آفتابِ رسالت ہیں۔ آپ ﷺ کی آمد سے افقِ نبوت کے تمام ستارے چمک اٹھے ہیں اور نہ اس آفتاب کو غروب ہے اور نہ ان ستاروں کے مقدر میں تنک تانی۔

یہ چند جملے گہری معنویت بھی رکھتے ہیں۔ آفتاب تو ستاروں کو کھا جاتا ہے لیکن آفتابِ محمدی ﷺ نے کردار اور سیرت کے ستاروں کو نئی چمک دی ہے۔ یہ انداز کتاب میں عام ہے۔

اگر پروفیسر صاحب نے ماضی قریب کے کچھ اور بزرگوں اور اہل اللہ کو شامل کر لیا ہوتا تو مناسب ہوتا۔ حضرت آسی غازی پوری، مولانا اشرف علی تھانوی، خواجہ عزیز الحسن مجذوب، حضرت اصغر گونڈوی، مولانا محمد احمد پھول پوری، حضرت مولانا سیّد زوّار حسین شاہ، علامہ سید سلیمان ندوی اور مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ علیہم (اس فہرست میں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ نام تو مجھے ان سطور کی تحریر کے وقت یاد آ گئے۔)

(ششماہی ''السیرۃ'' شمارہ ۶، نومبر ۲۰۰۱ء)

فرہنگ سیرت

ایک دنیائے محبت و علم

حُب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سید فضل الرحمٰن صاحب کے لیے سرمایۂ ایمان بھی ہے۔ اور میراث پدر بھی۔ پھر نسبی طور پر یہ محبت اُن کے خون میں شامل ہے۔

سید فضل الرحمٰن سلمہٗ کی کتاب ہادی اعظمؐ، سیرت وحیاتِ محمدی کا ایک آئینہ خانہ ہے۔ اس کتاب کی تالیف کے لیے انھوں نے حدیث، تفاسیر اور اسلامی تاریخ کی اولین کتابوں کا مطالعہ کیا۔ اُن کے حافظے اور قوتِ اخذ کا کرشمہ ہے کہ ہادیٔ اعظم میں ایسی معلومات ہیں جو عام طور پر سیرت کی کتابوں میں نہیں ملتیں۔

نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ گرامی فضل الرحمٰن صاحب کی زندگی، فکر اور علم کا مرکزی نقطہ ہے۔ وہ اسی نقطے کے گرد دائرے بناتے جا رہے ہیں۔ ذاتِ رسولِ عربی ﷺ اُن کا بنیادی حوالہ ہے۔ وہ حیات و کائنات کو اسی حوالے سے دیکھتے ہیں، اور اس کی دستاویز فرہنگِ سیرت ہے۔

آپ ﷺ کے نام میں ہر لفظ کا مفہوم ملے
میرے سرکار ہیں ہر دور کی زندہ فرہنگ

وصل باللہ، مخلوق کی قربت، انسانیت کے لیے غم خواری، امانت، صداقت، بے غرضی، سخاوت، شجاعت، حُسنِ خُلق، عبادت، عدل و انصاف، حسن معاملہ، ایثار، تحمل، شرم و حیا، مساوات، شفقت، عفو و درگزر، رحم، ایفائے عہد، غرض ہر سعادت اور نیکی اسمِ محمد ﷺ سے عبارت ہے۔ ایسے رسول اور ایسے انسان سے جب آدمی عہد وفا استوار کرلیتا ہے تو وہ ہر رشتے، ہر تعلق، ہر انسان اور ہر

مقام کے حوالے سے انھیں کو تلاش کرتا ہے۔

حضور ﷺ کی نسبت سے ہمیں افراد، مقامات، علوم اور مختلف چیزیں عزیز ہوتی ہیں یا انہیں ہم بغض کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ہر چیز سے ہمارے تعلق کی بنیاد حضور ﷺ کی ذات ہے۔ مکہ کی گلیوں سے گزرتے ہوئے آج بھی ہمیں وہ مظالم یاد آتے ہیں جو قریش نے آپ پر اور جماعتِ مومنین پر توڑے تھے۔ آج بھی ایسے لوگ اس اُمت میں موجود ہیں جو رسولِ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی خون میں ڈوبی ہوئی پاپوش کے تصور سے اپنے آپ میں سفر طائف کی ہمت نہیں پاتے۔ اس تعلق کے باوجود ہمارے معاشرے میں علم اتنا کم ہو گیا ہے اور کم ہوتا جا رہا ہے کہ ہم آپ ﷺ سے متعلق تمام باتوں کا علم نہیں رکھتے یا وہ باتیں ہمارے حافظے میں اس طرح محفوظ نہیں کہ وقت پر یاد آ سکیں، حضور ﷺ کن وادیوں سے گزرے۔ کن پہاڑوں کو عبور کیا، کن کنوؤں اور چشموں سے پانی پیا، کن دور دراز کے مقامات تک سفر کیا۔ ہمیں اس کی خبر نہیں۔ سید فضل الرحمٰن صاحب نے یہ سب کچھ فرہنگ سیرت میں بڑی تحقیق اور تجسس سے جمع کر دیا ہے۔ اِس کتاب میں تین ہزار سے زیادہ اندراجات اور تیس نقشے ہیں۔ اِن نقشوں کی ماہیت میں بھی تنوع ہے۔ مغازی کے نقشے، سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کے اسفار کے نقشے، اوطان انبیائے کرام کے حوالے سے نقشے۔

محبت وہ اسمِ اعظم ہے جس سے بند دروازے کھل جاتے ہیں۔ رسولِ آخر الزماں ﷺ سے تعلق نے فضل الرحمٰن سلمہٗ کے راستوں کو ہموا کیا ہے۔ محبت اور تعلق کے علاوہ ایک اور حقیقت سے بھی اِس تازہ کاری کا رشتہ ہے اور وہ یہ ہے کہ آپ کی رسالت کا دامن دامانِ قیامت سے بندھا ہوا ہے۔ آپ ﷺ آنے والے ہر دور کے نبی ہیں اور ہر دور کے تقاضوں کے مطابق آپ کی حیات، سیرت اور نوبت کے لیے پہلو گردشِ لیل ونہار سے اُبھر کر سامنے آتے رہیں گے۔ خوش قسمت ہیں اور ہوں گے وہ لکھنے والے، جنھیں ان پہلوؤں کی پیش کش کے لیے منتخب کیا گیا ہے اور کیا جائے گا۔ ویسے بھی اس بات میں صداقت ہے کہ

راہِ مضمون تازہ بند نہیں

تا قیامت کھلا ہے بابِ سخن

آیئے ذرا مختلف پہلوؤں سے اس کاوش کا سرسری جائزہ لیں، افراد اور شخصیات کا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق مختلف پہلو رکھتا ہے، ان میں آپ کے رفقا بھی شامل ہیں، آپ کے مخالف بھی ہیں، آپ کے اہلِ خانہ بھی ہیں، آپ کے غلام بھی ہیں، پھر آپ کے خاندانی سلسلے کے بزرگ ہیں۔ عربوں میں کنیت کا رواج عام تھا، اور اس اعتبار سے بہت سی شخصیتوں کی کنیتیں ہمارے سامنے نہیں آئیں، حقیقی کنیتوں کے علاوہ خطابی کنیتیں خصائصی کنیتیں بھی عام تھیں، مثلاً نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ابوتراب کہنا، پھر اس پر اس بات کا اضافہ کیجیے کہ بہت سے صحابہ کرام کا جو نام مشہور ہے وہ ان کا حقیقی نام نہیں ہے، اس کے علاوہ بعض شخصیتوں کے فضائل ہماری نگاہ میں نہیں ہیں، مؤلف نے ان سب پہلوؤں کے پیش نظر جو فہرست پیش کی ہے، وہ اسم الرجال کا ایک نیا گوشہ ہے، ان افراد میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلق کی وجہ سے بعد میں آنے والوں کے نام بھی شامل ہیں، مثلاً محدثین گرامی کے نام، اس فہرست میں امام مالک، ابن ماجہ، ترمذی اور نسائی بھی شامل ہیں۔ ہم میں سے کتنے لوگوں کے ذہن میں یہ بات تازہ ہوگی کہ ابوالحرث جناب عبدالمطلب کی کنیت تھی، اسی طرح کم سے کم میرے لیے یہ بات انکشاف کا درجہ رکھتی ہے کہ بحیرہ راہب کا نام جرجیس تھا، کئی ناموں کے علم سے یا ان کے بارے میں اطلاع سے مجھے ذاتی طور پر ایک مسرت کا احساس ہوا، حضرت ام حبیبہؓ کا اصل نام رملہ تھا، جو ذہنوں سے فراموش ہو گیا اور جسے مؤلف کے مطالعے اور کاوش نے تازہ کر دیا، لبابہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی بیوی تھیں اور انھیں یہ شرف حاصل ہے کہ ام المومنین حضرت خدیجہؓ کے بعد اسلام لانے والی دوسری خاتون ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے غلاموں کو بھی ان سے نسبت نے حیاتِ دوام عطا کر دی ہے، ابو کبشہ حضرت سُلیم کی کنیت تھی، مختصر یہ کہ اس فرہنگ سیرت میں کتنے ہی نام ایسے ہیں، جن کے علم سے

رسول اللہ ﷺ سے ہمارے تعلق میں وسعت و گہرائی پیدا ہوتی ہے۔

اس فہرست میں انسان ہی نہیں بلکہ فرشتے بھی شامل ہیں، چار مشہور فرشتوں کے علاوہ کسی کا نام یا لقب ہمارے ذہنوں میں نہیں رہا۔ یہ مؤلف کی دیدہ وری اور تعلق بالرسول ﷺ کی ایک شہادت ہے کہ انھوں نے ایک ایسے فرشتے کا نام بھی اس فہرست میں شامل کرلیا ہے جو ہم میں سے ہر ایک کے علم میں ہے، لیکن ہم اسے چنداں لائق التفات نہیں سمجھتے اور آسانی سے اس نام سے گزر جاتے ہیں، میری مراد ملک الجبال سے ہے، جس کا طائف کے واقعے میں حضور ﷺ کی خدمت میں حاضری کا ذکر سیرت کی ہر کتاب میں ملتا ہے۔ اپنے وسیع مطالعے کے دوران مؤلف نے بڑے منظم انداز میں ان ناموں کو یادداشت اور کاغذ کی لڑی میں پرو دیا ہے۔

مقاماتِ حیات نبی ﷺ سے آگہی اس فرہنگ کی بدولت نئے انداز میں ہمارے حافظے اور یاد کا حصہ بنتی ہے، ان مقامات میں بستیاں بھی ہیں، پہاڑ بھی، وادیاں بھی ہیں، سفرِ ہجرت، سفر تجارت اور غزووں کے سفروں کے مقامات بھی ہیں، ان مقامات سے پہاڑوں کے سلسلے میں یہ بات ہمارے سامنے آتی ہے کہ عربوں کو کسی سلسلۂ کوہ کے مختلف پہاڑوں اور پہاڑیوں کے نام رکھنے کا ذوق تھا، یہ بات ہر زبان کے مزاج میں شامل ہے، مثلاً: کوہ ہمالہ کی مختلف چوٹیوں اور پہاڑوں کے نام ایورسٹ، قراقرم، کے ٹو، ہندوکش وغیرہ لیکن کسی پہاڑ کے نہایت قریبی حصوں کا نام رکھنا عربوں ہی کی خصوصیت تھی، مثلاً: جبلِ احد کے نہایت قریب اس کے ایک حصے کو عرب جبل رماۃ کے نام سے یاد کرتے تھے، سیرت کی کتابوں میں احد کے ایک درے کے طور پر اس کا ذکر کیا جاتا ہے، لیکن نام درج نہیں ہوتا، یہ احد کا وہ حصہ ہے جس میں نبی اکرم ﷺ نے تیر اندازوں کا دستہ متعین کیا تھا، جبل الریاۃ اس درجہ اہمیت رکھتا ہے کہ اس کے یاد کرنے سے عبرت کا ایک باب ہمارے سامنے کھل جاتا ہے، کتنے ہی صحابیوں کی شہادت، رسول اللہ ﷺ کا حکم پورا نہ کرنے کے نتائج۔

حضور ﷺ کی نسبت سے پہاڑوں اور بستیوں کے علاوہ کنوؤں کے نام بھی تاریخ کے دامن میں محفوظ ہیں مثلاً بیرٔ جاسم یا جاسوم، جو راتج کے نواح میں ایک کنواں تھا، اس کنویں کو یہ عزت

حاصل ہوگئی کہ یہاں انسانیت کو سیراب کرنے والے نبی رحمت نے اس کا پانی نوش فرمایا تھا۔ بعض مقامات کے نام نہایت اہم واقعات کی گم شدہ کڑی کا درجہ رکھتے ہیں۔ مثلاً: آبل الزیت وہ مقام ہے جو شام کے قریب اردن میں واقع ہے، نبی اکرم ﷺ نے جب حضرت اسامہؓ کا لشکر مرتب کیا تھا تو ہدایت کی تھی کہ آبل الزیت کی بستی میں جا کر ٹھہرنا۔ اس سے اندازہ کیجیے کہ رسول اللہ ﷺ کے علم کی حدود کو ان کے بھیجنے والے نے کس درجہ وسعت دی تھی اور کن جزئیات پر آپ ﷺ کی نظر تھی۔

فرہنگ سیرت میں فقہی اور دینی اصطلاحات اور الفاظ بھی ہیں، اس کی وجہ بھی رسول اللہ ﷺ سے ان الفاظ کا تعلق ہے، مثلاً صحابہ کے بعد تابعی اور تبع تابعی کی اصطلاحیں فرہنگ میں شامل کی گئی ہیں۔ یہ ان صحابہ کرام کے جانشین ہیں، جنھوں نے دنیا کے کتنے ہی ملکوں میں فیضانِ نبوت سے انسانوں کو مستفید کیا ہے، ان اصطلاحات میں رحل اور وحی بھی شامل ہے، ان اصطلاحوں میں خود اور میسرہ کا اندراج بھی آپ پائیں گے، ان میں دنوں کے نام بھی ہیں، مثلاً عروبہ جو جمعہ کا قدیم نام ہے۔

فرہنگ سیرت کو ہم بجا طور پر سیرت وحیاتِ محمدی ﷺ سے متعلق ایک تاریخی تالیف بھی قرار دے سکتے ہیں، افراد کے ذکر میں ہمیں کہیں اختصار نظر آتا ہے اور کہیں قدرے تفصیل۔ یہ تفصیل تاریخی اہمیت رکھتی ہے مثلاً ابو امیہ بن مغیرہ کا ذکر حجر اسود کے نصب کرنے کے واقعے کی ایک ایسی کڑی کو پیش کرتا ہے، جس سے اس اہم واقعہ قبل از رسالت کی شکل زیادہ واضح ہو جاتی ہے، یہی وہ شخص تھا جس نے مشورہ دیا تھا کہ جو شخص کل صبح سب سے پہلے حرم میں آئے اس کو ثالث بناؤ اور اسی کا فیصلہ تسلیم کرلو۔ اسی طور پر ابو کرش کے ذکر میں تفصیل موجود ہے، یہ تفصیل بھی غزوۂ بدر کے خدوخال کو اُجاگر کرتی ہے۔ یہ شخص بدر کے معرکے میں اوپر سے نیچے تک لوہے میں غرق تھا، اور یوں باطل کا اشارہ تھا جو سروسامان پر بھروسہ کرتا ہے۔ حضرت زبیرؓ نے نشانہ لے کر اس کی آنکھ میں ایک چھوٹا نیزہ مارا جس سے وہ فوراً مر گیا۔ یہ وار اتنا سخت تھا کہ اس کی آنکھ سے نیزہ نکالنا مسئلہ بن گیا تھا۔

اس فرہنگ کے چند پہلوؤں کی طرف میں نے اختصار کے ساتھ اشارہ کیا ہے ورنہ یہ

فرہنگ نبیؐ رحمت اور صاحبِ کوثر ﷺ کے سفر، حضر، امن و جہاد، دوستوں کی محفل اور ایسے تمام انسانی پہلوؤں کا بھی احاطہ کرتی ہے اور اپنی تفصیلات کی وجہ سے ہمیں رسول اللہ ﷺ سے زمانی، مکانی اور تحریری طور پر قریب تر کرتی ہے، حضور ﷺ سے یہ قربت کتنی اہمیت رکھتی ہے، اس کا اندازہ ہر صاحبِ ایمان کرسکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ اس کتاب کو مقبولِ عام عطا کرے اور مؤلف کے درجات میں اضافہ فرمائے اور انھیں سیرت کے لٹریچر میں مزید مفید اضافے کرنے کی توفیق دے، جو ہماری زبان کی آبرو میں اضافہ ہوگا۔

(''فرہنگ سیرت''، ۲۰۰۳ء)

سیرت النبی ﷺ اور مولانا سید زوار حسینؒ

اللہ تعالیٰ نے اسلام کو ہمارا دین قرار دیا اور یہی وہ دین ہے جو اللہ کے ہاں قابل قبول ہے [۱] اسلام کی تفہیم و تبلیغ ہر دور میں زمانے کے تقاضوں، علمی مطالبات اور ضروریات کے تحت کی جاتی رہی ہے، علوم کے پھیلاؤ کے ساتھ ساتھ ان علوم کی تفصیلات میں اتنا اضافہ ہوا کہ ہر علم کے بطن سے ذیلی علوم نے جنم لیا۔ ایک مثال پیش کی جاتی ہے: ایک زمانے میں جامعات میں پولیٹکل اکانومی کی تعلیم دی جاتی تھی پھر اکنامکس اور پولیٹکل سائنس الگ علوم قرار پائے، پھر پولیٹکل سائنس کو سیاسی نظریات اور حکومت میں تقسیم کیا گیا۔ یہ سلسلہ بڑھتا رہا، یہاں تک کہ بین الاقوامی تعلقات کا مطالعہ ایک الگ علم قرار پایا۔ پھر بین الاقوامی تعلقات اور بین الاقوامی دساتیر کے مطالعے مختلف علمی تنظیم قرار پائے، اسی طرح معاشیات نے بھی پہلے ذیلی شعبوں کو پھر الگ الگ باضابطہ علمی تنظیموں کو جنم دیا۔

اسی سے دینی علوم کے پھیلاؤ کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ مسلمانوں میں دین کو مدتوں مرکزی حیثیت حاصل رہی، چنانچہ بڑھتے ہوئے اسلامی ادب نے مطالعے کے کتنے ہی میدانوں کو مستقل علوم کا درجہ عطا کیا، تفسیر، حدیث، فقہ، وغیرہ، لیکن مجموعی طور پر یہ بات درست ہے کہ اسلامی علوم کا رشتہ حیات انسانی سے مستقل جڑا رہا، قرآن مجید جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے الفاظ میں کتاب العجائب والغرائب ہے، مختلف پہلوؤں سے مطالعے کا موضوع ہے۔ کچھ مفسرین نے وجہ نزول پر زور دیا، کچھ نے فقہی مسائل کا استنباط قرآن سے کیا، کچھ نے تاریخی اعتبار سے قرآن حکیم کی روشنی میں امم سابقہ کے حالات وکوائف کا مطالعہ کیا، کچھ حضرات نے لغات اور اسلوبیات کو اپنے مطالعۂ قرآن میں بنیادی اہمیت دی، لیکن مجموعی طور پر قرآن حکیم کے مفسروں نے انسانی ہدایت کو

کتاب مقدس کا مقصود جانا، دوسرے الفاظ میں ہماری مستند تفاسیر سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ قرآن کا سبب نزول انسانیت سازی ہے، اور انسان کتاب عظیم کا بنیادی موضوع ہے۔

قرآن حکیم میں حیات انسانی کا پورا خاکہ موجود ہے، اور انسانی زندگی کے مسائل اور گوناگوں مطالبات کی تفصیلات سیرت النبی ﷺ کی تفصیلات سے اجاگر ہوتی ہیں۔ کتاب وسنت کی یکجائی سے ہمیں قرآن حکیم کے اس ارشاد کا مفہوم معلوم ہوتا ہے کہ:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (۲)

اور اسی یکجائی سے ہمیں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے اس ارشاد کے مفاہیم تک رسائی حاصل ہوتی ہے کہ ''کیا تم نے قرآن نہیں پڑھا''؟ (۳) یہ بات ہماری ماںؓ نے اس سوال کے جواب میں فرمائی تھی کہ ہمیں رسول اللہ ﷺ کی سیرت کے متعلق کچھ بتایئے۔

قرآن نے ہمیں دستور حیات کی بنیادی دفعات عطا کیں اور حیات محمد ﷺ نے ان دفعات کے اطلاقی پہلو آشکار کیے، یہ کہنا مجموعی طور پر درست ہے کہ قرآن حکیم نے ہمیں دین کی بنیادیں عطا کیں اور حدیث وسنت سے اسلامی معاشرہ وجود میں آیا۔ مختلف ادوار میں حدیث وسنت کے بارے میں ابہام واشکال پیدا کرنے والوں کا بنیادی مقصد یہی رہا ہے کہ مسلمانوں کی نظریں اسلامی معاشرے اور اسلامی کردار سے بھٹک جائیں اسلامی زندگی کی مختلف سطحیں ہیں، کیونکہ انسانی معاشرہ مختلف صلاحیتوں اور ظرف رکھنے والوں کا مجموعہ ہوتا ہے، یہاں یہ بات واضح کردی جائے کہ اسلام محض قواعد وضوابط کا نام نہیں، بلکہ اسلام کی بنیاد محکم اللہ کی محبت اور رسول ﷺ کا اتباع ہے، اسی بنیاد پر معاشرے میں اولیاء اللہ، صاحبان امر، متقی، ضابطے کے مسلمان اور گناہ گاروں کے مختلف گروہ وجود میں آئے۔ اسی مرحلے پر اسلامی تصوف کی نشونما ہوئی۔

اسلامی معاشرہ وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ (۴) کی بنیادوں پر قائم ہوتا ہے، مگر اس کے اندرونی نمو کا تقاضا ہے کہ بات ضابطوں تک محدود نہ رہے، بلکہ معاشرے کے افراد میں تزکیہ، حسن سلوک اور احسان کی صفات پیدا ہوں، یہی اسلامی تصوف کی بنیاد ہے، عدل اسلام کا عمومی

قانون ہے، اور اُولُوا الْفَضْلِ کی (۵) پہچان ہے۔ یوں اسلامی معاشرے میں افراد اور جماعت کی اخلاقی نشو ونما ایک نامیاتی حقیقت ہے، اور یہی تصوف کا مقصود ہے، تصوف مجموعی طور پر اسلام کی زمین میں اجنبی پودا نہیں ہے۔ اگر چہ تصوف کے بعض دبستانوں میں غیر اسلامی عناصر موجود ہیں، لیکن اسلامی تصوف کی بنیاد یہی دو سر چشمے ہیں، قرآن حکیم اور سنت رسول اکرم ﷺ۔ بنی کریم ﷺ کے گرد جو مقدس جماعت جمع تھی، اس کے افراد کی صلاحیتیں مختلف تھیں، ان کے مسائل میں اشتراک کے باوجود اختلاف تھا، ہمیں بہت ساری حدیثیں اس مضمون کی نظر آتی ہیں کہ کون سا عمل سب سے زیادہ افضل ہے،؟ سرکار دو عالم ﷺ نے کبھی حج کو افضل ترین عبادت قرار دیا، کبھی جہاد کو، کبھی والدین کی خدمت کو، مثال کے طور پر حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے جب یہ سوال کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

افضل الاعمال الصلاۃ لوقتھا و بر الوالدین (۶)

''افضل ترین اعمال میں سے نماز کو اس کے وقت میں ادا کرنا اور والدین سے حسن سلوک ہے۔''

اسی طرح حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے جب پوچھا کہ ای العمل احب الی اللہ۔ کہ اللہ کے ہاں کون سا عمل زیادہ محبوب ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا:

ادومہ وان قل۔ (۷)

وہ عمل جو دوام کے ساتھ ہو، اگر چہ قلیل ہو۔

اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ کسی سائل نے آپ ﷺ سے یہی سوال پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

ایمان باللہ ورسولہ، قیل ثم ماذا؟ قال الجھاد فی سبیل اللہ قیل ثم ماذا ؟ قال حج مبرور۔ (۸)

''اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانا، سوال ہوا کہ پھر؟ آپ ﷺ نے فرمایا اللہ کے

اِنَّمَا یَخۡشَی اللّٰہَ مِنۡ عِبَادِہِ الۡعُلَمٰٓؤُا (۱۲)

''بلا شبہ اللہ سے اس کے بندوں میں سے اہلِ علم ہی ڈرتے ہیں۔''

اولیاء اللہ ہمارے دور میں ایک الگ گروہ بن گئے، لیکن اسلامی تاریخی کے عہد عروج میں علماء اور اولیاء میں یہ تفریق نہیں تھی، تزکیۂ باطن کے گوناگوں سوالات حضرت امام غزالی کو علم کی مجلسوں سے تزکیۂ باطن تک لے گئے، ان دونوں میں کوئی تضاد نہیں ہے، یہ ترقی اور ارتقائے ذات کے محض مرحلے ہیں، یہ تصوف ہی تھا جس نے امام غزالی کو اس عہد پر آمادہ کیا کہ میں بادشاہوں کی مجلسوں میں نہیں جاؤں گا اور بحث وجدال کے خارزاروں میں نہیں الجھوں گا، صوفی کا کوئی تصور علم کے بغیر نہیں کیا جاسکتا، تصوف اس کے رجحان طبع کا دوسرا نام تھا، علما مجالس ارشاد میں لوگوں کی تربیت فرماتے، اور صوفی اپنی خانقاہوں، اپنے زاویوں اور اپنے حجروں میں لوگوں کے کرداروں میں احسان کا رنگ بھرتے۔

ہمارے عہد میں ان دونوں کے درمیان فاصلے پیدا ہونے لگے اور ارباب شریعت اور ارباب طریقت کو ایک دوسرے سے الگ کردیا گیا، حالانکہ اتباع شریعت کی وہ منزل ہی اسلام اور طریقت ہے، جب آدمی کی روح، ذات اور شخصیت اس کے تحت آجائے جو رسول اللہ ﷺ لے کر آئے تھے، ہمارے دور میں ہماری خوش قسمتی سے ایسے لوگ موجود تھے جنھوں نے طریقت اور شریعت کے اس رشتے کے ادراک کو عام کیا، اور جنھوں نے اپنے علم کے ساتھ ساتھ اپنی ریاضتوں اور اسلوب حیات کو لوگوں کی ہدایت کے لیے نمونہ بنایا، ان میں حضرت مولانا سید زوار حسین شاہ علیہ الرحمہ بھی شامل ہیں، حضرت شاہ صاحب کو تصوف کے چاروں سلسلوں سے اجازت بھی حاصل تھی، لیکن ہم انھیں بنیادی طور پر طریق نقشبندیہ کا بزرگ کہیں گے، یہاں پر ایک اور فرق بھی ہمارے سامنے آتا ہے اور وہ یہ کہ اہل سنت والجماعت چاروں ائمہ فقہ کو حق جانتے ہوئے بھی اس توسع کا ثبوت نہیں دیتے جو اس عقیدے کا عملی نتیجہ ہونا چاہیے، لیکن اہل تصوف کے ہاں زیادہ توسع ہے، حضرت شاہ صاحب صوفیہ کی اس عظیم روایت کا حصہ ہیں اور جن کے عمل اور فکر کے موتی ان کے وصال کے

بعد بھی چمک رہے ہیں۔

حضرت شیخ اجمیری کی کشف المحجوب اور حضرت نظام الدین اولیا کی فوائد الفواد کے سلسلے کی ایک زندہ کڑی عمدۃ السلوک بھی ہے، شاہ صاحب کی اس کتاب کا نام تصوف اور تزکیہ واحسان کی بنیادوں کی طرف اشارہ کرتا ہے، زندگی کی یہی عمدگی تصوف کا خلاصہ ہے، یہ کتاب ان کتابوں میں سے ہے، جن کے بارے میں میں نے اکثر عرض کیا ہے کہ بعض کتابیں ہم سے گفتگو کرتی ہیں، شاہ صاحب کے بعد ان کی کتاب طالبان حق کے لیے ان کی نیابت کر رہی ہے، عمدۃ السلوک سے یہ نکتہ بھی ابھر کر ہمارے سامنے آتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کا طرز حیات ہی ہمارا مرشد ہے، شاہ صاحب اپنے عقیدت مندوں اور اپنے قارئین کو اسی قربت رسول اور اتباع رسول کی تعلیم دیتے ہیں، اور وہ مختلف ریاضتوں اور عبادتوں کا مقصد اسی قربت کے حصول کو قرار دیتے ہیں، یہاں پر اس نکتے کی وضاحت ضروری ہے کہ صوفیہ مختلف عبادتوں کے ساتھ ساتھ وظائف اور کبھی کبھی ان کی مخصوص شکلوں کا مطالبہ کیوں کرتے ہیں؟ اس سبب تک رسائی چنداں مشکل نہیں، صحابہ کرام کے سامنے منبع رشد ہدایت رسول اللہ ﷺ موجود تھے، ان کی صحبت تمام ریاضتوں اور طریقوں سے افضل تر اور بالاتر تھی، یہ ایسی فضیلت ہے کہ کوئی دوسری فضیلت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی، احادیث سے واضح ہوتا ہے کہ صحابہ کرام ہدایت کے ستارے ہیں، (۱۳) جن سے وابستگی آدمی کو ضلالت و گمراہی سے دور رکھتی ہے، از روئے قرآن صحابہ کرام معیار ایمان ہیں، یہی جو قرآن نے کہا ہے کہ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ (۱۴) یہاں ناس سے مراد صحابہ کرام کے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے؟ اور اسی لیے تو مقام صدیقیت نبوت کے بعد بلند ترین مقام ہے، اور مقام صدیقیت معیت رسول میں اختصاص کا دوسرا نام ہے، شاید اسی لیے نقشبندی سلسلے کا اہم ترین واسطہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی ذات ہے، پھر اسی مقام صدیقیت سے اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا (۱۵) کے اطلاقی پہلو ہمارے سامنے آتے ہیں۔

تصوف اس مقام تک ہمیں لے جاتا ہے جو حزن وضعف سے بالاتر ہو، اور اس کے لیے آدمی کو ذات رسول کریم ﷺ سے وابستگی حاصل کرنی پڑتی ہے، شاہ صاحب نے مراقبہ حقیقتِ محمدی

کے تحت عمدۃ السلوک کے حصہ دوم میں یہ ارشاد فرمایا ہے کہ حقیقۃ الحقائق اور تعین اول واضح ترین الفاظ میں اور عملی طور پر اس اتحاد خاص کا نام ہے، جو رسول اللہ ﷺ سے حاصل ہو جائے، یہی وہ منزل ہے جہاں فنا و بقا کے مراحل طے ہوتے ہیں، شاہ صاحب فرماتے ہیں:

اس مقدس مقام میں خاص طرز پر فنا و بقا حاصل ہوتی ہے اور سرور دین و دنیا ﷺ کے ساتھ ایک خاص قسم کا اتحاد میسر ہو جاتا ہے، اور رفع توسط، جس کے اکابر اولیا قائل ہوئے ہیں، کے معنی اس مقام میں ظاہر ہوتے ہیں اور تابع (سالک) متبوع (آنحضرت ﷺ) کے رنگ میں ایسی مشابہت پیدا کر لیتا ہے گویا کہ ہر دو ایک ہی چشمے سے پانی پیتے ہیں۔(۱۶)

یہی وہ مقام ہے جہاں حضرت مجدد الف ثانی کے اس قول کا مفہوم حقیقت بن کر سامنے آتا ہے:

''میں خدائے عز و جل کو اس لیے دوست رکھتا ہوں کہ وہ محمد ﷺ کا رب ہے۔''(۱۷)

حضور ﷺ سے یہ اتحاد ہی تمام اسرار و رموز کا جامع ہے، اس منزل پر پہنچنے سے پہلے انسان اس تفریق کا شکار رہا ہے کہ میں دین کے ہر معاملے میں راہ مصطفےٰ ﷺ پر چلوں گا، لیکن دنیاوی امور دائرہ سنت میں شامل نہیں، اس سلسلے میں جو لوگ بہت سارے واقعات اور مثالیں پیش کرتے ہیں، مثلاً مدینہ میں کھجور کی کاشت کے بارے میں حضور ﷺ کا ارشاد اور اگلے سال اس سے رجوع فرما لینا، حقیقت محمدی کی منزل پر پہنچ کر انسان ''ان جزوی و کلی، دینی و دنیاوی امور میں حبیب خدا ﷺ کے ساتھ مناسبت و مشابہت ہونے کو بہت ہی دوست رکھتا ہے۔''(۱۸)

حُب رسول ﷺ میں دین و دنیا کی تفریق مٹ جاتی ہے، اور اس ثنویت کو ختم کرنا ہی ایمان اور مومن کی اعلیٰ ترین منزل ہے، اس منزل پر پہنچ کر سالک حدیث کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیتا ہے، شمائل اور روزانہ زندگی کی مصروفیات اور مشغولیات کے سلسلے میں سنت کی تلاش اس کا مقصود حیات ٹھہرتی ہے، شاہ صاحب نے اس مرحلے میں درود شریف کی کثرت کا ذکر کیا ہے(۱۹) یوں درود ایک عمل یا وظیفہ نہیں رہتا بلکہ روح کا ایک داعیہ بن کر آدمی کا طرز حیات بن جاتا ہے۔

تینتیسویں سبق میں شاہ صاحب نے اسم احمد کی معنویت کی طرف اشارے کیے ہیں،[۲۰] مگر اس سبق کے نکات کا تعلق علم سے اتنا نہیں جتنا ذاتی تجربے سے ہے، یوں یہ بات ہم پر واضح ہوتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے قربت اور اتحاد انسان پر بلند ترین مقامات کے دروازے کھولتا چلا جاتا ہے، یوں تصوف انسان پر نفس کے حقوق و فرائض کی ماہیت اور نوعیت کو واضح کر دیتا ہے۔

مقالات زوار یہ سات ابواب پر مشتمل ہے، پہلا حصہ قرآن کی تعلیمات پر مشتمل ہے، لیکن اس حصے میں احادیث نبوی ﷺ کا حوالہ بیشتر مقامات پر ملتا ہے، مثلاً ''افضلیت کا قرآنی معیار'' کے تحت تقوے کو پیش کیا گیا ہے، تصوف کے لیے ایک شرط جسے شاہ صاحب نے حضور ﷺ کے حوالے سے پیش کیا ہے، وہ یہ کہ تقویٰ کبر و فخر کو دور کیے بغیر پیدا ہو سکتا، شاہ صاحب نے رسول اللہ ﷺ کے خطبہ فتح مکہ کی ایک روایت کے حوالے سے رسول اللہ ﷺ کے فرمان مبارک کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ جس نے جاہلیت کے فخر و تکبر کو تم سے دور کر دیا، اب انسانوں کی صرف دو قسمیں ہیں ایک نیک و متقی اور وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک شریف و باعزت ہے، دوسرا فاجر بد بخت اور وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ذلیل و حقیر ہے، اس کے بعد یہ آیت تلاوت فرمائی جس کا پہلے بیان ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ فضیلت والا شخص وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔[۲۱]

جس آیت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ یہ ہے:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ[۲۲]

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا کہ تقوے اور خیر کے بہت سے مدارج ہیں، یہاں شاہ صاحب نے اسی نکتے کی وضاحت فرمائی ہے۔

تقویٰ کی تشریح یہ ہے کہ اس کے بہت سے مدراج ہیں، عام تقسیم کے مطابق ادنیٰ درجہ کا

متقی وہ شخص ہے جو اللہ تعالیٰ پر، اس کے رسولوں اور اس کی کتابوں پر قدر خیر و شر پر اور یوم آخرت اور مرنے کے بعد قیامت کے روز اٹھائے جانے پر ایمان لایا اور اس نے اپنے آپ کو شرک سے بچایا۔ اوسط درجہ کا متقی وہ ہے جو اعمال صالحہ کرتا اور گناہوں سے بچتا ہے اور اعلیٰ درجہ کا متقی وہ ہے جو لایعنی امور میں مشغول ہونے سے بچتا اور اللہ تعالیٰ کی یاد میں ہر وقت مشغول رہتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے کہ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقٰتِہٖ (۲۳)، ''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے''، یہی اعلیٰ درجے کا تقویٰ مراد ہے، دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاللّٰہُ وَلِیُّ الْمُتَّقِیْنَ (۲۴) ''اور اللہ تعالیٰ متقیوں کو دوست رکھتا ہے۔'' ایک اور جگہ ارشاد فرمایا: وَاللّٰہُ وَلِیُّ الْمُؤْمِنِیْنَ (۲۵) ''اور اللہ تعالیٰ مومنوں کو دوست رکھتا ہے۔'' ان دونوں آیتوں کی مطابقت سے معلوم ہوا کہ ہر مومن اللہ کا ولی ہے اور ہر مومن متقی ہے۔ یہ تو ولایت اور تقویٰ کا ادنیٰ درجہ ہوا، اور ان کا اعلیٰ درجہ تمام انبیائے اکرم علیہم السلام کو حاصل ہے اور ان میں بھی سب سے اعلیٰ درجہ سرورِ کائنات فخر موجودات خاتم الانبیاء حضرت محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلی سائر الانبیاء والمرسلین وعلی الہم واصحابہم اجمعین کو حاصل ہے اور آپ ﷺ کے طفیل سے تمام صحابہ کرام واہل بیت عظام اور خاص الخاص اولیائے کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کو حاصل ہے۔ پھر ان کے بعد تقویٰ اور ولایت کا اوسط درجہ دوسرے اولیائے امت کو حاصل ہے اور ادنیٰ درجہ تو ہر مومن کو حاصل ہے۔ (۲۶)

مقالات زواریہ کا دوسرا باب ایمان اور اسلام ہے، ''اتباع شریعت'' کے تحت شاہ صاحب اس نکتے کی وضاحت فرماتے ہیں کہ ایمان کا مفہوم آپ ﷺ کی اطاعت ہے، کیونکہ محبت ایک مخفی جز ہے،، اور اس کا اظہار اطاعت کے درجے سے ہی ہوسکتا ہے، محبت جتنی قوی ہوگی، اطاعت اسی قدر زیادہ ہوگی، قرآن حکیم نے اللہ کی محبت کے حصول کا ذریعہ بھی حضور ﷺ کی محبت کو قرار دیا، اور یہ بات بھی واضح کردی ہے کہ: مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ (۲۷) شاہ صاحب کے الفاظ میں:

''اللہ تعالیٰ نے اطاعت رسول کو اپنی محبت کا مدار قرار دیا ہے اور فرمایا ہے کہ اگر دنیا

میں کسی شخص کو اللہ تعالیٰ کی محبت کا دعویٰ ہو تو اس کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنے آپ کو رسول اللہ ﷺ کے اتباع کی کسوٹی پر آزما کر دیکھ لے، سب کھرا کھوٹا معلوم ہو جائے گا، جو شخص اپنے دعوے میں جتنا سچا ہوگا وہ حضور اکرم ﷺ کے اتباع کا اتنا ہی زیادہ اہتمام کرے گا اور آپ کی لائی ہوئی شریعت کو مشعل راہ بنائے گا۔''(۲۸)

مقالات زواریہ کا تیسرا باب ہے احکام دین، اس کے تحت شاہ صاحب نے نماز، روزے حج کو شامل کیا ہے، احکام دین کے تحت انھوں نے صرف عبادت کو ہی نہیں بلکہ اوامر، سنن و مستحبات اور نواہی کو بھی شامل کیا ہے، احکام دین صرف عبادات تک محدود نہیں بلکہ اس میں معاشرتی زندگی بھی شامل ہے، اس توسع اور وسعت کا سبب سیرت رسول ﷺ اور تصوف کے عملی پہلو ہیں، شاہ صاحب نے جمعۃ المبارک، تعاون علی البر، خدمت خلق، فضائل صدقہ اور شہادت کو بھی اس باب میں شامل کیا ہے، دوسری طرف منکرات، ظلم، فرقہ بندی، رشوت، جھوٹی قسم اور ان کے اثرات و مضمرات سے متنبہ کیا ہے، چونکہ سنت اور اتباع رسول ﷺ ان کے ہمیشہ پیش نظر رہی اس لیے انھوں نے سونے اور جاگنے کے آداب کو بھی شامل باب کیا ہے، زکوٰۃ کا نام تو اس باب میں نہیں ہے لیکن خدمت خلق محتاجوں کی امداد اور فضائل صدقہ کے عنوانات کے تحت شاہ صاحب نے انفاق فی سبیل اللہ کے مختلف گوشوں کو منور فرمایا ہے، اور اس میں بھی سنت رسول اور احادیث کو پیش کیا ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کے ذریعے جو اقتصادی نظام انسانیت کو دیا ہے، اس کی روح کو شاہ صاحب نے ایک جملے میں پیش کر دیا ہے فرماتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے ایک ایسا معاشرتی نظام پیش فرمایا ہے کہ اس عالم اسباب میں بندے آپس میں ایک دوسرے کی روزی اور معاش کا ذریعہ بنتے ہیں۔''(۲۹)

شاہ صاحب کے ذہن میں اسلام کے معاشی خدوخال بہت واضح ہیں، یہ وضاحت سنت نبی ﷺ سے ہوتی ہے، غور فرمائیے تو معاشیات اور اقتصادیات کی اصطلاحوں سے بھی اسلام کی وسعت اور عربی زبان کی توانائی کا اندازہ ہوتا ہے، معاشیات ایک عمومی اصطلاح ہے اور

اقتصادیات کی اصطلاح اسلام کے معاشی نظام کو بہتر انداز میں پیش کرتی ہے، کیونکہ اقتصادیات میں میانہ روی کا پہلو موجود ہے، شاہ صاحب نے حدیث کی روشنی میں اسلام کے اقتصادی نظام کے ایسے پہلوؤں کو پیش کیا ہے جو عام طور پر دانستہ یا نادانستہ نگاہوں سے پوشیدہ رکھے جاتے ہیں، شاہ صاحب کی وضاحتیں نہایت خوبی سے اس بات کو واضح کر دیتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے اتباع کے بغیر اسلام کے معاشی نظام کو نہیں پرکھا جاسکتا، یہ چند بندھے ٹکے ضابطوں کا نام نہیں، اس کا گہرا تعلق معاشرے کے احوال وکوائف اور اس کی اقتصادی صورت حال سے ہے، اسلام میں صدقات و خیرات محض امیروں کے فیاضانہ سلوک تک محدود نہیں، بلکہ اسلام نے غریبوں کو صاحبان ثروت کی آمدنی کا حق دار قرار دیا ہے، اور یہ حق بھی کیسا؟ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ۝ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (۳۰) شاہ صاحت فرماتے ہیں:

خوشحال لوگوں کے مال ومتاع میں اللہ تعالیٰ نے ان غریبوں اور ناتوانوں کا حصہ رکھا ہے اور ان کے لیے اس کو سعادت وثواب کا ذریعہ بنایا ہے اور جو لوگ ان اموال میں سے ان کا حصہ نہیں نکالتے ان کو دنیا میں اللہ تعالیٰ کی گرفت سے مفر نہیں اور آخرت میں بھی ان سے اس کی باز پرس ہوگی اور سزا ملے گی۔ ایک حدیث میں بھی اس کی طرف اشارہ ہے، حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم ایک سفر میں آنحضرت ﷺ کے ہمراہ تھے۔ اچانک ایک شخص سواری پر سوار آپ کی خدمت میں حاضر ہوا، اس کا یہ حال تھا کہ کبھی دائیں طرف جاتا اور کبھی بائیں طرف مڑتا یعنی وہ اپنی سواری کے ناکارہ ہو جانے کی وجہ سے پریشان تھا۔ اس موقعے پر آپ نے فرمایا جس کے پاس فالتو سواری ہو وہ اس کو دے دے جس کے پاس سرے سے سواری ہی نہ ہو۔ اور جس کے پاس فالتو زادراہ ہو وہ اسے دے دے۔ روای کہتے ہیں کہ اس طرح آپ ﷺ نے مال کی کئی قسمیں بیان فرمائیں یہاں تک کہ ہم نے خیال کیا کہ فالتو چیزوں میں ہمارا کوئی حق نہیں ہے۔ یہ جنگ کا موقع تھا۔ اس حدیث شریف سے معلوم ہوا کہ اس قسم کے ہنگامی حالات میں امیر وقت کو شرعاً یہ اجازت ہے کہ وہ خوشحال لوگوں سے فالتوں چیزیں لے کے بے سروسامان مستحقین میں تقسیم کرسکتا ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جو شخص ﷺ میری امت میں سے کسی کی کوئی دینی یا دنیاوی حاجت پوری کرے اور اس حاجت روائی کے ذریعے اس کو خوش کرنا چاہتا ہے تو بے شک اس نے مجھ کو خوش کیا اور جس نے مجھے خوش کیا بے شک اس نے اللہ تعالیٰ کو خوش کیا اور جس نے اللہ تعالیٰ کو خوش کیا تو اللہ تعالیٰ اس کو بہشت میں داخل فرمائے گا۔ اس حدیث شریف سے معلوم ہوا کہ امت کی خوشی سے رسول اللہ ﷺ خوش ہوتے ہیں اور آپ کی خوشی سے اللہ تعالیٰ کی خوشی کا باعث ہے اور جب اللہ تعالیٰ خوش ہو گیا تو ضرور اس شخص کو جنت میں داخل فرمائے گا۔ (۳۱)

احکام دین میں احکامات کے ساتھ ساتھ محبت اور وابستگی رسول کے مقامات مومن کے گریہ شب گاہی کے آنسوؤں کی طرح چمکتے نظر آتے ہیں، حج و عمرے کے سلسلے میں شاہ صاحب نے فضائل مدینہ منورہ کو ایک مستقل موضوع کے طور پر پیش فرمایا ہے، اور اسی سلسلے مسجد نبوی کے تبرکات، مسجد قبا، زیارت بدر پر بھی روشنی ڈالی ہے، شاہ صاحب نے اس بات میں اللہ تعالیٰ کی تسبیح کے اطراف و جوانب کو واضح فرمایا ہے، اور یوں نبی اسرائیل کی اس آیت کے معانی واضح ہو جاتے ہیں کہ: تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ ۔ (۳۲)

تمام مفاہیم کا احاطہ کرنے کی کوشش میں شاہ صاحب نے تسبیح کی مختلف صورتوں کو پیش کیا ہے، مثلاً تسبیح دو قسم کی ہے، تکوینی اور اختیاری، کائنات کی ہر چیز کا تسبیح پڑھنا تکوینی بات ہے، پھر یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ تسبیح حالی نہیں مقالی بھی ہوتی ہے، مسئلہ تسبیح سے حیات و کائنات کی ایک عظیم حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے، جس کی جدید ترین سائنسی انکشافات نے تصدیق کی ہے، وہ یہ کہ کائنات کی بیشتر اشیا شعور و فہم رکھتی ہیں، حالانکہ اس شعور و فہم کے مظاہر اور مقامات ہمارے سامنے نہیں آتے، نبی اکرم ﷺ کی نبوت کی گواہی شجر و حجر نے دی، یہ سب مقامات سرور کائنات ﷺ کی ذات کے طفیل انسانوں کے مشاہدات میں آئے۔ شاہ صاحب کے الفاظ میں:

صحیح مسلم میں حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں مکہ مکرمہ میں اس پتھر کو جانتا ہوں جو بعثت و نبوت سے پہلے مجھے سلام کیا کرتا تھا اور میں

اب بھی اس کو پہچانتا ہوں۔ بعض حضرات نے کہا کہ اس سے مراد حجر اسود ہے، واللہ اعلم۔ اس قسم کی روایت، کہ جن سے بے جان چیزوں میں ادراک و شعور کا پایا جانا ثابت ہے۔ بکثرت ہیں۔ استوانہ حنانہ کا واقعہ تو سب مسلمانوں میں زبان زد ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے اس کو چھوڑ کر منبر پر خطبہ دینا شروع فرمایا تو اس نے بچے کی طرح بلک بلک کر رونا شروع کر دیا اور اس کا رونا اس وقت کے حاضرین سب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے سنا اور جب آپ ﷺ نے منبر سے اتر کر اس کو اپنے ساتھ لپٹایا اور جنت کی بشارت دی تب وہ خاموش ہوا۔ ان روایات سے بے جان چیزوں کا بولنا اور اللہ تعالیٰ کی تسبیح پڑھنا، ذکر کرنا، کلمہ پڑھنا، سلام کرنا وغیرہ ثابت ہے۔ (۳۳)

چوتھا باب تجارت و معیشت کے متعلق ہے، مسلمان کی زندگی میں تجارت کی اہمیت کا اس سے اندازہ لگایئے کہ حصول رزق حلال کو فریضۃ بعد الفریضۃ (۳۴) قرار دیا گیا ہے، اور جب صورت حال یہ ہو تو سیرت نبوی علی صاحبھا الصلاۃ والسلام سے اس کا تعلق خود بخود واضح ہو جاتا ہے، پھر اس نقطہ نظر سے بھی غور فرمایئے کہ تجارتی اصطلاح کے ذریعے یہ حقیقت واضح کی گئی کہ:

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (۳۵)

''بلاشبہ اللہ نے مومنوں کی جانوں اور مالوں کو جنت کے عوض خرید لیا ہے۔''

یہ خیال عام ہے کہ صوفیہ نے زندگی کے مسائل پر توجہ نہیں دی۔ لیکن حقیقی اہل تصوف کی طرح شاہ صاحب اسے زندگی کا ایک اہم شعبہ قرار دیتے ہیں۔ معاد اور معاش کو الگ نہیں کیا جا سکتا، لیکن تصوف اس حقیقت پر زور دیتا ہے کہ تلاش رزق میں گم ہو کر نہ رہ جاؤ۔ اقبال نے اس حقیقت کا کیسا خوبصورت اظہار کیا ہے۔

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

مرشد رومی کے الفاظ میں:

نے قماش و نقرہ و فرزند و زن
چیست دنیا از خدا غافل بدن

شاہ صاحب اس حقیقت پر زور دیتے ہیں کہ الکاسب حبیب اللہ ۔ یہ مقولہ منشائے نبوی کا عوامی سطح پر اظہار ہے، شاہ صاحب نے تصوف کے اس بنیاد نکتے کو اپنے سامنے رکھا ہے کہ فرد میں گداگری نہ پیدا ہو، شاہ صاحب کی نظر میں الفقر فقری کا حقیقی مفہوم واضح ہے، اور وہ اس کی تبلیغ کرتے ہیں، فقر نبی ﷺ معاذ اللہ، گداگری یا ترک دنیا کا نام نہیں، جیسا کہ آج سمجھا جاتا ہے، فقر نبی دنیا سے مومن کی بے نیازی کا نام ہے، اس فقر کی جھلک کھجور کے درخت کے نیچے ایک اینٹ کو تکیہ بنا کر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی استراحت سے یا پھر نان شبینہ کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے یہودی کے باغ میں کام کرنے سے ہے، حضرت شاہ صاحب ہاتھ سے کام کرنے کے بعد تجارت کو ذریعہ حصول رزق کے طور پر ترجیح دیتے ہیں، اور نبی اکرم ﷺ کا یہ قول ان کی اس ترجیح کی بنیاد ہے کہ رزق کے دس حصوں میں سے نو حصے تجارت میں ہیں (۳۶) اس منزل پر شاہ صاحب کے ہاں صوفی اور فقیہہ کا سنگم ملتا ہے، اور وہ تجارت اور حصول معاش کے ذرائع اور طریقوں کو قرآن حکیم اور حدیث نبوی کی روشنی میں پیش کرتے ہیں، اس سلسلے میں شاہ صاحب نے کثرت سے احادیث کا حوالہ دیا ہے، شاہ صاحب نے مقالات زواریہ میں ہر مسئلے میں قرآن حکیم کی آیات کے ساتھ ساتھ احادیث نبوی کے حوالے دیے ہیں، جس سے قرآن وحدیث کی ہم آہنگی کے ساتھ ساتھ یہ نکتہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ:

وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۝ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ (النجم:۳)

”اور آپ (ﷺ) اپنی خواہش سے کچھ نہیں کہتے، یہ تو وحی ہے جو ان کی طرف کی جاتی ہے۔“

اس سلسلے میں ایک اقتباس سے ہماری معروضات کی وضاحت ہو جائے گی، جن رہنما اصولوں کی طرف شریعت اسلامیہ نے رہنمائی فرمائی ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ ناپ تول میں صحیح

معیار قائم رکھو، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ (۳۸) ''اور ناپ اور تول انصاف کے ساتھ پورا پورا کیا کرو''یعنی کسی کا حق اپنے پاس نہ رہنے پائے۔ دوسری جگہ ارشاد فرمایا: وَاَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ (۳۹) ''اور جب تم ناپ کر دو، تو پورا ناپو اور وزن کرتے وقت صحیح ترازو سے تول کر دو۔'' ناپ اور تول میں کمی کرنے والوں کے لیے سخت وعید فرمائی ہے، چنانچہ ارشاد فرمایا ہے:

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ۝ وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ۝ (۴۰)

''اور لوگوں کے لیے دردناک عذاب ہے جو ناپ تول میں کمی کرنے والے ہیں کہ جب وہ لوگوں سے ناپ کر لیتے ہیں تو پورا لیتے ہیں اور جب دوسرے کو ناپ یا تول کر دیتے ہیں تو کم ناپتے اور تولتے ہیں۔'' مال میں کھوٹ ملانے اور دغا وفریب کرنے سے بھی منع فرمایا ہے جیسا کہ ارشاد ہے کہ لوگوں کی چیزوں میں نقصان مت کرو یعنی جس طرح ناپ تول میں کمی کرنا منع ہے ملاوٹ کے ذریعے دوسروں کو نقصان پہنچانا بھی منع ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ: ''مال بیچنے کے لیے زیادہ قسمیں کھانے سے بچو کیوں کہ بے شک زیادہ قسمیں کھانے سے اس وقت تک تو خوب بکری ہوجاتی ہے لیکن انجام کار وہ برکت کو کھو دیتی ہے۔'' بات یہ ہے کہ جس شخص کو زیادہ قسمیں کھانے کی عادت ہوجاتی ہے اس سے جھوٹی قسمیں سرزد ہوجاتی ہیں جس کی وجہ سے اس کی کمائی میں برکت نہیں رہتی یا مال ضائع ہوجاتا ہے یا بے جا خرچ ہوجاتا ہے اور آخرت کا ثواب تو کم ہو ہی جاتا ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ جھوٹی قسم کے ذریعے مال بیچنے والے تاجر سے اللہ تعالیٰ قیامت کے روز کلام نہیں کرے گا، اس کی طرف نظرِ رحمت سے نہیں دیکھے گا اس کے گناہوں کو معاف نہیں فرمائے گا اور اس کے لیے دردناک عذاب ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: ''اے تاجروں کی جماعت! خرید وفروخت میں اکثر بے فائدہ باتیں ہوجاتیں اور زیادہ قسمیں پیش آجاتی ہیں اس لیے تجارت کے ساتھ صدقہ کو ملاؤ یعنی صدقہ سے اس کثافت کا کفارہ ہوجائے گا۔ اور اللہ تعالیٰ کی ناراضگی دور ہوجائے گی۔''(۴۱)

باب پنجم اخلاق وحقوق کے متعلق ہے، نبی اکرم ﷺ کی سیرت سے اس باب کی وابستگی قرآن حکیم

کی اس آیت سے ہمارے سامنے آجاتی ہے لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ (۴۲)، یا سرکار دو عالم کے اس قول سے کہ بعثت لاتمم حسن الاخلاق (۴۳)، اخلاق حسنہ کے بعد شاہ صاحب نے حسن خلق کا ذکر کیا ہے اور حسن خلق کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایئے کہ قرآن حکیم کے ارشاد کے مطابق کہ: لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ (۴۴)، یا حدیث نبوی کے مطابق حسن اخلاق کی تکمیل مقصد بعثت نبوی ہے، مقصد بعثت نبوی سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اخلاق کی تکمیل ایمان کی تکمیل ہے، حسن اخلاق کو اپنانے والے کے لیے نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ اس کو اللہ تعالیٰ شب زندہ داروں میں شامل کر لیتا ہے، اور ان میں جو ہمیشہ روزے سے رہتے ہیں، حضرت شاہ صاحب حسن خلق کے سلسلے میں حضرت عائشہ سے مروی حدیث اور حضرت معاذ بن جبل کو وصیت نبوی کا ذکر کرتے ہیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مسلمان اپنے حسن خلق کی بدولت اس شخص کا درجہ حاصل کر لیتا ہے جو ہمیشہ رات کو عبادت میں جاگتا اور دن میں روزہ رکھتا ہو، اس کو ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ جب آنحضرت ﷺ نے حضرت معاذ بن جبل کو یمن کا عامل مقرر کر کے بھیجا تو وہ فرماتے ہیں کہ مجھے آنحضرت ﷺ نے اس وقت، جب کہ میں اپنا ایک پاؤں رکاب میں رکھ چکا تھا، آخری وصیت یہ فرمائی کہ اے معاذ! لوگوں سے خوش اخلاقی کا برتاؤ کرنا۔ اس کو امام مالک نے روایت کیا ہے، یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت معاذ کو یمن کا قاضی بنا کر بھیجا تھا تو اس وقت ان کو بہت سی نصیحتیں کی تھیں اور ان کو سوار کرایا اور پیادہ پا ان کے ساتھ کچھ دور تشریف لے گئے تھے اور یہ بھی فرمایا تھا کہ شاید تو مجھ کو پھر نہ دیکھے۔ چنانچہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے جانے کے کچھ عرصے بعد آپ ﷺ نے اس دار فانی سے رحلت فرمائی۔ اس لحاظ سے بھی حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو آنحضرت ﷺ کی آخری وصیت تھی۔ علامہ سیوطی نے فرمایا کہ اس حدیث میں لوگوں سے مراد وہ لوگ ہیں جو حسن خلق اور نرمی کے مستحق ہیں۔ (۴۵)

اخلاقیات کے سلسلے میں شاہ صاحب نے امانت دیانت، ایفائے عہد، حلم، بردباری، نرم

دلی، غصے کو ضبط کرنا، معافی اور حفظ لسان کے علاوہ سادگی، حیا، اعتدال، احترام شفقت سے الگ الگ بحثیں کی ہیں، ایک مقالے کا عنوان ہے ''خواہشات کی تہذیب'' تہذیب کی شاید سب سے جامع تعریف یہی ہے کہ وہ پابندیاں جو معاشرتی زندگی کی خاطر انسان اپنے اوپر عائد کرے، اور یوں معاشرتی زندگی کے تمام آداب اس کے تحت آجاتے ہیں، ان پابندیوں کا تعلق دل کی تربیت سے ہے، اور اسی پس منظر میں نبی اکرم ﷺ کے اس قول کی جامعیت سمجھ میں آسکتی ہے کہ انسان کے جسم میں ایک گوشت کا ٹکڑا ہے کہ اگر وہ نیک و درست ہوجائے تو تمام بدن نیک و درست ہوجاتا ہے اور اگر وہ بگڑ جائے تو تمام جسم بگڑ جاتا ہے، آگاہ رہو کہ وہ گوشت کا ٹکڑا دل ہے۔ (۴۶)

دل کی اصلاح کے لیے ذکر الٰہی سب سے موثر ذریعہ ہے، اور ذکر کو عبادت و ریاضت سے استحکام ملتا ہے، شاہ صاحب کا تصوف اس ذات گرامی کے مکمل اتباع سے عبارت ہے، جس نے خلوت حرا اور میدان کارزار کو ایک کردیا، جس کی خلوت گزینی نے ایک قوم کی تشکیل کو ممکن بنایا، اور جس کی تنہائیوں نے انسانیت کو مکمل دستور عطا کیا، یوں شاہ صاحب کا تصوف ذکر الٰہی بھی ہے اور معرکۂ حیات بھی، ان کا تصوف ان اکابر کے انداز زیست کا جانشین ہے، جنھوں نے مغلوں کے دور آخر میں مجموعی طور پر مسلمانوں کو اخلاقی بحران میں مبتلا ہونے سے بچالیا، مرزا مظہر جان جاناں اور دوسرے بزرگوں کی خانقاہیں وہ جگہیں تھیں جہاں نوجوانوں کے دل و دماغ کے وحشی گوشوں کو تراش کر مہذب بنایا جاتا تھا۔

شاہ صاحب نے اخلاق و حقوق کے تحت عورتوں کے حقوق پر بھی زور دیا ہے، آج حقوق نسواں کے نام پر کتنے ہی فکری فسادوں نے سر اٹھایا ہے، اور بہت سی مغرب پرست خواتین اسلام کے واضح احکام کی من مانی تاویلیں کر رہی ہیں۔ شاہ صاحب کا تصوف مجہول گوشہ نشینی نہیں ہے، بلکہ وہ سنت نبوی کا تتبع کرتے ہوئے معاشرتی زندگی کو ناہمواریوں سے بچاتا ہے، شاہ صاحب اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

''اسلام نے ظاہر ہوتے ہی عورتوں کو ایسے مساوی حقوق عطا فرمائے جو کسی مذہب اور

کسی کو قوم نے نہیں دیے تھے۔ قرآن حکیم اور احادیث نبوی میں مرد عورت کے حقوق پر کثرت سے احکام وارد ہوئے ہیں اور تمام احکام میں مرد وزن کو یکساں طور پر مخاطب فرمایا ہے، اور ان چند احکام وفرائض کے سوا، جو عورتوں کے ساتھ مخصوص ہیں، اور کسی حکم میں مرد عورت میں کوئی فرق روا نہیں رکھا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ (۴۷) ''تم عورتوں کے ساتھ نیک سلوک کی زندگی بسر کرو۔''

حدیث شریف میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''عورتوں کی عزت وہی شخص کرتا ہے جو شریف النفس ہوتا ہے اور ان کی توہین وہی شخص کرتا ہے جو کمینہ ہوتا ہے۔''(۴۸)

رسول اللہ ﷺ کی سیرت شاہ صاحب کی تحریر کے بدن میں خون کی طرح دوڑ رہی ہے، ان تمام مباحث وسائل کے بعد شاہ صاحب نے تصوف وسلوک کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں وضاحتی تحریریں پیش کی ہیں۔

تصوف وسلوک کے تحت آپ نے رضائے الٰہی، لطائف خمسہ، توکل اور صبر، شکر جیسے موضوعات کے عملی پہلوؤں کو سنت رسول ﷺ کی روشنی میں پیش فرمایا ہے اور اس باب کے فوراً بعد سیرت وسوانح کے عنوان سے نبی اکرم ﷺ کی سیرت کو شاہ صاحب نے پیش کیا ہے، اسی حصے میں بعد کے ادوار کے کچھ اور بزرگوں کا بھی تذکرہ ہے، ہم اپنے آپ کو سیرت نبوی تک محدود رکھتے ہیں، اس ترتیب کی معنویت یہ ہے کہ تمام مباحث اور نکات کی عملی وضاحت سیرت ہی کے ذریعے ممکن ہے، شاہ صاحب واضح الفاظ میں کہتے ہیں کہ تصوف احسان کا دوسرا نام ہے، سیرت انبیاء اور خاص طور پر سیرت ختم المرسلین ﷺ وحدت آدم کی ضمانت ہے، اللہ تعالیٰ نے انبیائے کرام کو بشیر ونذیر بنا کر بھیجا اور ان انبیاء کے ساتھ کتاب بھی نازل کی، نبیوں کے ساتھ قرآن مجید میں ایک مقام پر کتاب کو واحد کے صیغے میں پیش کیا ہے:

وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ (۴۹)

''اور ان کے درمیان سچی کتاب بھی نازل کی تاکہ اللہ تعالیٰ اختلافی باتوں میں لوگوں کے درمیان فیصلہ کردے۔''

کتاب کو واحد کے صیغے میں پیش کرنے کی مصلحت یہ ہے کہ وحی الٰہی کے ایک ہونے کو واضح کیا جاسکے اور یہی ایک بات مستشرقین کی تمام ہرزہ سرائیوں کا جواب ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی لائی ہوئی کتاب قرآن حکیم صحف اولیٰ سے اخذ کی گئی ہے، ظاہر ہے کہ ان کتابوں کا سرچشمہ ایک ہی ہے اور اسی لیے ان میں اتحاد معانی، موجود ہے، توریت وانجیل کو مسخ کرنے والے بھی قرآن مجید کی چمک پر غالب نہ آسکے، جو وحی الٰہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کے تحفظ کو اپنے ذمے لیا ہے، پندرہ صدیاں اس کی صداقت پر گواہ ہیں، خود اسلام کے بدترین دشمن اس کی شہادت دیتے ہیں، ان شہادتوں میں سب سے قوی شہادت سیرت رسول اللہ ﷺ ہے قرآن مجید کے کتاب الٰہی ہونے کی سب سے قوی شہادت بھی حضور کی ذات اور سیرت ہے۔

اللہ کے رسول کی سیرت کو اسوۂ حسنہ قرار دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے یہ وضاحت فرمادی کہ یہ اسی کے لیے اسوۂ حسنہ ہے جو اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو، اور اللہ سے آخرت کے دن ملنے کا امیدوار ہو اور کثرت سے اللہ کا ذکر کرتا ہو، حضور ﷺ کی سیرت کا دائرہ اس دنیا میں انسانی زندگی سے لے کر یوم آخرت تک پھیلا ہوا ہے، اور رسول اللہ ﷺ سے آدمی کا تعلق اس کے عمل کے ذریعے سامنے آتا ہے، شاہ صاحب نے اس آیت مبارکہ لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ (۵۰) کے حوالے سے فرمایا ہے۔

یہ آیت مبارکہ اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ آنحضور ﷺ تمام بنی نوع انسان کے خیرخواہ، ہمدرد اور غم گسار تھے اور مسلمانوں پر خصوصیت کے ساتھ مہربان اور شفیق تھے، یہ آپ ﷺ کے اعلیٰ اخلاق کی آسمانی شہادتیں ہیں آپ ﷺ کی سیرت مبارکہ قرآن پاک کی عملی تفسیر ہے، ایمان، توحید، نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، جہاد، صدقہ، خیرات، ایثار، قربانی، عزم، استقلال، صبر، شکر، سخاوت،

شجاعت، عفت، صداقت، حلم، عدالت، تسلیم، رضا اور ان کے علاوہ اور حسن عمل و حسن خلق کی جس قدر تعلیم آپ نے فرمائی ان سب کے لیے آپ ﷺ نے اپنا نمونہ پیش فرمایا، جو کچھ قرآن مجید میں تھا وہ سب آپ ﷺ کی زندگی میں مجسم عمل ہو کر نظر آیا، چند صحابہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا ام المومنین ! حضور اکرم ﷺ کے اخلاق و معمولات بیان فرمایئے؟ انھوں نے جواب میں فرمایا کہ آپ ﷺ کا اخلاق ہمہ صفت قرآن تھا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نہایت فیاض، نہایت سخی، راست گو، نہایت نرم طبع تھے، لوگ آپ کی صحبت میں بیٹھتے تو خوش ہو جاتے، جو شخص آپ کو پہلی دفعہ دیکھتا تو مرعوب ہو جاتا لیکن جیسے جیسے وہ آپ ﷺ سے ملتا آپ سے محبت کرنے لگتا۔ (۵۱)

حضرت مولانا سید زوار حسن شاہ علیہ الرحمہ سیرت نبی کریم ﷺ کو مسلمان کے لیے آج کی اصطلاح میں روڈ میپ (نقشہ سفر) قرار دیتے ہیں، شاہ صاحب کے ارشادات کی روشنی میں یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔

دین و دنیا میں توازن کے لیے
ساری دنیا اور تنہا مصطفیٰ ﷺ

تابش دہلوی

(اپریل ۲۰۰۵ء)

حواشی

۱۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے:

اَلْیَوْمَ یَئِسَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ دِیْنِکُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ ؕ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا (مائدہ، ۳)

”آج کے دن میں نے تمھارے لیے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کردی اور تمھارے لیے اسلام کو بطور دین پسند لے لیا۔ یہ آیت مبارکہ حجۃ الوداع کے موقعے پر نازل ہوئی تھی۔

۲۔ الاحزاب:۲۱

۳۔ احمد بن حنبل، ابوعبداللہ الشیبانی (م ۲۴۱ھ)، المسند، بیروت، داراحیاء التراث العرابی، ۱۹۹۳ء، ج۷، ص۱۳۲، رقم ۲۴۰۸۰

۴۔ آل عمران:۱۳۲

۵۔ سورۃ نور آیت ۲۲ میں ارشاد ربانی ہے:

وَلَا يَأْتَلِ أُولُوا الْفَضْلِ مِنكُمْ وَالسَّعَةِ أَن يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۖ وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا

''اور تم میں جو بزرگی اور وسعت والے ہیں انھیں اپنے قربت داروں اور مسکینوں اور اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کی مدد نہ کرنے کی قسم نہیں کھانی چاہیے بلکہ معاف کرنا اور درگزر کرنا چاہیے۔''

حضرت مسطح حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے خالہ زاد بھائی تھے اور نادار تھے، واقعہ افک سے پہلے حضرت ابوبکر صدیقؓ ان کو خرچ دیا کرتے تھے، جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی برات نازل ہوگئی تو انھیں حضرت مسطح کی طرف سے رنج ہوا، اس لیے انھوں نے آئندہ حضرت مسطح کی مدد نہ کرنے کی قسم کھالی، کیوں کہ واقعہ افک میں حضرت مسطح بھی شامل تھے، اس آیت میں اسی واقعے کا ذکر ہے کہ تم میں سے جو لوگ دینی بزرگی اور دینوی وسعت والے ہیں، انھیں چاہیے کہ وہ رشتے داروں کا خاص خیال رکھیں۔ ان آیات میں حضرت ابوبکر کو اولوا الفضل کہا گیا ہے۔ (تفسیر ابن کثیر، ج۳، ص۲۷۵)

۶۔ مسلم، ج۱، ص۹۰، رقم ۸۵

۷۔ مسلم، ج۱، ص۴۳۶، رقم ۷۸۲

۸۔ بخاری، ج۱، ص۱۸، رقم ۲۶

۹۔ حاکم، مستدرک ج۱، ص۶۲۰، رقم ۱۶۵۵

۱۰۔ حاکم، ج۱، ص۷۵۸، رقم ۲۰۹۰

۱۱۔ ابوداؤد، ج۱، ص۴۹۳، رقم ۱۳۲۵

۱/۱۱۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: علامہ سید سلیمان ندوی/ سیرت النبی ﷺ / کراچی، دارالاشاعت،

۱۹۸۵ء، ج ۶، ص ۲۱۱

۱۲۔ الفاطر: ۲۸

۱۳۔ عن ابن عمر رضی اللہ عنہ عن رسول اللہ ﷺ قال مثل اصحابی مثل النجوم یھتدی بہ فایھم اخذتم بقولہ اھدتیم ۔عبد بن حمید (م ۲۴۹ھ)، المسند، قاہرہ، مکتبۃ السنہ، ۱۹۸۸ء، ج ۱، ص ۲۵۰، رقم ۷۸۳

۱۴۔ البقرہ: ۱۳

۱۵۔ التوبہ: ۴۰

۱۶۔ مولانا سید زوار حسین شاہ عمدۃ السلوک، کراچی، زوار اکیڈمی پبلی کیشنز: ۲۰۰۵، ص ۳۱۱

۱۷۔ ایضاً

۱۸۔ ایضاً

۱۹۔ ایضاً، ص ۳۱۲

۲۰۔ ایضاً

۲۱۔ مولانا سید زوار حسین شاہ، کراچی، زوار اکیڈمی پبلی کیشنز: ۱۹۹۸ء، ص ۳۴

۲۲۔ الحجرات: ۱۳

۲۳۔ آل عمران: ۱۰۲

۲۴۔ الجاثیہ: ۱۹

۲۵۔ آل عمران: ۶۸

۲۶۔ ایضاً

۲۷۔ النساء: ۸۰

۲۸۔ مقالات زواریہ، ص ۹۷

۲۹۔ ایضاً، ص ۱۹۰

۳۰۔ المارج: ۲۴۔۲۵

۳۱۔ مقالات زواریہ، ص ۱۹۱

۳۲۔ بنی اسرائیل:۴۴

۳۳۔ مقالات زواریہ،ص۱۸۲

۳۴۔ طبرانی، المعجم الکبیر، موصل، مکتبۃ العلوم والحکم،۱۹۸۳ء، ج ۱۰،ص ۷۴

۳۵۔ التوبۃ:۱۱۱

۳۶۔ ابوحامد محمد بن محمد الغزالی، احیاء علوم الدین، مصطفیٰ البابی الحلبی، مصر طبع ۱۹۳۹ء، ج ۲،ص ۶۴

۳۷۔ النجم:۳۔۴

۳۸۔ الانعام:۱۵۲

۳۹۔ بنی اسرائیل:۳۵

۴۰۔ المطففین:۱۔۳

۴۱۔ مقالات زواریہ، ۲۳۸ تا ۲۴۰

۴۲۔ الحزاب:۲۱

۴۳۔ مجمع الزوائد، ج ۸،ص ۵۷۴، رقم ۱۴۱۸۸

۴۴۔ آل عمران:۱۵۹

۴۵۔ مقالات زواریہ،ص ۲۷۷

۴۶۔ بخاری، ج ۱،ص ۲۸، رقم ۵۲، مسلم رقم ۱۵۹۹

۴۷۔ النساء:۱۹

۴۸۔ مقالات زواریہ،ص ۳۸۱

۴۹۔ البقرہ:۲۱۳

۵۰۔ التوبۃ:۱۲۸

۵۱۔ مقالات زواریہ،ص ۵۰۳

خطبۂ حجتہ الوداع

پروفیسر ڈاکٹر نثار احمد نے خطبۂ حجتہ الوداع کی تدوین کے ساتھ ساتھ اس کے مختلف پہلوؤں کا جو جائزہ لیا ہے، اور خطبے کے نکات کو جس طرح دستوری دفعات کی صورت میں پیش کیا ہے اس کی وجہ سے یہ مقالہ، جو کتابی صورت میں بیت الحکمت لاہور نے شائع کیا ہے، ایک علمی کارنامہ بن گیا ہے۔ تاریخی پس منظر اور مکمل تشریح وتوضیح جس انداز میں پیش کی گئی ہے اس نے اس تحقیق کو ہر سطح کے پڑھنے والوں کے لیے آسان اور سہل الفہم بنا دیا ہے۔ ہمارے یہاں عام طور پر علمی کتابوں کی زبان اور پیش کش کا انداز اس کے دائرہ افادہ کو محدود کر دیتا ہے۔ نثار صاحب کا اندازِ نگارش عہد حاضر کے محاورے کے مطابق ہے، اور اسی لیے آج کے قاری کے لیے افادے کے امکانات بہت وسیع ہو گئے ہیں۔

جب میدانِ عرفہ میں زبان رسالت مآب ﷺ سے یہ خطبہ ارشاد ہو رہا تھا اس کے ساتھ ہی ربِ کائنات کا یہ اعلان بھی سامنے آیا:

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا

قرآن مجید کی تشکیل کے ساتھ ہی یہ خطبہ بھی تکمیلِ دین کی ایک اور شہادت تھی، ایک بڑے انسانی اجتماع میں جو باتیں کہی جائیں اس کی تفہیم کے لیے اس اجتماع کے موقع اور اہمیت کو سمجھنا بھی ضروری ہے۔ ڈاکٹر نثار صاحب نے خطبے کو پیش کرنے سے پہلے حجتہ الوداع کے سفر کی منازل پیش کی ہیں۔ جس سے سرورِ کائنات ﷺ کے آخری سفر کی روداد بھی سامنے آجاتی ہے۔

ڈاکٹر نثار احمد نے اس منشورِ انسانیت کا تقابل میگنا کارٹا، فرانس کے اعلان حقوقِ انسانی اور امریکہ کی دستاویز حقوق سے بھی کیا ہے، اس تقابل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انسان

تجربات اور خسران میں مبتلا ہونے کے بعد جس منزل تک صدیوں میں پہنچا ہے، وحیِ الٰہی اس منزل تک انسانوں کو ایک لمحے میں پہنچا دیتی ہے۔ جن انسانی دستاویزات کا ہم نے ذکر کیا ہے ان میں اقوام متحدہ کے حقوق انسانی کا بھی اضافہ کر لیجیے تب بھی خطبۂ حجۃ الوداع مثالی کاوشوں سے بہت آگے ہے۔ اس عالمی منشور میں وحدتِ آدم کی اساس کے ساتھ ساتھ مساوات و عدل کی بنیادیں بھی فراہم کی گئی ہیں، اور انسانی حقوق کے ساتھ ساتھ خطبۂ حجۃ الوداع میں معاملات و اخلاقیات کے ساتھ ساتھ عقائد و عبادات کی ایک دنیا بھی ملتی ہے، جس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ صرف خشیت الٰہی اور انسانوں کا اللہ سے تعلق ہی انسانی حقوق کی مضبوط اور دائمی ضمانت ہے۔

خطبۂ حجۃ الوداع کا یہ مستند متن اور اس کی توضیحات ایک عام مسلمان کی اسلام فہمی میں اضافے کا سبب بھی ہیں اور دوسری طرف حقوقِ انسانی کو صحیح تناظر میں دیکھنے کی ایک کوشش بھی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اس کتاب کی ہمارے علمی حلقوں کے علاوہ عام قارئین میں بھی پذیرائی ہوگی۔

(ششماہی ''السیرۃ'' شمارہ ۱۴، اکتوبر ۲۰۰۵ء)

تجلیات محمد ﷺ اور حضرت مجدد الف ثانیؒ

حضرت ابوالبرکات شیخ احمد فاروقی بدرالدین سرہندی جو مجدد الف ثانیؒ کے نام سے معروف روزگار ہیں، ان کے عہد ساز و ہمہ گیر کارناموں کی تفصیلات جاننے کے لیے حضرت مولانا سید زوار حسین شاہ صاحب کی کتاب حضرت مجدد الف ثانیؒ کا مطالعہ کیجیے، یا حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی تاریخ دعوت وعزیمت کی متعلقہ جلد کا۔ اس موقع پر شیخ محمد اکرام کے سلسلۂ کوثریات کا ذکر بھی مناسب ہوگا کہ اس نے اپنے بعض تحفظات کے باوجود حضرت مجدد کے کارناموں کی تفہیم میں مدد دی ہے۔ لیکن اقبال کے چار شعروں میں ان کی شخصیت، ان کا مرتبہ اور ان کا تجدیدی کارنامہ یہ سب سمٹ آیا ہے۔ اور ان ہی اشعار کو ہم اپنے مضمون کا ابتدائیہ بنا رہے ہیں۔

حاضر ہوا میں شیخ مجدد کی لحد پر　　وہ خاک کہ ہے زیرِ فلک مطلع انوار
اس خاک کے ذروں سے ہیں شرمندہ ستارے　　اس خاک میں پوشیدہ ہے وہ صاحب اسرار
گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے　　جس کے نفس گرم سے ہے گرمیٔ احرار
وہ ہندؔ میں سرمایۂ ملت کا نگہباں　　اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار

ان اشعار میں حضرت شیخ سرہندی کے واقف اسرار ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے اس نفسِ گرم کا بھی تذکرہ ہے جس نے مسلمان کو مغل حکمرانوں کی لادینیت کے سامنے سر جھکانے سے بچالیا۔

شیخ عبدالواحد علیہ الرحمہ کا یہ بیٹا چودہ شوال ۹۷۱ھ/۱۵۶۳ء کو پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم میں حفظ قرآن بھی شامل ہے۔ اکابر علما کے حفظ قرآن سے یہ نکتہ ہمارے سامنے آتا ہے کہ ان کے سارے معارف واسرار کا چشمہ کتاب اللہ ہے۔ وہ جس موضوع پر سوچتے، جس پر لکھتے، جو کچھ کہتے

کلام اللہ کی آیات ان کا پیش لفظ بن جاتیں۔ شیخ سرہندی نے ۱۷ سال کی عمر میں مروجہ درسی تعلیم کی تکمیل کر لی۔ والد بھی بڑے عالم اور صوفی تھے، اس لیے علم اور سلوک کی راہیں ساتھ ساتھ طے ہوئیں۔ یہ کتابی علم اور سلوک کی منازل ان کو ایک بڑے معرکے کے لیے تیار کر رہی تھیں۔ اکبر آباد دارالحکومت تھا۔ ۲۲ سال کی عمر میں حضرت شیخ سرہندی نے اکبر آباد (آگرہ) کا رخ کیا۔ یہ سنت الٰہی ہے کہ وہ انبیاء، صالحین اور صدیقین کو ان معرکوں کے لیے تیار کرتا ہے جن سے نبرد آزما ہونا ان کے مقدر میں لکھا ہو۔ یہ کہانی حضرت موسیٰ سے شروع ہوتی ہے اور کون جانے کہ قیام قیامت تک اور کتنے افراد کو اس طرح تربیت دی جائے گی۔

اکبر آباد میں والی اکبر آباد نے اپنی بیٹی کا عقد شیخ احمد سے کرنے کی درخواست کی جس کو ان کے والد نے قبول کر لیا۔ رسم و رہ خانقاہی تو حضرت شیخ کے خمیر میں گندھی ہوئی تھی، اب وہ طریق خسروانہ سے بھی واقف ہو گئے، اور سرہند لوٹ گئے۔ جب حضرت شیخ احمد سرہندی سفرِ حج کے لیے روانہ ہوئے تو دلی کے دوران قیام حضرت خواجہ باقی باللہ سے ملاقات ہوئی۔ روحوں نے نگاہوں کے ذریعے ایک دوسرے کو پہچانا، اور حضرت شیخ احمد نے کچھ دن حضرت خواجہ باقی اللہ کے ساتھ قیام کیا۔ جلد ہی یہ مناسبت بیعت میں تبدیل ہو گئی اور حضرت خواجہ باقی باللہ نے شیخ احمد سرہندی کو سلسلۂ نقشبندیہ میں داخل کر لیا۔ دوسری ملاقات میں کچھ عرصے کے بعد شیخ کو خلافت دی گئی اور تیسری ملاقات میں خواجہ صاحب شیخ کے استقبال کے لیے دلی سے کوسوں باہر تشریف لے گئے۔ اسی ملاقات میں انھوں نے اپنے دو کمسن بچوں کو حضرت شیخ کے حوالے کیا، یوں یہ نسبت روحانی مستقبل کی کہانی بھی بن گئی۔

حضرت خواجہ باقی باللہ اور حضرت شیخ سرہندی کے درمیان خط کتابت مسلسل جاری رہی۔ ابلاغ کے طریقے ہر دور کے مطابق متعین ہوتے ہیں، اس دور میں ذاتی ملاقاتوں کے علاوہ خط کتابت کے ذریعے ہی تعلقات استوار ہو سکتے تھے، اور پند و نصائح آنکھوں کے ذریعے روح تک پہنچ سکتے تھے۔

حضرت شیخ احمد سرہندی نے ہر طبقے کے لوگوں کو بے شمار خطوط لکھے، ان میں سے وہ خطوط جو انھوں نے اپنے مرشد حضرت خواجہ باقی باللہ کو لکھے، اسرار و رموز کا گنجینہ ہیں مگر عام پڑھنے والوں کو ان خطوط کی جگہ ان خطوط پر توجہ دینی چاہیے جو آپ نے اپنے متوسلین اور مریدین کو لکھے۔ امرِ حق کی طرف متوجہ کرنے کے لیے امرا اور ارا کین سلطنت کو لکھے۔ ان خطوط میں علمی نکات اور تصوف کے مسائل بھی ہیں، لیکن اس انداز سے کہ عام لوگوں کو بھی فیض پہنچ سکے۔ حضرت مجدد کے یہ خطوط مکتوبات حضرت مجدد الف ثانی کے نام سے حضرت مولانا سید زوار حسین شاہ صاحب نے چار جلدوں میں اردو میں ترجمہ فرمائے ہیں۔ زیادہ تر خطوط فارسی میں تھے، لیکن کچھ خطوط عربی میں بھی تھے۔ ان چار حصوں کو دفتر کا نام دیا گیا ہے، کل دفتر تین ہیں، دفتر اول کے دو حصے ہیں، مکتوبات کے دفتر اول کے حصہ اول میں ۱۷۱ مکتوبات شامل ہیں اور دفتر دوم میں ۱۷۲ سے ۳۱۳ تک شامل ہیں۔ ہمارے بزرگ چھوٹی سے چھوٹی باتوں میں بھی نسبت نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے قائل تھے اس لیے آج بھی ۳۱۳ کے عدد سے ذہن میں شرکائے بدر کی یاد آ جاتی ہے۔ شاہ صاحب کا یہ حسن خیال تو دیکھیے کہ انھوں نے فارسی اشعار کا ترجمہ بھی اردو اشعار میں کیا ہے، ہمارا خیال ہے کہ دنیائے اسلام کے بیشتر ملکوں میں ہر دور اور ہر صدی میں ایسے لوگ پیدا ہوتے رہے ہیں جنھیں مجدد کہنا زیب دیتا ہے، ان کے میدان مختلف تھے، اس لیے ایک ہی صدی میں مختلف ملکوں میں مجددیت کی شان رکھنے والے بزرگ ایک ساتھ نظر آتے ہیں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک ہی ملک میں ایک ہی صدی میں مختلف لوگ اس شان کے نظر آئیں، لیکن حضرت مجدد الف ثانی کی مجددیت اور وہ بھی الف ثانی کے لیے متفق علیہ رہی ہے۔ اس کا اندازہ اس سے کر لیجیے کہ ان کے مرتبے نے ان کے نام کی جگہ لے لی ہے۔ مجدد صاحب کی اصلاح دین کی کوششوں اور مجددانہ کاوشوں پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ ہمارے خیال میں مجدد صاحب کی کاوشوں کے کئی رخ تھے اور یہ پہلو باہم مربوط ہیں۔ سب سے پہلے تو آپ نے امراض کی تشخیص کی اور پھر مختلف طبقوں کے امراض کا علاج تجویز کیا۔ امرائے سلطنت میں دینی غیرت بیدار کی۔ علما و صوفیہ کو خانقاہ نشینی کے ساتھ ساتھ رسم شبیری ادا کرنے کی

دعوت دی اور آپ کے کارناموں میں سرفہرست دین الٰہی اور اکبری الحاد کا مقابلہ اور اسے اس کے منطقی انجام تک پہنچانا ہے کیفیت یہ ہوگئی تھی کہ سلام کی جگہ اللہ اکبر اور سلام کے جواب کی جگہ جل جلالہٗ نے لے لی تھی۔ اللہ اکبر میں اشارہ اکبر کی برتری کی طرف تھا اور جل جلالہ میں اس کے استقلال کی طرف۔ ہندو مہارانیوں کی خوش نودی کی وجہ سے گائے کی قربانی پر تو پابندی تھی، سور کا گوشت اور شراب حلال اور طیب قرار دی گئی تھی۔ بادشاہ کو ظلِ سبحانی قرار دے کر اسے سبحان کا قائم مقام بنا دیا گیا۔ ہر صبح بادشاہ جھروکے سے درشن دیتا۔ ہندوانہ رسمیں زندگی کا معمول بن گئیں۔ یہ انتہائی خطرناک صورت حال تھی، کیونکہ دین معاشرے ہی میں زندہ رہتا ہے۔ ایک اور فتنہ بھی اس سے کم نہ تھا، وہ تھا علما اور درویشوں کا طرزِ عمل۔ اکبر ابتدا میں ایک راسخ العقیدہ نہیں، خوش عقیدہ مسلمان تھا۔ بزرگان دین کے مزاروں پر حاضری دیتا اور علمی مجالس منعقد کراتا لیکن ان مجلسوں میں علما نے اپنی نشستوں کی ترتیب اور قطار بندی پر جھگڑے شروع کر دیے۔ اس جاہ پرستی کے ساتھ ساتھ مسلکی اختلافات نے سر ابھارا اور اس کے بعد ہی دوسرے مذاہب کو اسلام کے مقابل کھڑا کیا گیا پھر شیخ مبارک اور ان کے بیٹوں نے بادشاہ کو یقین دلایا کہ معاذ اللہ دورِ نبوت محمدی سے اختتام کو پہنچا۔ حضرت مجدد الف ثانی نے اکبری دور کے ان فتنوں کا بھی سدباب کیا جو عہد جہانگیری میں قائم تھے، آپ نے علما کو مسلکی اختلاف اور جاہ پرستی سے منع فرمایا اور درویشوں کو تزکیہ نفس کی طرف راغب کیا۔ یہی دراصل دین کی اندرونی قوت تھی اور آپ نے محسوس کیا کہ اس اندرونی اور حقیقی قوت کے بغیر دینی ڈھانچہ سلامت نہیں رہ سکتا اسی کے ساتھ ساتھ حضرت مجدد نے ان خلفاء اور حق پرستوں کی فصل تیار کی جو اسلام کے باغ کے لیے موسم بہار ثابت ہوئی۔

ان سب کاوشوں اور کوششوں میں نبی اکرم ﷺ سے تعلق کی استواری کو بنیادی حیثیت حاصل ہے حضرت مجدد نے اس رشتے کو دو سطحوں پر استوار کیا۔ ایک تو جذباتی سطح، جس سے حضور ﷺ کی ذات اپنے آپ، اپنے والدین اور سارے انسانوں سے زیادہ عزیز ہو جائے اور دوسری علمی اور ذہنی سطح، جس سے مرتبہ محمدی کا ادراک ہو سکے۔ مکتوبات مجدد الف ثانی

میں نبی اکرم ﷺ کی حیات اور نبوت کے عجب عجب گوشے سامنے آتے ہیں جو علمی شان بھی رکھتے ہیں اور وجدانی کیفیت بھی مگر ہم اپنے اس مطالعے میں بعض نکات کی طرف بوجوہ توجہ نہیں دے سکیں گے۔ مثلاً نبوت محمدی اور ولایت محمدی کے مسائل، ان کا فرق، اور ان کی افضلیت کا معاملہ، حالانکہ مجدد صاحب کا نقطۂ نظر بہت واضح ہے۔ وہ نبوت محمدی کو اصل سمجھتے ہیں۔ لیکن ہمارے نزدیک آج یہ مسائل چنداں قابل التفات نہیں ہیں۔ اسی طرح کمال ذاتی اور جمال ذاتی کے مسائل۔ ہم مکتوبات شریف سے انھی مسائل اور نکات کو پیش کریں گے، جو حضور ﷺ کی نبوت اور ان کی ذات' سے مسلمان کی وابستگی، نبوت محمدی کے اثرات اور ان اثرات سے امت کی اصلاح سے متعلق ہیں۔ اس مطالعے میں بعض مسائل کا ذکر تو کیا گیا ہے لیکن ان کی تفصیلات سے گریز کیا گیا ہے۔

(۲)

مکتوبات مجددیہ میں حق تعالیٰ سبحانہ کی ذات وصفات کا دفتر اپنی ایک الگ شان رکھتا ہے، اور حق تعالیٰ کی صفات اور احسانات میں نبوت کا اجرا بھی شامل ہے، اسی لیے نبی اکرم ﷺ کے ذکر مبارک کے علاوہ مجدد صاحب نے جہاں اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کا ذکر کیا ہے وہاں اس کے رسولوں اور خاص طور پر رسول آخر الزماں ﷺ کا تذکرہ بھی آیا ہے، دفتر دوم کے مکتوب ۳۷ کے مکتوب الیہ ملا عبدالحیٔ جو دفتر دوم کے جامع تھے، ان کے نام مجدد صاحب کے پانچ خطوط ہیں۔ ایک خط کلمہ طیبہ لا الہ الا اللہ کے فضائل اور بیان سے متعلق ہے، خط کا آغاز یوں ہوتا ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، لا الہ الا اللہ حضرت رب جل سلطانہ کے غضب کو ٹھنڈا کرنے والی اس کلمے سے زیادہ کوئی چیز نفع بخش نہیں، جب یہ کلمہ طیبہ آگ میں داخل ہونے کے غضب کو ٹھنڈا کرتا ہے تو دوسرے قسم کے غضب کو جو اس سے کم ہیں بطریق اولیٰ تسکین دیتا ہے۔ (۱)

آگے چل کر مجدد صاحب فرماتے ہیں:

(یہ فقیر) اس کلمہ طیبہ کو رحمت کے ان ننانوے خزانوں کی کنجی محسوس کرتا ہے جن کو آخرت

کے لیے ذخیرہ کیا گیا ہے، اور جانتا ہے کہ ظلماتِ کفر اور کدوراتِ شرک کو دور کرنے کے لیے کلمہ طیبہ سے بڑھ کر شفاعت کرنے والی دوسری کوئی چیز نہیں۔ (۲)

مجدد صاحب کلمہ طیبہ اور کلمہ طیبہ کی شفاعت اور نبی اکرم ﷺ کی شفاعت کو ہم رشتہ کردیتے ہیں، فرماتے ہیں:

جس طرح اس امت کے کبیرہ گناہوں کی سزا کے دفع کرنے میں حضرت محمد رسول اللہؐ کی شفاعت نافع اور کارگر ہے (اسی طرح کلمہ طیبہ کی شفاعت بھی)۔ (۳)

حضرت مجدد الف ثانی نے اس مکتوب میں اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ کو رحمت کے ننانوے خزانوں کی کنجی قرار دیا ہے، اور اس سے اسمائے الٰہی کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے، ان ننانوے ناموں میں (بعض روایات کے مطابق یہ زیادہ ہیں) ہر رحمت ہر احسان آجاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے وجود اور وحدت کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے مجدد صاحب نے علمی اور وجدانی دلیلوں کو یکجا کرتے ہوئے حضور ﷺ کی نبوت کو بدیہی قرار دیا ہے، صرف نبوت کو نہیں بلکہ آپ کے پیغام یعنی اسلام کو بھی۔ مجدد صاحب کے قول کے مطابق یہ نبوت اس درجہ بدیہی ہے کہ اس کے لیے فکر و دلیل کی ضرورت نہیں، لیکن یہ ضروری ہے کہ انسان فکری اور اخلاقی طور پر صحت مند ہو اخلاقی برائیاں نگاہ کی کمزوری کی طرح ہوتی ہیں، اتنے مشکل مسئلے کو مجدد صاحب نے دفتر اول کے مکتوب نمبر ۴۶ میں اس طرح پیش فرمایا ہے:

''حق تعالیٰ و تقدس کا وجود اور اسی طرح اس کی وحدت بلکہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی نبوت بلکہ جو کچھ آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کی طرف سے لائے ہیں وہ سب بدیہی ہیں اور کسی فکر و دلیل کے محتاج نہیں ہیں بشرطیکہ انسان کی قوت مدرکہ تمام ردی آفتوں اور باطنی بیماریوں (مثلاً تکبر، حسد، طول امل، طمع، ریا اور بغض وغیرہا) سے صحیح و سالم محفوظ ہو۔'' (۴)

اس قول سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ رسول اللہ کی نبوت اور مرتبے کو سمجھنے کے لیے آدمی کا فکری طور پر معتدل اور صحت مند ہونا ضروری ہے، محض استدلال سے یہ منزل حاصل نہیں

ہوتی۔یعنی ایمان کے حصول کے لیے قلبی امراض کو دور کرنا ضروری ہے:

''اور یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ استدلال کا میدان بہت تنگ ہے اور دلیل کے ذریعے یقین کا حاصل ہونا بہت دشوار ہے، پس یقینی ایمان حاصل کرنے کے لیے قلبی امراض کو دور کرنے کی فکر کرنا ضروری ہے۔'' (۵)

حضرت مجدد الف ثانی نے رسول اللہ ﷺ کے اسمائے گرامی محمد احمد کے اسرار و رموز سے بھی بحث کی ہے، اسم محمد ﷺ امت مسلمہ کے درود و سلام میں شامل ہے، اذان میں شامل ہے، نماز میں شامل ہے، اور احمد کے بارے میں مجدد صاحب کا ارشاد ہے کہ آپ ﷺ کا یہ اسم آسمان والوں میں بہت معروف ہے، پھر اسم مبارک ذات احد جل شانہ سے بھی بہت قربت حاصل ہے، اور احمد کا میم قرآن مجید کے حروف مقطعات میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے، مجدد صاحب فرماتے ہیں:

''اور احمد آں سرور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا دوسرا اسم ہے جو آسمان والوں میں معروف ہے جیسا کہ علما کہتے ہیں۔اسی وجہ سے ہو سکتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام جو خود اہل سمٰوات میں سے ہو گئے ہیں آں سرور ﷺ کی تشریف آوری کی بشارت اسم احمد کے ساتھ دی ہے، (نیز) اس اسم مبارک کو ذات احد جل شانہ کے ساتھ بھی بہت زیادہ تقرب ہے۔'' (۶)

''اسی طرح میم جو کہ احمد میں اندراج پائے ہوئے ہے وہ قرآن مجید کے حروف مقطعات میں سے ہے، جو سورتوں کے شروع میں نازل ہوئے ہیں اور بڑے دقیق اسرار میں سے ہیں اور اس حرف مبارک میم کو آں سرور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ ایک خاص خصوصیت حاصل ہے۔'' (۷)

حضرت مجدد الف ثانی نے رسول اللہ ﷺ کے مقام خلت، مقام قربت پر مختلف خطوط میں بحث کی ہے، اور اس کے بعد اس نکتے کو واضح کیا ہے کہ شریعت محمدی تمام شریعتوں کو جامع ہے، جب ہم یہ کہتے ہیں کہ شریعت محمدی تمام شریعتوں کی جامع ہے تو ہم اس کی حقیقت کو زیادہ بسیط

بنا دیتے ہیں، اس لیے کہ قرآن تمام کتب سماوی کا مہیمن ہے، اور یہ سلسلۂ رشد و ہدایت ایک ہی ہے، اور حضور ﷺ کی رسالت سے انکار تمام رسولوں کی تکذیب کے برابر ہے، یہ حقیقت کبریٰ قرآن مجید میں متعدد بار دہرائی گئی ہے، مگر یہ بات یاد رہے کہ اگرچہ یہ ہمارا ایمان ہے کہ **لانفرق بین احدمن رسله** مگر اس کی یہ تعبیر ہرگز درست نہیں کہ تمام انبیائے کرام ہم مرتبہ ہیں، ہم نبی ہونے کی حیثیت سے ان میں کوئی تفریق نہیں کرتے، لیکن یہ حقیقت بھی قرآن نے واضح کی ہے کہ

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ (۸)

حضرت مجدد الف ثانی اس حقیقت کو اس طرح روشن فرماتے ہیں:

''حضرت محمد رسول اللہ ﷺ تمام اسمائی وصفاتی کمالات کے جامع ہیں، اور ان سب (اسماو صفات الٰہیہ) کے اعتدال کے طور پر مظہر ہیں، جو کتاب آپ پر نازل ہوئی وہ ان تمام آسمانی کتابوں کا خلاصہ (نچوڑ) ہے جو تمام انبیائے کرام علی نبینا وعلیہم الصلوٰۃ والتسلیمات پر نازل ہوئی ہیں اور نیز وہ شریعت جو آں سرور عالم ﷺ کو عطا فرمائی گئی ہے، تمام گزشتہ شریعتوں کا خلاصہ (عمدہ حصہ) ہے، اور وہ اعمال جو اس شریعت حقہ کے موافق ہیں سب سابقہ شریعتوں کے اعمال میں سے منتخب ہیں۔'' (۹)

یہ ایک ایسا نکتہ ہے کہ مجدد صاحب بار بار اپنے مخاطبین کو اس کی طرف متوجہ کرتے ہیں، کیونکہ اس نکتے کو سمجھنے والے ہی سلسلۂ رشد و ہدایت کے سرحدت تک پہنچ سکتے ہیں، اور وہی اس بات کو سمجھ سکتے ہیں کہ ہمارا اللہ لتنا لطیف وخبیر ہے، حضرت مجدد صاحب کا اس نکتے پر اصرار کرنے کا مفہوم دوسرے الفاظ میں انسانی تاریخ کے تسلسل کی طرف اشارہ ہے:

''پس اس میں کوئی شک نہیں کہ اس شریعت کی تصدیق کرنے والے (خیر الامم) تمام امتوں سے بہتر ہوئے، اور اسی طرح اس شریعت کو جھٹلانا اور اس کے موافق عمل نہ کرنا تمام سابقہ شریعتوں کو جھٹلانا اور ان کے موافق عمل نہ کرنا ہے، اور اسی طرح آں سرور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا انکار تمام اسمائی وصفاتی کمالات کا انکار کرنا ہے اور آپ ﷺ کی

تصدیق کرنا ان سب کی تصدیق کرنا ہے۔"(۱۰)

مجدد صاحب نے نبی اکرم ﷺ کے فضائل کو تفصیل سے بیان فرمایا ہے، یہ ذکر فضائل سیرت کا حصہ ہے، اسی کے ساتھ ساتھ طریقت کے رموز بھی اس میں آ گئے ہیں، اور حقیقت محمدی کے سمجھنے سے حقیقت کائنات اور منشائے تخلیق بھی سامنے آتا ہے، رسول اللہ ﷺ کے فضائل میں مجدد صاحب اس حقیقت پر زور دیتے ہیں کہ آپ ﷺ کی سیرت طریقت و حقیقت پر حاوی ہے، اور شریعت کی تکمیل کا ثبوت ہے، اس سلسلے میں انھوں نے جن آیات سے استنباط کیا ہے وہ یہ ہیں:

اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۝ (۱۱)

اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ (۱۲)

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ (۱۳)

سورۂ انعام کی اس آیت کے متعلق حضرت مجدد فرماتے ہیں:

"حق سبحانہ وتعالیٰ نے اس تیسری آیت کریمہ میں آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ملت کو صراط مستقیم فرمایا ہے۔"(۱۴)

اور یوں حضور مخلوق کو خبردار کرنے والے قرار پائے۔ادب کے لفظ کو مجدد صاحب نے ایک مستقل اصطلاح کے طور پر استعمال کیا ہے اور اس کے لیے ایک حدیث کو اپنے ثبوت کے طور پر پیش کیا ہے، اور احسن ادب سے مجدد صاحب نے ظاہر و باطن کا مجموعی ادب مراد لیا ہے، اس سلسلے میں فرماتے ہیں:

ادبنی ربی فاحسن تادیبی

"میرے رب نے مجھے ادب سکھایا پس مجھ کو بہت ہی اچھا ادب سکھایا۔"

اور باطن ظاہر کی تکمیل کرنے والا ہے اور اس کو مکمل کرنے والا ان دونوں میں بال بھر بھی مخالفت نہیں رکھتا۔مثلاً زبان سے جھوٹ نہ بولنا شریعت ہے اور دل میں جھوٹ کا خیال بھی نہ آنے دینا طریقت و حقیقت ہے (یعنی) اگر یہ خیال کا نہ آنے دینا تکلف اور مشقت سے ہے تو طریقت

ہے اور اگر تکلف کے بغیر حاصل ہے تو حقیقت ہے، پس در اصل باطن جو کہ طریقت و حقیقت کہلاتا ہے ظاہر کو جو کہ شریعت ہے پورا اور کامل کرنے والا ہے۔(۱۵)

ان تمام فضائل کو مجدد صاحب حقیقت محمدی سے وابستہ کرتے ہیں اور اسے ظہور اول قرار دیتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ تمام حقائق اس حقیقت کے اظلال یا سائے ہیں:

''حقیقت محمدی علیہ من الصلوات افضلہا و من التسلیمات اکملہا ظہور اول ہے اور حقیقت الحقائق اس معنی میں ہے کہ دوسرے حقائق خواہ وہ انبیائے کرام علیہم السلام کے حقائق ہوں یا ملائکہ عظام علیہ و علیہم الصلوٰۃ والسلام کے حقائق سب اس کے ظلال کی طرح ہیں اور وہ تمام حقائق کی اصل ہے۔''(۱۶)

ان رموز اور حقیقت محمدی کو مجدد صاحب محض ایک نظری مسئلہ نہیں سمجھتے، بلکہ اس کو اس امت کی نجات اور طریقہ حیات سے منسلک کر دیتے ہیں، یہ اہم نکتہ ہے کیونکہ بعثت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم انسانوں کی فلاح کے لیے ہوئی تھی، تا کہ ایک ایسا گروہ وجود میں آئے، جو خیر امت ہو، اور تمام انسانوں کے لیے ایک نمونہ بن سکے، ایک ایسا گروہ جو زندگی کی چھوٹی سے چھوٹی تفصیل میں اور جزئیات میں سنت محمد ﷺ کو پیش نظر رکھے، اسی لیے مکتوبات شریف میں پیروی سنت کا مضمون طرح طرح سے پیش کیا گیا ہے، یہ تنوع صرف زبان و اسلوب کا نہیں ہے، بلکہ اس میں مکتوب الیہ کی ذہنیت، علمی صلاحیت اور روحانی مدارج کو پیش نظر رکھا گیا ہے، بعض مقامات ایسے ہیں کہ اتباع سنت ایمان کی ایک شرط کی طرح ہمارے سامنے آتی ہے، کہیں اتباع سنت کو علو مدارج کی تدبیر کے طور پر پیش کیا گیا ہے، مجدد صاحب اطاعت رسول کو اطاعت اللہ کی عملی شکل قرار دیتے ہیں، اس آیت قرآنی مَنْ يُطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ(۱۷) کی تفسیر میں بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''حق سبحانہ و تعالیٰ نے اطاعت رسول کو عین اپنی اطاعت قرار دیا ہے، لہٰذا حق تعالیٰ عز و جل کی وہ اطاعت جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت (و اتباع) کی شکل میں نہ ہو وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت نہیں ہے اور اس حقیقت کی تاکید و تحقیق کے لیے کلمہ قد

تاکید یہ لایا گیا ہے، تاکہ کوئی بوالہوس ان دونوں اطاعتوں میں فرق نہ کرے اور ایک کو دوسرے پر ترجیح نہ دے۔"(۱۸)

مجدد صاحب عام طور پر قرآن وحدیث کے معنوی نکات پر بحث کرتے ہیں، لیکن اس آیت کی تفسیر میں انھوں نے تاکید یہ کلمہ قد کے لغوی پہلو پر زور دیتے ہوئے مفہوم کو واضح کیا ہے۔

اتباع سنت کو مجدد صاحب دل کو صیقل کرنے کا نسخہ قرار دیتے ہیں، آپ کے نزدیک شریعت محمدی کی اساس سنت نبوی ہے، جو تمام شریعتوں کی جامع ہے، مجدد صاحب حضور ﷺ سے کمال محبت اور آپ کے دشمنوں سے کمال بغض کو کسی کے ایمان کے ناپنے کا پیمانہ سمجھتے ہیں اور اس خیال کا اظہار کرتے ہیں کہ اتباع سنت کے مدارج سے انسان کی روحانی ترقی کا اندازہ ہوجاتا ہے، مجدد صاحب اس نکتے کی وضاحت بھی کرتے ہیں کہ سنت کا تعلق عبادت سے ہے، عرف اور عادت سے نہیں، ہمارے خیال میں مجدد صاحب نے یہ نکتہ ایک شرعی مسئلے کی طرح بیان کیا ہے، ورنہ ان کے مسلک میں عادات، خورد ونوش، آداب نشست و برخاست یہ سب باتیں سنت کے احاطے میں آجاتی ہیں، اس سلسلے میں انھوں نے جو اسلوب اختیار کیا ہے، اس سے ہمارے اس خیال کی تائید ہوتی ہے اور ان کا نقطہ نظر اس حوالے سے واضح ہوجاتا ہے:

"آنحضرت ﷺ کا عمل دو قسم کا ہے: ایک عبادت کے طریقے پر ہے اور دوسرا عرف وعادت کے طور پر، وہ عمل جو عبادت کے طریقے پر ہے اس کے خلاف کرنا بدعت منکرہ جانتا ہوں اور اس کے منع کرنے میں مبالغہ کرتا ہوں کہ یہ دین میں نئی نئی باتیں پیدا کرنا ہے اور وہ مردود ہے۔ اور وہ عمل جو عرف وعادت کے طور پر ہے اس کے خلاف کرنا بدعت منکرہ نہیں جانتا اور اس کے منع کرنے میں مبالغہ نہیں کرتا کیونکہ اس کا تعلق دین سے نہیں اور اس کا ہونا نہ ہونا عرف وعادت پر موقوف ہے۔"(۱۹)

اتباع سنت سے مدارج روحانی کا کیا تعلق ہے؟ اس مسئلے پر حضرت مجدد نے اپنے ایک مکتوب میں بڑی وضاحت سے لکھا ہے، ہم نے اس سلسلۂ مضمون میں مکتوب الیہم کے ناموں

کا اوران کے حالات کا ذکر نہیں کیا ہے، لیکن اس مکتوب الیہ کا ذکر بوجوہ کیا جاتا ہے، یہ خط سید شاہ محمد مرحوم کے نام لکھا گیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان کے نام صرف یہی ایک مکتوب ہے، اور مکتوب الیہ کے حالات بھی معلوم نہیں، اس خط کے مندرجات سے اندازہ ہوتا ہے کہ مکتوب الیہ نے حضرت مجدد الف ثانی سے کچھ سوالات کیے تھے۔اوران سوالات کے جوابات اس مکتوب میں درج کیے گئے ہیں۔ بنیادی سوال متابعت رسول اللہ ﷺ کے درجوں کا تھا، حضرت مجدد کے مدارج اتباع سنت کو مختصراً پیش کیا جاتا ہے:

''پہلا درجہ عوام اہل اسلام کے لیے ہے۔ یعنی تصدیق قلبی کے بعد اطمینان نفس سے پہلے جو کہ درجۂ ولایت سے وابستہ ہے احکام شرعیہ کا بجالانا اور سنت سنیہ کی متابعت ہے...... متابعت کا دوسرا درجہ آں سرور علیہ وعلی آلہ الصلوٰۃ والسلام کے ان اقوال وٓاعمال کی متابعت ہے جو باطن سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً اخلاق کا درست کرنا اور بُری عادتوں کا دور کرنا اور باطنی امراض اور اندرونی بیماریوں کا ازالہ کرنا وغیرہ...... متابعت کا تیسرا درجہ آں سرور علیہ وعلیٰ آلہ الصلوٰۃ والسلام کے ان احوال واذواق اور مواجید کی متابعت ہے جو ولایت خاصہ کے مقام سے تعلق رکھتے ہیں، یہ درجہ ان ارباب ولایت کے ساتھ مخصوص ہے جو مجذوب سالک یا سالک مجذوب ہوں، جب مرتبۂ ولایت اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے تو نفس بھی مطمئنہ ہو جاتا ہے اور طغیان وسرکشی سے باز آجاتا ہے...... اتباع کا یہ درجہ چہارم علمائے راسخین شکر اللہ تعالیٰ سعیہم کے ساتھ مخصوص ہے، جو اطمینان نفس کے بعد متابعت کی حقیقت کی دولت سے متحقق ہیں...... عالم راسخ وہ ہے جس کو کتاب وسنت کے متشابہات کی تاویل سے بہت حصہ حاصل ہو اور قرآن کریم کی سورتوں کے اوائل میں جو حروف مقطعات ہیں ان کے اسرار سے بھی بہرہ ور ہو...... متابعت کا پانچواں درجہ آں سرور علیہ وعلیٰ آلہ الصلوٰۃ والسلام کے صرف ان کمالات کا اتباع ہے جن کے حاصل ہونے میں علم وعمل کا کوئی دخل نہیں بلکہ ان

کا حصول خداوند جل سلطانہ کے محض فضل و احسان پر موقوف ہے۔ یہ درجہ نہایت ہی بلند ہے، سابقہ درجات کی اس درجے کے مقابلے میں کوئی حقیقت نہیں...... متابعت کا چھٹا درجہ آں سرور علیہ وعلیٰ آلہ الصلوٰۃ والسلام کے ان کمالات کا اتباع ہے جو آں سرور علیہ وعلیٰ آلہ الصلوٰۃ والسلام کے مقام محبوبیت کے ساتھ مخصوص ہیں۔ جس طرح پانچویں درجہ میں کمالات کا فیضان محض فضل و احسان پر تھا اسی طرح اس چھٹے حصے میں بھی ان کمالات کا فیضان محض محبت پر موقوف ہے جو تفضّل و احسان سے بالا و برتر ہے۔ متابعت کا یہ درجہ بھی بہت ہی کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے...... متابعت کا ساتواں درجہ وہ ہے جو نزول و ہبوط سے تعلق رکھتا ہے اور متابعت کا یہ ساتواں درجہ سابقہ تمام درجات کا جامع ہے کیونکہ اس مقام میں نزول بھی تصدیق قلبی ہے اور تمکین قلبی بھی ہے اور نفس کا اطمینان بھی اور اجزائے قالب کا اعتدال بھی ہے۔،، (۲۰)

مجدد صاحب نے جو پہلا درجہ قائم فرمایا ہے وہ عوام اہل اسلام کے لیے آج کے حالات میں ایک خواب معلوم ہوتا ہے، یعنی تصدیق قلبی کے بعد اطمینان نفس سے پہلے احکام شرعیہ کا بجالانا اور سنت کی متابعت پر آج عابد و زاہد اور عام علما بھی اتباع کے اس پہلے مرتبے پر فائز نظر نہیں آتے، زیادہ تشویش ناک یہ بات ہے کہ اتباع سنت کے نام پر جہالت قدیمہ کی جگہ جاہلیت کی نئی شکلیں رونما ہو رہی ہیں دوسرے درجے میں مجدد صاحب نے اخلاق کی درستگی اور باطنی امراض سے نجات کو رکھا ہے، اسلام میں اخلاق کا تصور اور تعریف دونوں تمام دوسرے نظاموں سے مختلف ہے۔ اسلام ہی اخلاق و فرائض اور حقوق کے باہمی رشتے کا نام ہے۔ اور آج ہم حقوق و فرائض کی ادائیگی کے تصور سے بہت دور جا چکے ہیں۔ اور بری عادتوں کا احساس بھی باقی نہیں رہا، بلکہ وہ حسنات میں داخل ہو گئی ہیں۔ ہماری بات کو سمجھنے کے لیے علما و مشائخ کے کسی اجتماع پر نظر ڈالیے، کیسی کیسی زریں قبائیں اور شملے نظر آئیں گے۔ سید سلیمان ندوی نے سیرت النبی میں اخلاق پر بحث کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا ہے کہ ایسا فاخرہ لباس جو اپنے آپ کو دوسروں سے ممیز کرنے کے لیے پہنا جائے وہ بھی تکبر

میں شامل ہے۔ متابعت کا تیسرا درجہ رسول اللہ ﷺ کے ان احوال سے تعلق رکھتا ہے۔ جو درجہ ولایت پر فائز لوگوں کے ذوق کے مطابق ہو، یہ وہ درجہ ہے کہ جہاں نماز ادا کرنے والا رسول اللہ ﷺ کی نماز کی حقیقت و کیفیت سے اپنے آپ کو آشنا کرانے کی سعی و جہد کرے گا۔ اسے مجدد صاحب کے الفاظ میں حقیقت متابعت کہہ لیجیے۔ روزہ رکھنے والے کے سامنے رسول اللہ ﷺ کے روزوں کا ذوق شوق ہوگا، اور وہ صوم کی انھی کیفیات سے گزرنے کی کوشش کرے گا۔ اتباع درجۂ چہارم جیسا کہ آپ نے پڑھا۔ علمائے راسخین کے ساتھ مخصوص ہے۔ اس تسکین قلب کے بعد نفس کے اطمینان کا درجہ ہے۔ اس درجے پر فائز قرآن مجید کے متشابہات، اسرار و رموز کو اپنے نفس پر وارد ہوتے ہوئے محسوس کرتے ہیں۔ یہ درجہ محض ریاضت سے حاصل نہیں ہوتا، بلکہ یہ درجہ انبیائے کرام کی اور بالخصوص سرور کائنات کی اتباع کامل کے نتیجے میں حاصل ہو سکتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے لیے رسول اللہ ﷺ کی سنت کی پیروی کے بعد کسی نئی بات پر عمل کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بدعت سیئہ تو اپنی جگہ ان کے ہاں کسی بدعت حسنہ کی بھی گنجائش نہیں۔ کیونکہ وہ سیرت رسول اللہ ﷺ کو انسان کے تمام احوال و مسائل پر محیط جانتے ہیں، ورنہ مجدد صاحب کے زمانے ہی میں یہ حال ہو چکا تھا کہ ''اس زمانے کے اکثر علما بدعتوں کو رواج دینے اور سنتوں کو محو کرنے میں مشغول ہیں۔ (۲۱)

آج کے حالات میں انھی چار درجوں کا ذکر ہم کافی سمجھتے ہیں، وہ مقامات جن کا تعلق نزول و ہبوط سے ہے، ان کا چھیڑنا محض ایک نظری بات ہوگی۔

اتباع سنت کے سلسلے میں مرزا بدیع الزماں کے نام ایک خط میں مجدد صاحب متابعت سنت کو دنیا کی زیب و زینت سے متصادم قرار دیتے ہیں، اور اس نکتے کو یوں بیان فرماتے ہیں:

''باقی نصیحت یہ ہے کہ صاحب شریعت علیہ الصلوٰۃ والسلام کی متابعت لازم پکڑیں کیونکہ آخرت کی نجات آپ کی متابعت کے بغیر محال ہے، اور دنیا کی زیب و زینت کی طرف التفات و توجہ نہ کریں اور دنیا کے حاصل ہونے یا نہ ہونے کو کوئی اہمیت نہ

دیں۔“(۲۲)

یہاں تصوف کا وہ اعلیٰ درجہ سامنے آتا ہے، جس سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کو پیدا ہی اس لیے کیا گیا ہے کہ اہل ہمت کو دوں فطرت لوگوں سے الگ کیا جا سکے۔ دنیا میں ساری لذتِ اسی لیے تو پیدا کی گئی ہے کہ ان عالی ظرفوں کی شناخت ہو سکے جو دامن جھاڑتے ہوئے عیش وعشرت کے طوفان سے اپنے آپ کو بچا لیتے ہیں، غالب کا یہ شعر دیکھیے:

ہنگامۂ زبونیٔ ہمت ہے انفعال

حاصل نہ کیجیے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو

رسول اللہ ﷺ کے اتباع کا ذکر مکتوبات شریف میں اکثر دعا کی صورت میں ڈھل جاتا ہے، کہ اے اللہ ہمیں سید المرسلین والآخرین کی متابعت کی دولت سے سرفراز فرمایئے اور آپ کی اس متابعت میں عبادات سے لے کر روزمرہ زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے اعمال بھی شامل ہیں، مثلاً قیلولہ۔

آپ کی پسندیدہ متابعت کا ایک ذرّہ تمام دنیاوی لذات اور اخروی تنعمات سے مرتبے میں کہیں زیادہ بڑھ کر ہے، تمام فضیلت آنحضرت ﷺ کی روشن سنت کی تابعداری پر وابستہ ہے، اور تمام بزرگی احکام شریعت کی بجا آوری پر منحصر ہے۔ مثلاً دوپہر کا سونا (قیلولہ) اگر اتباعِ سنت کی نیت سے ہو تو کروڑوں شب بیداریوں سے بہتر، جو آنحضرت ﷺ کی متابعت میں نہ ہوں، اولیٰ وافضل ہے۔(۲۳)

آدمی کی ساری عبادات وریاضت میں اگر متابعت سنت کا خیال نہیں ہے تو اس کے خاطر خواہ نتائج وثمرات حاصل نہیں ہو سکتے بقول شیخ مجدد:

”تمام سعادتوں کا سرمایہ سنت کی پیروی میں ہے اور تمام فسادات کی جڑ شریعت کی مخالفت کرنا ہے۔“(۲۴)

اللہ تعالیٰ کا اجر اس کے اعتبار کے تابع ہے، مگر یہ حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے کہ:

"(سنت کے موافق) ایک ساعت کا عمل ہوسکتا ہے کہ اجر میں ایک لاکھ برس کے نیک عمل کے برابر ہو۔ اس میں راز یہ ہے کہ جو عمل شریعت کے موافق ہوتا ہے وہ حق تعالیٰ کا پسندیدہ ہوتا ہے۔" (۲۵)

اتباعِ سنت کے سلسلے میں ایک اور نکتہ سامنے رکھنا ضروری ہے، وہ یہ کہ صحابۂ کرام کا قول اور عمل بھی سنت رسول اللہ ﷺ کی تکمیلی صورت ہے۔ ہم تک آثار وسنن کا جو ذخیرہ پہنچا ہے وہ انھی نفوس قدسیہ کی وساطت سے پہنچا ہے۔ صحابہ میں یہ سب سے پہلے سابقون الاوّلون آتے ہیں ،جنھوں نے ابتدائے رسالت سے اس اختتام حیات رسول اللہ ﷺ تک آپ کے اعمال وسنن کا مشاہدہ کیا اور ان کا اتباع کیا اور جن کی مثال کو سامنے رکھتے ہوئے ہم ان سنتوں کو جان سکتے ہیں۔ جن کو رسول اللہ ﷺ نے آخر حیات تک جاری رکھا۔ یہ صحابہ کرام ہی ہیں جن کے لیے قرآن کی یہ سند موجود ہے کہ رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ۔ یہ صحابۂ کرام ہی ہیں جن کو دوسروں کے ایمان کی تصدیق کا پیمانہ مقرر کیا گیا ہے۔ یہ صحابہ کرام ہی ہیں جو ہماری نجات کے راستے کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ہمارے لیے یہ ایک اہم مسئلہ ہے کہ تہتر فرقوں میں سے نجات حاصل کرنے والا گروہ کون سا ہوگا؟ اس فرقے کی نشاندہی آنحضرت ﷺ نے فرمادی ہے کہ ما انا علیہ واصحابی۔ حضرت مجدد صاحب اس معاملے میں بہت واضح انداز میں اپنے خیالات کا اظہار فرماتے ہیں:

"(اگرچہ) تہتر فرقوں میں سے ہر فرقہ شریعت کی اتباع کا دعویٰ کرتا ہے اور اپنی نجات کا یقین رکھتا ہے (جیسا کہ آیت شریفہ) كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ (۲۶) (یعنی ہر گروہ اس پر خوش ہے جو اس کے پاس ہے۔) ان کے حال کے مطابق ہے۔ لیکن پیغمبر صادق علیہ من الصلوات افضلہا ومن التسلیمات اکملہا نے ان متعدد فرقوں میں سے ایک ناجیہ (نجات پانے والا) فرقے کی تمیز کے لیے جو دلیل بیان فرمائی ہے وہ یہ ہے۔ الذین هم علی ما انا علیه واصحابی فرقہ ناجیہ وہ ہے جو اس طریقہ پر ہو جس پر میں ہوں اور میرے اصحاب ہیں۔ صاحب شریعت علیہ الصلوٰۃ

والتحیۃ کا ذکر (جس طریقے پر میں ہوں) کافی ہونے کے باوجود اس مقام پر اصحاب کرام کا ذکر اسی لیے ہوسکتا ہے تاکہ سب کو معلوم ہو جائے کہ جو میرا طریقہ ہے وہی میرے اصحاب کا طریقہ ہے۔ لہٰذا نجات کا طریقہ ان حضرات کی اتباع پر موقوف ہے۔،،(۲۷)

حضرت مجدد کا فرمان یہ ہے کہ صحابۂ کرام کے طریقے کی پیروی کے بغیر اتباع سنت کا دعویٰ باطل اور جھوٹ ہے۔ اس خیال کی روشنی میں آج کے مفسرین اور آج کے شارحین دین کے احوال پر نظر ڈالیے جو اسلام کی ایک نئی صورت ہمارے سامنے لا رہے ہیں اور کسی نہ کسی جماعت یا گروہ کے مفادات کی خاطر اسلام کی نئی توضیح کر رہے ہیں۔ اسی طور پر ان گروہوں کے ساتھ ہمدردی ہی ہوسکتی ہے اور ان کے لیے دعائے ہدایت ہی کی جاسکتی ہے جو اصحاب رسول رضی اللہ عنہم پر لعنت کرتے ہیں۔ اگر اتباع کے مقام بلند سے نظر ڈالی جائے تو صحابہ کرام کے حق میں طعن کرنا نبی اکرم ﷺ کے حق میں طعن کرنے کے برابر ہے، اسی خط میں (۲۸) مجدد صاحب نے اس حقیقت کو بھی ظاہر فرمایا ہے کہ صحابہ کرام پر طعن ان کی ذات تک محدود نہیں۔ بلکہ اس کا رشتہ ان اعمال، ان احکام اور ان نواہی سے بھی ہے جو ان کے ذریعے ہم تک پہنچے ہیں۔ مجدد صاحب فرماتے ہیں:

''جو شرعی احکام قرآن وحدیث کے واسطے سے ہم تک پہنچے ہیں وہ سب انھی (صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین) کی نقل وروایت کے وسیلے سے ہیں۔ جب وہ (اصحاب کرام) مطعون ہوں گے تو ان کی نقلیں اور روایتیں بھی مطعون ہوں گی۔،،(۲۹)

صحابۂ کرام پر طعن کرنے والے اپنے موقف کی حمایت میں یہ بات کہتے ہیں کہ ہم صحابۂ کرام میں سے کئی کو اپنے لیے دلیل سمجھتے ہیں اور وہ اس سلسلے میں سلمان فارسی، حضرت مقداد، صہیب رومی، اور بلال حبشی کا نام لیتے ہیں ان کے اس عمل یا منطق کی کوئی بنیاد نہیں، کیونکہ اصحاب بدر اور اصحاب بیعت رضوان کی منزلت کی شہادت خود رب ذوالجلال نے دی ہے اور یہ نکتہ

بھی سامنے رکھنا چاہیے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے خلفائے ثلاثہ کا ساتھ دیا۔ انھیں مشورہ دیا، ان کی خیر خواہی کی اور ان سے بیعت فرمائی، یوں عمل علی سے انکار دراصل خود حضرت علی کے مرتبہ اور ان کی صداقت سے انکار کے مترادف ہے۔

صحابہ کرام کے علوئے مرتبہ کا تعلق نبی کریم ﷺ کی صحبت اور تربیت سے ہے، صحابی ہونا ایک ایسا شرف ہے کہ اس میں کوئی غیر صحابی شریک نہیں ہوسکتا، قرآن مجید کی یہ آیت مقدسہ اسی یکجائی، اسی شرف کی شہادت ہے کہ:

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ؗ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِى التَّوْرٰىةِ ۖۛ وَمَثَلُهُمْ فِى الْاِنْجِيْلِ ۚ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْـَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ؕ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ۝ (۳۰)

ظاہر یہ ہے کہ تمام صفات بعد کے لوگوں میں موجود تھیں اور بعد کے لوگوں میں بعض سابقون الاولون کی شان رکھتے ہیں۔ قرآن مجید میں اس کا اشارہ موجود ہے لیکن ابو بکر جیسا محبت کا فیض، عمر جیسی جلالت، اور کفر شکنی، عثمان جیسی مومنوں پر شفقت اور علی جیسے سجدے کسی کو نصیب نہیں ہوئے۔ رسول اللہ ﷺ کی نظر کیمیا ساز نے ان کے سینوں کو ہوا و ہوس سے پاک کر دیا۔ اور انھوں نے اپنی زندگی کی ہر صلاحیت اور ہر قوت رسول اللہ ﷺ کی تائید میں صرف کی۔ ان کے دن رات اللہ اور اس کے رسول کے لیے تھے، انھوں نے اپنی آواز کو رسول کی آواز سے پست کر لیا تھا۔ اگر اتنی سی بات پوچھی جاتی کہ آج کون سا دن ہے؟ تو جواب میں کہتے کہ اللہ اور رسول کو بہتر معلوم ہے۔ مجدد صاحب ایک مکتوب میں مرتبہ صحابہ کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں:

''(صحابہؓ) کے نفوس حضرت خیر البشر علیہ وعلیٰ آلہ الصلوٰۃ والسلام کی صحبت میں ہوا و

ہوس سے پاک و صاف ہو چکے تھے اور ان کے سینوں سے عداوت و کینہ نکل چکا تھا اور ان کو واضح ہو جائے گا کہ یہی وہ اکابر دین اور کبرائے اسلام ہیں جنھوں نے کلمۂ اسلام کے بلند کرنے اور حضرت سید الانام کی مدد اور دین متین کی تائید میں رات دن خفیہ اور علانیہ اپنی طاقتوں اور مالوں کو خرچ کیا ہے اور اپنے خویش و قبیلوں اور اولاد و ازواج وطن و گھر بار، کھیتی باڑی، کنوئیں اور باغ و انہار وغیرہ سب کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وعلیہم الصلوٰۃ والسلام کی محبت میں چھوڑ دیا تھا اور رسول اللہ ﷺ کے نفس کو اپنے نفسوں پر ترجیح دی تھی اور اپنی جان و مال اور اولاد کی محبت پر رسول اللہ ﷺ کی محبت کو اختیار کیا تھا یہی وہ حضرات ہیں کہ جنھوں نے وحی اور فرشتہ کا مشاہدہ کیا تھا اور معجزات و خوارق کو دیکھا تھا یہاں تک کہ ان کا غیب شہادت سے اور ان کا علم عین سے بدل گیا تھا یہی وہ حضرات ہیں جن کی تعریف اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں ان الفاظ کے ساتھ فرماتا ہے۔ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ (۳۱) اللہ تعالیٰ ان سے راضی اور وہ اللہ تعالیٰ سے راضی ہیں نیز ذٰلِکَ مَثَلُهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَمَثَلُهُمْ فِی الْاِنْجِیْلِ (۳۲) توریت اور انجیل میں ان کی یہی مثال ہے۔ یقیناً جب تمام اصحاب کرامؓ ان بزرگی اور فضائل میں شریک ہیں تو خلفائے راشدین جو تمام اکابرین صحابہ سے افضل ہیں ان کی فضیلت و بزرگی کس قدر رہو گی یہی وہ فاروقؓ ہیں جن کی شان میں حضرت حق سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے رسول سے فرمایا: یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ (۳۳) اے نبی تمھارے لیے اللہ تعالیٰ کافی ہے اور وہ مومن جنھوں نے تمھاری اتباع کی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا ہے کہ اس آیہ کریمہ کے نازل ہونے کا سبب حضرت فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اسلام ہے۔ (۳۴)

بات صرف صحابۂ کرام تک محدود نہیں۔ یہ محض ماضی کی داستان نہیں بلکہ یہ حال کی حقیقت بھی ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی رسالت جاری و ساری ہے، وران کی ذات کے طفیل مسلمانوں کو

خیرِ امم کہا گیا ہے۔ مولانا ابوالحسن علی کے خیال کے مطابق رسول اللہ ﷺ کی بعثت صرف نبیِ آخر الزماں کی بعثت نہیں ہے بلکہ آپ کی بعثت کے ساتھ ایک امت بھی مبعوث فرمائی گئی ہے، حضرت مجدد الف ثانی فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کو خیر امت اس لیے قرار دیا گیا کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کی تصدیق کی ہے اور یہی سبب ہے کہ اس امت کے افراد کے لیے چھوٹا عمل بھی خیر کثیر کا ثواب رکھتا ہے اور اس کی مثال میں مجدد صاحب نے اصحاب کہف کو پیش کیا ہے:

''اصحاب کہف (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) نے یہ اعلیٰ درجات صرف ایک ہی نیکی کے ذریعے سے حاصل کیے ہیں اور وہ نیکی یہ تھی کہ وہ دشمنان دین کے غلبے کے وقت نور ایمان و یقین کے ساتھ حق تعالیٰ کے دشمنوں (کے مقام) سے ہجرت کر گئے تھے۔'' (۳۵)

مجدد صاحب ہجرت کو ایک مسلسل عمل قرار دیتے ہیں، فرماتے ہیں:

''اگر ظاہری ہجرت میسر نہ ہو سکے تو باطنی ہجرت کو پوری طرح مدنظر رکھنا چاہیے۔ مخلوق کے درمیان رہ کر ان سے الگ رہنا چاہیے (امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے بعد کوئی اور امر (راستہ) پیدا فرما دے گا)'' (۳۶)

انہوں نے اس ہجرت کا خیال قرآن کریم سے اخذ کیا ہے، اپنی روشِ حیات کو بدل دینا یا اپنی زندگی کے نہج کو حکم الٰہی کے تابع کر کے دنیا سے کٹ جانا بھی ہجرت ہے، قرآن حکیم کے الفاظ میں:

اِنِّیْ مُھَاجِرٌ اِلٰی رَبِّیْ (۳۷)

ہم نے گزشتہ سطور میں جو کچھ عرض کیا ہے ان کا تعلق رسول اللہ ﷺ کی رسالت، آپ کی اتباع، صحابہ کرام اور امت محمدی سے ہے رسول اکرم ﷺ کی حیات، معجزات اور مختلف پہلوؤں کے بارے میں مکتوبات میں بہت سے نکتے ملتے ہیں۔ معراج کے سلسلے میں مجدد صاحب علما کے اختلاف کے باوجود نبی اکرم ﷺ کی معراج بدنی کے قائل ہیں۔ وہ اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ

رسول اللہ ﷺ نے عرش و کرسی اور مکان و زمان سے گزر کر اپنا سفر مکمل کیا لیکن انھوں نے علما کے اختلاف کا ذکر کر دیا ہے:

''حضرت محمد رسول اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہٖ وسلم جو محبوب رب العالمین اور تمام اولین و آخرین موجودات میں سے بہترین ہیں باوجودیکہ معراج بدنی سے مشرف ہوئے اور عرش و کرسی سے گزر کر مکان و زمان سے بھی بالا چلے گئے۔ باوجود قرآنی اشاروں کے آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام کی رویت میں علما کا اختلاف ہے اور اکثر علما آنحضرت علیہ وعلیٰ آلہ الصلوٰۃ کی عدم رویت کے قائل ہیں چنانچہ حضرت امام غزالیؒ فرماتے ہیں:

والا صح انہ علیہ وعلیٰ آلہ الصلوۃ والسلام ماارای ربہ سبحانہ لیلۃ المعراج صحیح یہی ہے کہ آنحضرت علیہ علی آلہ الصلوۃ والسلام نے معراج کی شب میں اپنے رب کو نہیں دیکھا۔''(۳۸)

ایک دوسرے مقام پر مجدد صاحب جسد عنصری کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کے سفر اور سیر کا ذکر کرتے ہیں:

''آنحضرت ﷺ کو شب معراج میں اپنے جسد عنصری کے ساتھ جہاں تک حق تعالیٰ نے چاہا سیر کرائی گئی اور آپ کے سامنے جنت دوزخ پیش کی گئی (سامنے لائی گئی) اور آپ کی جانب وحی آئی جو کچھ کہ آئی اور وہاں آپ (حق تعالیٰ کی) رویت بصری سے مشرف کیے گئے اور اس طرح کی معراج آنحضرت ﷺ ہی کے لیے مخصوص ہے۔''(۳۹)

آنحضرت ﷺ کی بشریت کا معاملہ بھی بہت نازک ہے، آپ ﷺ کے بشر ہونے میں تو کوئی شبہ نہیں کر سکتا۔ یہ جزو ایمان ہے۔ کیونکہ قرآن نے آپ ہی کی زبانی کہلوایا ہے:

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (۴۰) اور کلمۂ توحید محمد رسول اللہ کا ٹکڑا استقلالاً اس کا اشارہ دے رہا ہے۔ اس کی وجہ جناب مالک رام (عبدالمالک) کے خیال کے مطابق مسلسل اس حقیقت کا اعادہ تھا کہ محمد اللہ

کے رسول تھے، محمد اللہ کے بیٹے نہیں تھے۔ کیونکہ اس گمراہی میں بہت سی قومیں مبتلا ہوئیں۔ لیکن مجدد صاحب نے اس نکتے پر زور دیا کہ دوسرے انسانوں کی طرح ان کو بشر جاننا ان کی عظمت کا انکار ہے۔ یہ تفریق اور فرق ہمیں زندگی کے ہر شعبے میں نظر آتا ہے۔ آج پاکستان کے پندرہ کروڑ باشندوں میں سے ایک لاکھ سے زیادہ شاعر ہیں، لیکن کیا ان شاعروں کا نام غالب واقبال کے ساتھ دیا جاسکتا ہے۔ آج کے بیشتر لیڈر عوام کی رائے کے پیچھے چلتے ہیں۔ کیا ان کو حقیقی قائد سمجھا جاسکتا ہے۔ یہ ناقص مثالیں نبیوں بالخصوص نبی آخرالزماں کے علوئے مرتبت کے لیے بالکل ناکافی ہیں، آپ کو اللہ نے گناہوں سے معصوم خلق کیا تھا، جب کہ گناہ خمیر بشر میں شامل ہے، بشر مثلکم کا تعلق محض عناصر جسمانی سے ہے۔ اور ہم میں سے کون کہہ سکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی تخلیق میں کون سی مٹی استعمال کی گئی تھی، یہ نکتہ جس کی اور زیادہ تفاصیل ضروری ہیں، مکتوبات میں یوں آیا ہے:

''جن مجرموں نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ والسلام کو بشر کہا اور دوسرے انسانوں کی طرح ان کو تصور کیا تو لازمی طور پردہ (ان کے) منکر ہوگئے اور جن سعادت مندوں نے آپ علیہ السلام کو رسالت اور رحمت عالمیان کے عنوان سے جانا اور باقی تمام لوگوں سے ممتاز دیکھا وہ ایمان کی دولت سے مشرف ہوگئے اور نجات پاگئے۔''(۴۱)

ایک دوسرے موقعے سے مجدد صاحب خلق محمدی کے سلسلے میں فرماتے ہیں:

''جاننا چاہیے کہ خلق دوسرے تمام افراد انسانی کی پیدائش طرح نہیں ہے بلکہ افراد عالم میں سے کوئی بھی فرد ان کی پیدائش کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتا کیونکہ آپ ﷺ باوجود عنصری پیدائش کے حق جلّ وعلیٰ کے نور سے پیدا ہوئے ہیں جیسا کہ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے: خلقت من نور اللہ میری پیدائش اللہ تعالیٰ کے نور سے ہوئی ہے۔''(۴۲)

خلق محمدی اور ایسے ہی دوسرے مسائل کے ساتھ ساتھ حضرت مجدد صاحب نے حقیقت

محمدی اور حقیقت احمدی میں یہی فرق کیا ہے۔ اور یہ روحانی نکتہ سمجھیے، مجدد صاحب اس بات کو دہراتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت حضرت آدم کی تخلیق سے پہلے حاصل تھی: کنت نبیاً و آدم بین الماء و الطین ، اور مجدد صاحب حقیقت احمدیت کا تعلق عالم امر سے قائم کرتے ہیں:

"یہ بات باعتبار حقیقت احمدی کے تھی اور اس کا تعلق عالم امر سے ہے اور اسی اعتبار سے حضرت عیسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام نے، جو کلمۃ اللہ ہوئے ہیں اور عالم امر سے زیادہ مناسبت رکھتے ہیں اور (جنھوں نے) آں سرور علیہ وعلیٰ آلہ الصلوٰۃ والتسلیمات کی تشریف آوری کی بشارت اسم احمد سے دی ہے فرمایا ہے:

وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّأْتِيْ مِنْ بَعْدِي اسْمُهٗ أَحْمَدُ (۴۳) اور خوشخبری دینے والے ایک رسول کی جو میرے بعد آئے گا اور اس کا نام احمد ہے۔ (۴۴)

مجدد صاحب کے خطوط میں طالبان راہ حق کے مقامات اور ترقیوں کا ذکر ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ انبیائے کرام کے مراتب اور جلالت شان پر تفصیلی بحث ہے۔ قرآن کی تعلیمات کے مطابق ہم تمام انبیاء پر ایمان لاتے ہیں، لیکن ان کے مراتب کا فرق بھی واضح ہے۔ مجدد صاحب محبت ذاتیہ سے بلند تر مقام حب کو قرار دیتے ہیں، اور "مقام رضا محبت اور حب کے مقام سے بھی بالاتر ہے، کیونکہ مرتبۂ رضا مرتبہ محبت سے بلند ہے۔" (۴۵)

اور آخری بات یہ کہ محمد عربی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مرتبے اور شان کو اس دنیا والے نہیں پہچان سکتے، کیونکہ یہاں حق اور باطل ملے ہوئے ہیں، جب یوم جزا آئے گا، تو حضور ﷺ کی عظمت و بزرگی واضح ہو جائے گی۔

حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی شان کو اس دنیا میں کیا پا سکتے ہیں اور آپ کی عظمت و بزرگی کو اس جہان میں کیا پہچان سکتے ہیں کیونکہ اس دار ابتلا (دنیا) میں سچ جھوٹ کے ساتھ اور حق باطل کے ساتھ ملا ہوا ہے لیکن قیامت کے دن آپ ﷺ کی عظمت و بزرگی معلوم ہو جائے گی۔ جب کہ آپ ﷺ پیغمبروں کے امام ہوں گے اور ان کی شفاعت کرنے والے ہوں گے، اور سرت آدم

اوران کے علاوہ تمام انبیاء والمرسلین من الصلوات افضلہا ومن التسلیمات کے جھنڈے کے نیچے ہوں گے۔ (۴۶)

(ششماہی ''السیرۃ، شمارہ ۱۴ را کتوبر ۲۰۰۵ء)

حواشی

۱۔ مکتوبات حضرت مجدد الف ثانی، دفتر دوم، مکتوب ۳۷، ص ۱۲۸

۲۔ ایضاً

۳۔ ایضاً

۴۔ مکتوبات، دفتر اول، مکتوب ۴۶، ص ۱۷۰

۵۔ ایضاً

۶۔ مکتوبات، دفتر سوم، مکتوب ۹۴، ص ۲۸۰

۷۔ ایضاً

۸۔ البقرہ: ۲۵۳

۹۔ مکتوبات، دفتر اول، مکتوب ۷۹، ص ۲۳۷۔۲۳۸

۱۰۔ ایضاً، ص ۲۳۸

۱۱۔ القلم: ۴

۱۲۔ یٰسین: ۳

۱۳۔ انعام: ۱۵۳

۱۴۔ مکتوبات، دفتر اول، مکتوب ۴۱، ص ۱۵۱

۱۵۔ ایضاً

۱۶۔ مکتوبات، دفتر سوم، مکتوب ۱۲۲، ص ۳۷۸

۱۷۔ النساء:۸۰

۱۸۔ مکتوبات، دفتر اول، مکتوب۱۵۲، ص۳۴۱

۱۹۔ مکتوبات، دفتر اول، حصہ دوم، مکتوب۲۳۱، ص۱۳۹

۲۰۔ مکتوبات، دفتر دوم، مکتوب۵۴، ص۱۹۱۔۱۹۶

۲۱۔ ایضاً، ص۱۹۴

۲۲۔ مکتوبات، دفتر اول، مکتوب۴۷۔۲۲۷

۲۳۔ مکتوبات، دفتر اول، مکتوب۱۱۴، ص۳۰۰

۲۴۔ ایضاً، ص۳۰۱

۲۵۔ ایضاً

۲۶۔ روم:۳۲

۲۷۔ مکتوب دفتر اول، مکتوب۸۰، ص۲۴۰

۲۸۔ دفتر اول، مکتوب۸۰

۲۹۔ ایضاً، ص۲۴۱

۳۰۔ فتح:۲۹

۳۱۔ توبہ:۱۰۰

۳۲۔ فتح:۲۹

۳۳۔ انفال:۶۴

۳۴۔ مکتوبات، دفتر دوم، مکتوب۹۶، ص۳۰۹

۳۵۔ دفتر اول، مکتوب۴۴، ص۱۶۴

۳۶۔ ایضاً

۳۷۔ عنکبوت:۲۶

۳۸ دفتر اول، حصہ دوم، مکتوب۲۷۲، ص۳۱۶

۳۹۔ مکتوبات، دفتر اول، مکتوب ۱۳۵، ص ۳۲۴

۴۰۔ کہف: ۱۱۰

۴۱۔ مکتوبات، دفتر سوم، مکتوب ۶۴، ص ۱۸۸

۴۲۔ مکتوبات، دفتر سوم، مکتوب ۱۰۰، ص ۳۰۹

۴۳۔ الصّف: ۶

۴۴۔ مکتوبات، دفتر اول، حصہ دوم، مکتوب ۲۰۹، ص ۷۹

۴۵۔ مکتوبات، دفتر دوم، مکتوب ۷۔ ۴۱

۴۶۔ ایضاً

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

''بفیضِ والدِ مرحوم ہوں فدائے رسول
ضیائے عشق مری فکر کی اُڑان میں ہے

عشق رسول ﷺ سے بڑا تر کہ اور عظیم تر میراث کس بیٹے کو اپنے باپ سے مل سکتی ہے؟ نعیم تقوی صاحب خوش نصیب ہیں کہ سیّد ضیا حسین تقوی ضیا اعتمادی مرحوم کی آغوش میں آنکھیں کھولیں اور اُن کے فیضانِ نظر سے عشق کی ضیا اور آدابِ فرزندی سے بہرہ مند ہوئے۔ نعیم تقوی کی ذات اور کردار اُن کے والد کی سیرت کا عکسِ جمیل اور الولد سر لابیہ کی تفسیر ہے۔ فلسفیانہ اندازِ فکر، ادبی ذوق، مذاقِ شعر گوئی، مشرقی اور مغربی علوم سے بہرۂ وافر، یہ سب باتیں بڑی اہم ہیں لیکن ذاتِ رسالت مآب علیہ الصلوٰۃ والسلام سے والہانہ وابستگی اُن کی شخصیت کا روشن ترین باب ہے اور یہ وابستگی ایسی صراطِ مستقیم بن گئی ہے کہ ایک طرف تو وہ توحید کے باب میں بڑے غیرت مند ہیں اور اپنے رب کی احدیت پر کسی کا سایہ نہیں پڑنے دیتے تو دوسری طرف وہ مقامِ رسالت کے ایسے شناسا ہیں کہ ہر تصور، ہر عقیدے اور ہر دوسری ذات کو اُسی ذاتِ اقدس و اعظم کے حوالے سے دیکھتے ہیں۔''

۱۹۷۸ء میں مرحوم ڈاکٹر نعیم تقوی کی نعتوں کا مجموعہ ''بصیرت'' شائع ہوا تھا اور اُس مجموعے پر میرے پیش لفظ کی ابتدا جن الفاظ سے ہوئی تھی، وہ آپ نے ابھی ملاحظہ فرمائے۔ یہ مختصر سا نعتیہ مجموعہ اپنے رسولِ اعظم و اکرم ﷺ کے ساتھ نعیم تقوی کی وابستگی اور حسنِ عقیدت کی دستاویز ہے۔ نعیم مرحوم و مغفور کی سیرتِ طیبہ پر یہ کتاب ''محمد رسول اللہ'' اُن کی وفات کے کئی سال بعد شائع ہو رہی ہے۔ نعتیہ مجموعے میں انھوں نے شعر کے آہنگ میں مرتبۂ ختمی مرتبت ﷺ کی نشان دہی کی

تھی اور کتابِ سیرت میں اُن کا عقیدہ، وابستگی رسول دلائل کے ساتھ ہمارے سامنے آئی ہے مگر ان دونوں کتابوں میں جو ربطِ باہمی ہے اُس کی مثالیں ہمارے ادب میں مشکل سے ملیں گی۔ مرحوم پروفیسر ڈاکٹر نعیم تقوی کی منزلِ فکر، حبِ رسولؐ کی شمعوں سے فروزاں ہے اور بیماریوں کے باوصف اُن کی زندگی ایسی تھی کہ اُن کے جاننے اور پہچاننے والوں نے پیشانیٔ وقت کو اُن کے قدموں پر جھکا دیکھا۔ یہ فیضانِ رسول عربیؐ تھا:

تھا نہ ادراک ذرا جنبشِ لب سے پہلے
منزلِ فکر تھی ویران رسولِ عربیؐ

○

اُس کے قدموں پر جھکی رہتی ہے پیشانیٔ وقت
نام لے کر جو ترا محوِ سفر رہتا ہے

نعیم تقوی نے اِس خاک داں میں ۵۳ر سال، ۵ر ماہ، ۴ر دن گزارے اور پھر نفسِ مطمئنہ کے ساتھ اپنے رب کے حضور جا پہنچے۔ پشیمانی، حرص اور دودلی کا کوئی لمحہ اُن کی زندگی میں نہیں آیا۔

حبِ رسول کا واحد اور یقینی معیار اتباعِ رسول ہے۔ مرحوم نعیم تقوی نے رسالت کے رنگوں سے اپنی زندگی کو مزین کرنے کی امکان بھر کوشش کی۔ وہ ایک مثالی شوہر، چاہنے والے بھائی اور شفیق باپ، قابلِ اعتماد دوست اور رہنما استاد تھے۔ نعیم تقوی معلم کے منصب اور ذمہ داریوں سے خوب واقف تھے۔ معلم چند گھنٹوں کے لیے کسی تعلیمی ادارے کا ملازم نہیں ہوتا بلکہ یہ تو ہمہ وقت کام اور زندگی بھر کا سودا ہے۔ یہ ہمارے لیے میراثِ نبوی ہے۔ حضور سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: بعثت معلما: ''مجھے معلم بنا کر مبعوث فرمایا گیا ہے۔'' آپ معلم اخلاق وحکمت تھے اور قرآنِ حکیم میں یہ بات ایک مرتبہ سے زیادہ بیان کی گئی ہے۔ اردو کالج میں ایم۔اے اردو کی تدریس کا بندوبست تھا۔ جز وقتی اساتذہ بھی نعیم کی کاوشوں اور محبت کے نتیجے میں پڑھانے جاتے تھے، ورنہ کالج کے اربابِ حل وعقد کو چنداں دلچسپی نہ تھی۔ مرحوم کا مقصد یہ تھا کہ طلبہ ممتاز اساتذہ کو دیکھیں

اور اُن سے فیض اُٹھائیں۔ یہ اساتذہ کورس مکمل نہیں کرا سکتے تھے اور ان سب کے کورسوں کی تکمیل کا فریضہ نعیم تقوی نے سنبھال لیا تھا۔ وہ ڈوب کر پڑھاتے کہ یہی اُن کا ارمان اور مقصدِ حیات تھا۔ اپنے طلبہ کے مسائل اور مشکلات سے بھی وہ واقف رہتے۔ میں جب کبھی اُنھیں اسپتال دیکھنے گیا تو اُس عالم میں بھی اُنھوں نے کسی نہ کسی طالبِ علم کی کسی ضرورت کا ذکر کیا کہ اُس کا یہ کام ہو جائے۔ ان طالبِ علموں سے اُن کا تعلق بڑا مضبوط تھا۔ وہ اُن کے ذاتی مسائل اور مشکلات کو بھی حل کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتے، لیکن طالب علموں سے اس قربت کے باوجود وہ مناسب فاصلہ برقرار رکھتے جو استادوں شاگردوں کے درمیان ضروری ہے، ورنہ آج تو استاد اور شاگرد ایک ساتھ کسی کنجِ تنہائی میں سگریٹ بھی پیتے ہیں اور مشروبات سے بھی شغل کرتے ہیں۔ نعیم تقوی جب بھی کلاس روم میں داخل ہوتے تو معلم اعظم ﷺ کے خیال اور یاد کی مشعلوں کے ساتھ اور ساری فضا نور ہی نور ہو جاتی۔

مرحوم کی یادوں کے سائے میرے ذہن کے افق پر پھیلتے جا رہے ہیں اور میں بادل ناخواستہ ان یادوں کے نقوش کو اپنے نہاں خانۂ دل میں محفوظ کرتے ہوئے کتاب کی طرف آتا ہوں۔

''خدا اور کائنات'' کے سلسلے اور موضوع پر مرحوم تقوی کی تقریریں ''لا الٰہ الا اللہ'' کے عنوان سے ان شاء اللہ جلد شائع ہوں گی اور ''محمد رسول اللہ'' کے عنوان سے سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سیرت کے اہم پہلوؤں پر اُن کی تقریروں اور تحریروں کا مجموعہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ نعیم تقوی معلم بھی تھے، باسلیقہ مقرر بھی اور شائستہ اہل قلم بھی۔ یہ تینوں صفات ان کتابوں میں یک جا ہو گئی ہیں۔

''محمد رسول اللہ'' کے ابتدائیہ میں مرتبۂ محمد عربی ﷺ سے متعلق نہایت خیال افروز مگر مختصر گفتگو کی گئی ہے۔ وہ رسول جو عالم انسانیت کو متحد کرنے آیا تھا، اُس کے بارے میں یہ اُمت اس باب میں منقسم ہو گئی ہے کہ وہ بشر تھے یا نور۔ اُن کے بشر ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ قرآن نے

اُن کی زبان سے کہلوایا ہے کہ انا بشر مثلکم، لیکن اسے بہت سے لوگوں نے صحیح سیاق و سباق اور ذاتِ محمدی کے پس منظر نہیں سمجھا اور یوحی الی سے الگ کردیا۔ 'وحی' اللہ کی راست رہنمائی کا نام ہے جو نبی کی زبان کو اللہ کی زبان (بلاتمثیل) بنا دیتی ہے، اللہ کا ارادہ نبی کے ذریعے اس عالم امکان میں پورا ہوتا ہے، نبی کا ہاتھ اللہ کا ہاتھ بن جاتا ہے۔ جس کا مشاہدہ تاریخ میدانِ بدر میں کر چکی ہے۔ جب نبی اکرم ﷺ نے خاک کی تین مٹھیاں کفار کے لشکر کی طرف پھینکیں تو کوئی ایسی آنکھ نہ تھی جس کو مٹی کے ذرّوں نے بے قرار نہ کردیا ہو۔ نبی ہر غلطی اور گناہ سے محفوظ و معصوم ہے۔ حضور ﷺ اور اللہ تعالیٰ کی رفاقت نے جہانِ نو کی تعمیر کی ہے اور اس طرح کہ آغاز بعثت سے قیامت تک انسانی تاریخ کا طویل دور ''عہدِ محمدی'' ہی کہلائے گا۔ نعیم تقوی نے یہ نکتہ جس طرح پیش کیا ہے اُس پر ہماری زبان اردو ناز کرتی رہے گی۔ محمد ﷺ شامل بالخلق اور واصل بالحق تھے۔ صلوٰۃ اور درود اُن پر۔ اُن کی آل پر۔ اُن کے اصحاب پر اور اُن کی اُمت پر۔

پروفیسر نعیم تقوی مرحوم نے نبی اکرم ﷺ کی حیات و سیرتِ طیبہ پر لکھنے سے پہلے وحی کے مفہوم کو واضح کر کے قاری کے لیے حضور نبی اقدس ﷺ کے کمالات و فضائل کو سمجھنے کے لیے ایک ذہنی فضا ہموار کی ہے۔ انیسویں صدی عیسوی میں برعظیم کے مسلمان مفکر اور اہلِ قلم و نظر مذہب اور سائنس کی تطبیق پر بہت زور دیتے تھے۔ جو دینی حقائق انھیں سائنس سے ہم آہنگ نظر نہ آتے، اُن کی عجیب و غریب تعبیر کرتے تھے۔ لیکن بیسویں صدی عیسوی کے رُبع آخر میں فضا بدل گئی اور آج سائنسی نظریات سے زیادہ بے اعتبار شاید ہی کوئی چیز ہو۔ وحی کے مفہوم کے سلسلے میں تقوی صاحب نے سائنس کے بارے میں لکھا ہے کہ ''وہ افراد غلطی پر ہیں جو سائنس سے مذہب کی توثیق کرتے ہیں۔ سائنسی نظریات تو بدلتے رہتے ہیں۔'' اور اُن کی یہ بات بھی درست ہے کہ ''سائنس پر ابھی حقائقِ فطرت پوری طرح آشکار کہاں ہوئے ہیں۔''

وحی کے مفہوم کو واضح کرنے کے لیے نعیم تقوی نے جبلت اور الہام سے بھی بحث کی ہے اور اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جب حیوانات کے لیے جبلت عقل و شعور کی قائم مقام ہے تو

انسان بلند تر سطح پر زندگی گزارتا ہے اور وحی تو عطیۂ کردگار ہے۔ ہمارے ہاں بعض ایسے صاحبان ہیں جو یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ وحی اُن خیالات کا مجموعہ ہے جو اللہ تعالیٰ پیغمبروں کے دلوں میں ڈال دیتے ہیں اور پیغمبر اپنے الفاظ میں انھیں اپنی اُمتوں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ نعیم تقوی نے نہایت واضح الفاظ میں اس خیال کی تردید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''حقیقت یہ ہے کہ قرآن حکیم جن الفاظ میں حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ذریعے قلب محمد ﷺ پر نازل ہوا تھا، اُسی طرح ہم تک پہنچا۔''

تقوی اعلی اللہ مقامہ، مرتبۂ حدیث سے بھی خوب واقف اور اُس پر قرآن کی شہادت لاتے ہیں:

> ''وحی غیر متلو وہ ہے جو صحیح احادیث کی صورت میں ہمارے پاس ہے۔ ویسے بھی نطق پیغمبر مرتبت ﷺ بغیر ہوا و ہوس ہوتا تھا جسے قرآن نے وحی قرار دیا ہے۔''

سیرت النبی (شبلی و سلیمان) کی سات جلدوں میں جو مضامین شرح و بسط کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں۔ وہ ''محمد رسول اللہ'' میں اختصار لیکن بہت وضاحت کے ساتھ آج کی زندہ زبان میں پیش کر دیے گئے ہیں۔ نبوت و رسالت کے مفہوم کو پیش کرتے ہوئے تقوی صاحب نے کہا ہے:

> ''نبوت اور رسالت پر اظہار خیال سے پہلے اور اس منصب کی اہمیت بیان کرنے سے قبل میں ضروری سمجھتا ہوں کہ آپ حضرات کی خدمت میں نبوت اور رسالت کے معنی پیش کروں تاکہ موضوع کو سلسلہ وار آگے بڑھا سکوں۔''

ان الفاظ سے ہمارے اُس خیال کو تقویت پہنچتی ہے کہ غالباً یہ کتاب تقریروں کا سلسلہ ہے جو کسی محفل میں کی گئیں اور انھیں لکھتے ہوئے مناسب ترمیم کی گئی، کیوں کہ ''محمد رسول اللہ'' خطباتِ مدراس کے قبیل اور انداز کی کتاب ہے، اسی لیے یہ کتاب اپنے پڑھنے والوں سے گفتگو کرتی نظر آتی ہے اور اسی لیے اس کے اثر میں اضافہ ہو گیا ہے۔

کتاب کے ابتدائی حصے میں انبیائے کرام کی بعثت کے مقصد کو بہت کامیابی سے

اور آسان انداز میں پیش کر دیا گیا ہے:

''انبیائے کرام اس لیے مبعوث ہوتے تھے کہ اُن کی ہدایت سے بنی نوع انسان دنیا میں کامیاب زندگی بسر کرے اور آخرت کو بھی سنوارے۔''

دیکھیے کتنے اختصار کے ساتھ دنیا اور آخرت کے رشتے کو پیش کر دیا گیا اور قرآن کی مختصر اور جامع ترین دعا کا مفہوم کس طرح واضح ہو گیا:

رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ (البقرہ:۲۰۱)

نبی اکرم ﷺ نے مسلمان کی دینوی زندگی میں بھی حسن، خیر وسعادت کے وہ رنگ بھر دیے ہیں کہ حقیقی اسلامی معاشرہ جنت کے ماحول کا دیباچہ معلوم ہوتا ہے۔

ان ابتدائی اور ضروری مباحث کے بعد نعیم تقوی مرحوم نے نبی اکرم ﷺ کے ''ظہور مقدس کے وقت انسانیت کی زبوں حالی'' کو بہت اختصار کے ساتھ ایک نئے اور فکری انداز میں پیش کیا ہے۔ عام طور پر لکھنے والوں نے اس سلسلے میں جزیرہ نمائے عرب اور دنیا کے دوسرے ممالک کے لوگوں کی بداعمالیوں کے نقشے پیش کیے ہیں: چوری، ڈاکا، فساد، بدنظمی، شراب، جوا، زنا اور عورتوں کی زبوں حالی۔ نعیم صاحب نے بداعمالیوں کی جگہ تمدن اور فکر و ذہن کی اُن گم راہیوں کو اپنے پڑھنے والوں کے سامنے پیش کیا ہے۔ جو نبی اکرم ﷺ کے ظہور اور بعث سے پہلے انسان کا مقدر بن چکی تھیں۔ انسانی تہذیب نے جو ترقی کی تھی وہ قصہ پارینہ بن چکی تھی۔ مصنف نے ایچ۔ جی۔ ویلز، رابرٹ بریفائٹ اور دوسرے مغربی مورخوں کے اقتباسات کی مدد سے یہ حقیقت بیان کی ہے کہ ''ایک بڑے تمدن کی گلی سڑی لاش'' کو انسانی تمدن کا نام دیا جا رہا ہے۔ روم کا شہرِ عظیم رومی سلطنت کا پایہ تخت تھا اور وہاں ۵۲۲ء میں ایک سال میں تیس ہزار سے زائد افراد قتل کیے گئے تھے۔

اس پس منظر میں حضرت محمد مصطفیٰ، احمد مجتبیٰ ﷺ دنیا میں تشریف لائے، آپ کی ولادت اور نام بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والے واقعات کی طرف اشاروں کا درجہ رکھتے ہیں۔ آپ ﷺ سے پہلے محمد کے نام کے بعض افراد کا پتا تاریخ سے ملتا ہے لیکن جناب عبدالمطلب نے

اپنے پوتے کو یہ نام دیا اور وہ پوتا ہر تعریف وستائش کا حق دار ٹھہرا اور محمد کے نام کو اپنے معانی مل گئے۔

پروفیسر نعیم تقوی مرحوم نے ظہورِ قدسی کے بعد نبی آخرالزماں علیہ الصلوٰۃ والسلام کا اجمالی مفہوم تحریر کیا ہے۔اس کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ربِ محمد ﷺ نے مصنف مرحوم کے دل ودماغ کو دعوتِ محمد ﷺ کی تفہیم کی دولت سے کس طرح مالا مال کیا ہے:

''تمام انسانیت کو خدا کی توحید سے جوڑا''

آج دنیا وحیِ الٰہی سے منہ موڑ کر خسران ونامرادی سے گزرتی ہوئی بہ ہزار خرابی ''وحدتِ اقوام'' تک پہنچی ہے جب کہ رسولِ عربی ﷺ نے وحدتِ نبی آدم کو اپنی تعلیمات سے ایک حقیقت بنا دیا۔اُن کی محفل میں حبشہ کے بلال اور روم کے صہیب کو ابوبکر وعمر، عثمان وعلی رضی اللہ عنہم کی سی تکریم اور عزت حاصل تھی،اور آج بلال کو سیّدنا بلال کہہ کر ہم اپنے قد وقامت کو بلند کرتے ہیں۔

اسی سلسلۂ کلام میں تقوی صاحب نے لکھا:

اسلام میں ہر قسم کی فرقہ واریت کو سختی سے ناپسندیدہ قرار دیا گیا ہے،کیوں کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے اس لیے ہر قسم کا تفرقہ ملت شکن ہوتے ہوئے اصولِ مذہب کے خلاف ہوتا ہے۔

تفرقہ کو ''ملت شکن'' کہہ کر تقوی مرحوم نے قوتِ بیان اور حسنِ کلام کی نہایت عمدہ مثال پیش کی ہے۔اللہ اور محمدؐ ہمارے ایمان کی اساس ہیں۔ان کو ماننا ناگزیر ہے اور امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام مالکؒ، امام حنبلؒ اور امام جعفر صادق رضی اللہ عنہم ہمارا انتخاب ہیں۔پھر ذرا اِن کی فقہوں کے اشتراک پر تو غور کیجیے۔حضرت امام جعفر صادق تو امام ابوحنیفہ کے استاد ہیں۔یہ ہماری بدنصیبی ہے کہ ہم اتحاد واتفاقِ فقہ ہائے اصول کو بھول کر اختلاف کے پہلو تلاش کرتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ خلوص اور علم پر قائم اختلافِ رائے ایک بڑی برکت ہے اور اس سے عمل کی راہیں کشادہ ہوتی ہیں۔شرط صرف یہ کہ ہماری نظر سرورِ کائنات ﷺ کے اسوۂ حسنہ پر رہے۔اگر

قرآنِ کریم کی تعلیمات اور حضور ﷺ کی زندگی ہمارے سامنے رہے تو تقوی مرحوم ومغفور کے الفاظ میں:

اگر احکامِ خداوندی کے تحت زندگی بسر کی جائے تو حیاتِ مستعار کا ہر لحہ عبادت میں شمار کیا جاسکتا ہے۔

اس سلسلے میں حقوق اللہ، حقوق العباد اور حقوق النفس سے بحث کر کے مصنف نے اسلامی زندگی کے تصور اور تصویر کو مکمل کر دیا ہے۔

قرآن مجید میں نبی اکرم ﷺ کی مدح وثنا کو تقوی مرحوم نے عجب انداز سے پیش کیا ہے۔ سرکار ختمی مرتبت کی ذاتِ گرامی قرآنِ ناطق تھی۔ جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کچھ اصحابِ رسول اللہ ﷺ نے کہا کہ کچھ سیرتِ پاک کے متعلق بتایئے تو اُم المومنین نے جواب دیا ''کیا تم نے قرآن نہیں پڑھا ہے؟'' یعنی قرآن مجید، سرورِ کونین علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سیرت ہے۔ قرآن حکیم کتابِ ہدایت ہے اور اُس میں سرکار ﷺ کی مدح وثنا کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ کی صفاتِ عالیہ اور سیرتِ مقدسہ حصولِ ہدایت کا ذریعہ ہے۔ دیکھیے! اس حقیقت کو مرحوم نعیم تقوی نے کس واضح مگر حسین اسلوب میں پیش کیا ہے:

حضور ﷺ کے فضائل وکمالات اور محاسن کو اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ زندگی کے حقائق بے نقاب ہوتے ہیں اور پیروئ ختمی مآب کی لگن دل میں فزوں تر ہونے لگتی ہے۔

حضور ﷺ نے ہمیں فضائلِ شخصیہ، فضائلِ اجتماعیہ، فضائلِ دینیہ، عرفانِ نفس، عرفانِ خداوندی اور تحریکِ عمل کی دولتِ بے مثال اس طرح عطا کی کہ آپ ایک ''ایسے روشن انقلاب کے بانی'' ٹھہرے جو جاوداں ہے اور ہر دور کی رہنمائی کر رہا ہے۔ اسلام صرف وقت اور زمانے کا ساتھ نہیں دیتا بلکہ انسان اور زمانے کی رہبری اور رہنمائی کے فرائض ادا کرتا ہے اور سرکارِ دو عالم ﷺ کی سیرت نے اسلام کو یہ قوت عطا کی ہے۔

تقوی مرحوم کی کتاب ''محمد رسول اللہ'' کے ابتدائی ابواب کا مختصر سا تعارف اوپر کی

سطروں میں پیش کیا گیا۔ ان ابواب میں جو فکری اور منطقی ربط ہے، وہ کم ہی کتابوں میں نظر آتا ہے۔

اس کے بعد سرکار ﷺ کی سیرت اور ذات کے مختلف پہلوؤں کو پیش کیا گیا ہے۔

''حضور ﷺ بحیثیت خطیب''، ''حضور ﷺ بحیثیت معلمِ اخلاق''، ''حضور ﷺ پیکر عدل و احسان''، حضور ﷺ بحیثیت منصف''، ''حضور ﷺ کا قائم کردہ معاشی نظام''، حضور ﷺ بحیثیت سیاسی مدبر''، ''محسنِ انسانیت بحیثیت سپہ سالار''، ''حضورِ اکرم ﷺ اور معراجِ عبدیت'' وغیرہ، اِن تمام تمام ابواب کا جائزہ پیش کرنے کو جی چاہتا ہے، لیکن میں آپ کے اور تقوی صاحب کے درمیان زیادہ دیر تک حائل نہیں رہنا چاہتا۔ ہر باب مختصر ہے مگر ہر لفظ، ہر جملہ دریائے معانی کے موتی کا درجہ رکھتا ہے اور غالبؔ کے الفاظ میں ہر لفظ ''گنجینۂ معانی کا طلسم'' ہے۔ یہ بھی نبی آخر الزماں اور کائنات کے فصیح ترین انسان کا فیض ہے۔ اُن کا تذکرہ اگر خلوص سے کیا جائے تو اللہ اسلوب کو ندرت، اظہار کو قدرت اور الفاظ کو معنی آفرینی عطا کرتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کو ربّ العزت نے ''جوامع الکلم'' کا معجزہ عطا کیا ہے۔ آپ ﷺ کے یہاں دو تین لفظوں میں جہانِ معنی سمٹ آتا ہے۔ آپ ﷺ کی احادیث قطرے میں سمندر کا حکم رکھتی ہیں۔ لطف یہ ہے کہ آپ کا اندازِ بیان مقرروں اور خطیبوں کے ساتھ ساتھ لکھنے والوں کی رہنمائی بھی کرتا ہے۔ حضور ﷺ کی خطابت میں معانی، اسلوب کا حسن، سادگی، جذبات و مفہوم کی فراوانی، احساس و جذبات کی پاکیزگی اور صداقت کا جلوہ اور ہم آہنگی نظر آتی ہے۔ تقوی مرحوم کے الفاظ میں:

حضورِ اکرم ﷺ کی قدم بوسی سے خطابت نے معراج پائی ہے۔

فصاحت اور ابلاغ، شرائطِ رسالت میں شامل ہیں، اسی لیے حضرتِ موسیٰؑ نے بارگاہِ ربّ کائنات میں دعا فرمائی کہ میرے بھائی ہارون (علیہ السلام) کو کارِ نبوت میں میرا شریک بنایا جائے کیوں کہ وہ مجھ سے زیادہ فصیح ہے اور ''میرے رب میری زبان کی گرہ کھول دیجیے۔'' حضور ﷺ کا کلام ابلاغ و فصاحت اور وضاحت کی بلند ترین سطح پر نظر آتا ہے اور نعیم تقوی کے بقول

''حضورِ اکرم ﷺ نے محض الفاظ کی رنگینی اور مفہوم کی جذباتیت کو نہیں اپنایا۔''

یہ مختصر سی کتاب نبی اکرم ﷺ کے جلوہ ہائے رنگ رنگ کا آئینہ خانہ ہے۔ آپ ﷺ کے اخلاق کے اثرات اہلِ بیت، اُمہات المومنین اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی سیرتوں میں دیئے جاتے ہیں۔ تقوی مرحوم اِس سلسلے میں لکھتے ہیں:

اُمہات المومنین نے جس سادگی اور ایثار سے زندگی بسر کی اُس سے تمام مسلمان عورتوں کو سبق لینا چاہیے۔ حضرت فاطمہ زہرا دخترِ رسول خدا ﷺ کا کردار قیامت تک مسلمان عورتوں کے لیے مشعلِ راہ ہے۔ بقولِ علامہ اقبالؔ:

مزرعِ تسلیم را حاصل بتول
مادراں را اسوۂ کامل بتول

ہمارے دور میں ملتِ اسلامیہ پارہ پارہ ہوگئی ہے۔ تفرقہ ہماری شناخت بن گیا ہے، دختر کشی اور تذلیلِ نسوانیت نئے انداز سے ہمارا چلن بن گئی ہے۔ علم اور عمل کا رشتہ ٹوٹ گیا ہے، خطابت محض لفاظی اور مترادفات کا تماشا بن گئی ہے۔ خطیب منبر پر اپنی ذات کا جادو جگاتا ہے اور سامعین کی تعلیمِ اخلاق سے اُس کو کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ اخلاق قصۂ پارینہ بن گیا ہے۔ عدل وانصاف محض کتابی الفاظ بن کر رہ گئے ہیں۔ نعیم تقوی مرحوم کی کتاب ''محمد رسول اللہ'' ہمیں اتحادِ ملت کا سبق یاد دلا رہی ہے۔ اُن کا قلم ہمیں احترامِ آدمیت ونسوانیت کا سبق دے رہا ہے۔ وہ ہمیں بتا رہے ہیں کہ علم وعمل کے بغیر انسان سازی نہیں ہوسکتی۔ وہ ہمیں عدل وانصاف کی کھوئی ہوئی دنیا کی بازیافت کی دعوت دے رہے ہیں اور ان سب مقاصد کے حصول کا ایک ہی ذریعہ اور راستہ ہے اور وہ ہے محمد ﷺ عربی کے راستے پر چلنا۔ یہی سیرتِ طیبہ کے مطالعے کا واحد مقصد ہے کہ ہم اپنی تخلیق کے مقصد کو سمجھ لیں اور یہی سیرتِ رسول ﷺ اکرم کی اہمیت ہے کہ وہ انسان کو اُس کا مقام اور راستہ یاد دلاتی ہے اور اُس تک پہنچنے میں ہماری رہنما بنتی ہے۔ میں اِس تحریر کو مصنف کے ان الفاظ پر ختم کرتا ہوں:

حضورِ اکرم ﷺ اُس مقامِ عبدیت پر فائز ہیں کہ بغیر احکامِ الٰہی کوئی کام نہیں کرتے، لہٰذا ہم پر اس عبدِ خاص کے اتباع کو لازم قرار دیا گیا ہے اور بشریت کی نجات بھی اسی میں ہے کہ وہ عبدِ خاص (حضور ﷺ) پر ایمان لائے۔

اللہ تعالیٰ مرحوم پروفیسر نعیم تقوی کی اِس کتاب کو اُن کے لیے اجرِ بے نہایت کا ذریعہ اور وسیلہ بنائے، جنت الفردوس میں اُنھیں نبی کریم ﷺ، صالحین اور شہدا کی رفاقت میسر آئے، آمین!

(''محمد رسول اللہ ﷺ، ۱۶؍ دسمبر ۲۰۰۵ء)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حسنِ تبسم

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حسنِ خلق نے معاشرے کو شگفتہ بنا دیا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا حسنِ تکلم اور خندہ جبینی دوستوں اور دشمنوں سب کے لیے یکساں نعمتِ الٰہی تھی، سورج کی روشنی اور بہار کی ہوا کی طرح۔

مولانا فیضی نے معتبر کتب احادیث سے وہ واقعات بڑے سلیقے سے جمع کر دیے ہیں، جن سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ اقدس پر تبسم کی کرنوں نے ضیا باری فرمائی۔ ان میں سے ہر واقعہ معروف اور عام مفہوم میں لطیفہ نہیں ہے، لیکن گہرے اور حقیقی معنوں میں لطائف ہیں۔ اگرچہ اُس میں مزاح کا کوئی پہلو نہیں ہے۔ واقعۂ موعظت بھی لطائف میں شامل ہے۔

کتاب کے شروع میں مزاح کی تعریف اور مزاح کے آداب کے علاوہ مزاح کے سلسلے میں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے اُسوۂ حسنہ کو بھی مختصراً بیان کیا گیا ہے۔

مزاح کے سلسلے میں عربوں کا محاورہ قولِ فیصل کا درجہ رکھتا ہے کہ المزاح فی الکلام کالملح فی الطعام۔ مزاح اُس سطح تک نہ پہنچے کہ انسان کے وقار اور کلام کے وزن کو متاثر کرے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مزاح زندگی کو آسان بنانے کا ایک نسخہ بھی تھا اور عام مسلمانوں کے لیے اس کی معنویت یہ ہے کہ اُن کے کلام میں دل پذیری ہو اور ہلکے پھلکے انداز میں کوئی نہ کوئی لطیفہ، کوئی نکتہ سامنے آسکے۔ عبادات ہوں، یا اخلاق، معاملات ہوں یا روزمرہ کی زندگی۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اندازِ زیست اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے ہمارے لیے بہترین نمونہ ہیں۔

(ششماہی ''السیرۃ'' شمارہ ۱۶، ستمبر ۲۰۰۶ء)

محاضرات سیرت

محاضرات قرآنی، محاضرات حدیث اور محاضرات فقہ کے بعد ڈاکٹر محمود احمد غازی نے محاضرات سیرت کا تحفہ اردو زبان وادب کو دیا ہے، یہ چاروں کتب ایک دوسرے سے پیوستہ ہیں، قرآن نے جو ہدایات دی ہیں اور انسان کامل کی جو صفات بیان کی ہیں ان کا عملی نمونہ نبی اکرم ﷺ تھے، اور آپ کو قیامت تک مسلمان معاشرے میں ''مثالی'' اور رول ماڈل کی حیثیت حاصل رہے گی۔ اللہ تعالیٰ نے اصول بیان فرمائے ہیں، نبی اکرم ﷺ نے ان ابدی اصولوں کی بنا پر ایک مثالی معاشرہ قائم فرمایا، اور احادیث اسی اسلامی معاشرے کی بنیاد ہیں، انکار حدیث کے فتنے کی سب سے بڑی قباحت یہ ہے کہ مسلمان اس معاشرے کی بازیافت نہ کرسکیں۔ فقہ قرآن وحدیث کی بنا پر اسلامی قوانین کو مرتب شکل دیتی ہے، ان اسلامی قوانین کی تجسیم سیرت محمد علیٰ صاحبہا الصلاۃ والسلام ہے۔

ان معروضات سے ان کتابوں کا باہمی رشتہ سامنے آسکتا ہے۔ یہ اسی کُل کے اجزا ہیں جسے ہم اسلام کہتے ہیں۔

استاد مرحوم ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے ایک بار اپنی تقریر میں فرمایا تھا کہ اسلام کے خلاف مستشرقین نے جو کچھ لکھا ہے اس کا نوے فیصد حصہ نبی اکرم ﷺ کے خلاف ہے۔ ہمارا دشمن ہم سے زیادہ اس بات کو جانتا ہے کہ اگر سیرت محمد ﷺ کو درمیان سے ہٹا دیا جائے تو مسلمان اپنی تعمیر کے ہر نقشے سے محروم ہو جائیں گے۔

ڈاکٹر محمد احمد غازی کے محاضرات سیرت میں علوم سیرت، منہاج سیرت اور علم سیرت کا تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے۔ علوم سیرت میں وہ تمام مباحث اور موضوعات سمٹ آئے ہیں، جن پر ختمی مرتبت ﷺ نے روشنی ڈالی ہے، اور علم سیرت وہ علم ہے جو آپ کی حیات طیبہ کا احاطہ کرے

ہے۔ سیرت اور علم سیرت کی بہترین تعریف برصغیر کے نامور عالم اور فقیہ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے فرمائی تھی۔

آنچہ متعلق بہ وجود پیغمبر ما ﷺ وصحابہ کرام وآل عظام است، واز ابتدائے تولد آں جناب تا غایت وفات، آں را سیرت گویند۔

''کہ رسول اللہ ﷺ کے وجود گرامی سے جو کچھ بھی متعلق ہے، آپ ﷺ کے صحابہ کرامؓ، اہل بیت اور آل عظام سے جو بھی چیز تعلق رکھتی ہے، رسول اللہ ﷺ کی ولادت مبارکہ سے لے کر اور آپ ﷺ کے دنیا سے تشریف لے جانے تک، ان سب کی تفصیل کو اسلامی علوم وفنون کی صطلاح میں سیرت کہتے ہیں۔'' (ص ۱۹)

محاضرات سیرت اس دائرے کے تمام مضامین کا احاطہ کرتے ہیں۔ مغربیوں نے سب سے پہلے حضور ﷺ کے نسب کے بارے میں ذہنوں میں شکوک پیدا کیے۔ سر ولیم میور کا نام اس سلسلے میں خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اور اسی کی ہرزہ سرائی نے ہمارے اہل قلم کو اس طرف متوجہ کیا۔ جس کا سلسلہ سرسید کے خطبات احمدیہ سے ڈاکٹر محمود احمد غازی کے محاضرات سیرت تک پھیلا ہوا ہے۔

نبی اکرم ﷺ کی حیات مبارکہ اور اسوۂ حسنہ کی مثال ایک عظیم الشان سلسلۂ کوہ کی سی ہے، جو جہاں سے دیکھتا ہے وہیں سے اسی سلسلۂ کوہ کے مناظر کو بیان کرتا ہے۔ حضور ﷺ کے احوال وکوائف کو محدثین گرامی نے پیش کیا۔ مورخوں نے اسے تاریخ کی کسوٹی پر پرکھا۔ فقہا نے آپ کی حیات سے فقہی اصول حاصل کیے، متکلمینِ اسلام نے آپ ﷺ کی ذات کو علم کلام کی بنیاد بنایا اور ادیبوں نے افصح العرب کی ذات کے حوالے سے ادبی اصول وضع کیے۔ ڈاکٹر محمود احمد غازی نے اپنے محاضرات میں مناہج سیرت کی توضیح وتشریح کی ہے، ان خطبات میں مختلف مقامات پر مختلف علوم کی تعریف بھی بیان کی گئی ہے۔ تعریف کا بیان کرنا ایک مشکل مرحلہ ہے اور محمود احمد غازی اس مرحلے سے کامیابی کے ساتھ گزرے ہیں، ان کی بیشتر تعریفیں جامع بھی ہیں اور مانع بھی۔ وہ علوم اسلام میں تداخل کے قائل تو ہیں لیکن ان علوم کے درمیان فصل قائم کرنے کا ہنر بھی خوب

اسوۂ حسنہ۔ انسانیت کا مستقبل

دنیائے اسلام کے رہبروں کے بیانات کو غور سے پڑھیے تو وہ سب صیغۂ مستقبل میں باتیں کرتے نظر آتے ہیں، ہمارا مستقبل شاندار ہے، ہم دشمنوں کو ناکام بنادیں گے، ہماری صفوں میں اتحاد ہوگا، وغیرہ وغیرہ۔ ان حضرات نے زمانہ حال، اس کے تقاضوں اور اس کی کامرانیوں کو غیروں کے سپرد کر دیا ہے، اس اندازِ فکر کے متعلق یہی کہا جاسکتا ہے۔

وہ قوم نہیں لائقِ ہنگامۂ فردا
جس قوم کی تقدیر میں امروز نہیں ہے

مستقبل کا درخت بھی ماضی کی زمین پر حال کے بیج سے اُگتا اور پروان چڑھتا ہے۔

زیرِ نظر کتاب مسائلِ امروز سے متعلق ہے، اور وہ بھی ایک ابدی حوالے سے، یہ ابدی حوالہ ہادیٔ نوعِ بشر محمد مصطفیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سیرت طیبہ، تعلیمات اور اسوۂ حسنہ ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے وجود مبارک نے ان کے عہد کو خیر القرون بنایا۔ اور اسی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ جیسے تمام آنے والے زمانے اس عہد میں اکٹھے ہوگئے۔ انسانی زندگی کے کسی امکان کے بارے میں غور کیجیے، کسی صورت حال کے بارے میں غور کیجیے تو وہ اسی زمانے میں نظر آجائے گی، اللہ تعالیٰ نے تمام زمانوں کو اس ایک عہد میں سمیٹ دیا۔ یہی وہ نکتہ ہے، جس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ کس طرح آپ ﷺ کی سیرت مبارک تمام انسانی مسائل پر منطبق کی جاسکتی ہے۔

اس مجموعے کا پہلا مضمون (میری ترتیب کے مطابق) جس سے میں اپنی گفتگو کا آغاز کرنا چاہتا ہوں، ''نئے عالمی نظام کی تشکیل'' ہے، قرآن مجید کا ارشاد ہے: **نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا** (۱) اللہ تعالیٰ زمین کو اس کے کناروں سے سمیٹ رہا ہے۔ اس عمل میں دوسروں کی سازشیں

عین مقصد خداوندی کے مطابق ہیں، زمین سمٹتی جارہی ہے، تا کہ اللہ تعالیٰ مکذبین کا انجام انھی کے ہاتھوں کرے، نئے عالمی نظام کی تشکیل اسی سمت ایک قدم ہے۔ عزیز الرحمٰن صاحب نے تاریخی تناظر میں یہ بات واضح کردی ہے کہ یہ ماضی تخریب کی داستان نہیں ہے، بلکہ اس نئے عالمی نظام کی تشکیل کا ابتدائی نقش ۱۹۱۷ء میں قائم ہوا۔ اس عالمی صورت حال کو دوسرے لفظوں میں صیہونی اثر ونفوذ کی کاوش قرار دیا جاسکتا ہے، پچھلی صدی کے آغاز سے فرنگ کی رگ جاں پنجۂ یہود میں ہے، یہ عالمی نظام اللہ اوراس کی منشا سے جنگ کے مترادف ہے، منشائے خداوندی یہی ہے کہ اسلام تمام ادیان پر غالب آکر رہے گا، خواہ یہ بات مشرکین پر کیسی ہی گراں گزرے، اوراس ربانی پیش گوئی کے پورا ہونے کے لیے اہل ایمان سے کہا گیا ہے کہ یہود ونصاریٰ کو دوست نہ رکھو، کیوں کہ وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں، (۲) اس عالمی نظام کے جو پہلو ہم پر واضح ہورہے ہیں، ان میں سے پہلا گلوبلائزیشن کرۂ ارض پر تسلط ہے، یہ تسلط ابلاغ عامہ، مالیات اور ثقافت پر تسلط کے مجموعے کا نام ہے۔

عزیز الرحمٰن صاحب نے اعداد وشمار کے ذریعے ان مختلف پہلوؤں پر صیہونی تسلط کو پیش کیا ہے، اوراس پس منظر کو جاننے کے بعد امت مسلمہ کو اس کی ذمے داریاں یاد دلائی ہیں، ان ذمے داریوں میں سے پہلی ذمے داری یہ ہے کہ:

به مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی ست

مصطفیٰ ﷺ تک پہنچنے کا پہلا قدم یہ ہے کہ ہمارے اعمال وافعال وقت کے تقاضوں کے تابع نہ ہوں، بلکہ اسوۂ حسنہ کے تابع ہوں، یہی مسلمان کی بازآفرینی کا نسخہ ہے، یوں ہی مسلمان اس نام نہاد عالمی نظام کے تاروپود کو بکھیر سکتا ہے اور انسان کو انسان کی غلامی سے نجات دلا سکتا ہے۔

اس مجموعے کا دوسرا مضمون ''عہد حاضر میں مذہبی انتہا پسندی کا رجحان اور تعلیمات نبوی ﷺ کی روشنی میں اس کا خاتمہ'' اسی تصویر کے ایک پہلو کی تفصیل ہے، یہ مذہبی انتہا پسندی نئے عالمی نظام کی انتہا پسندی سے پیدا ہوئی ہے، جس کے تحت امریکہ دنیا کی واحد طاقت بن کر سامنے آیا

ہے، اور جس کے نتیجے میں مغربی لبرل ازم اور مغربی جمہوریت کے سائے دنیا پر پھیل گئے۔ امریکہ کی بالادستی اس کے طرزِ فکر اور طرزِ حکومت کی بالادستی ہے، اسی بالادستی نے دوسرے نظاموں کے ماننے والوں کے درمیان مایوسی پیدا کر دی ہے، مایوس آدمی کا کوئی مستقبل نہیں ہوتا، اسی لیے وہ امید سے محروم ہوتا ہے اور جہاں امید نہ ہو وہاں زندگی کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی۔ جس کے نتیجے میں تشدد پیدا ہوتا ہے، یہ بنیاد پرستی درحقیقت عالمی نظام کی بنیاد ہے، جس نے ایک بنیاد پرستانہ یہودیت کو جنم دیا ہے، بنیاد پرستانہ یہودیت ہی عالمی امن کے لیے خطرہ ہے، اور یہ خطرہ اب مغربی پٹی اور غزہ کی حدود کو پھلاندتا ہوا ساری دنیا کے لیے مسئلہ بن چکا ہے، جس کی تباہ کاریاں عراق کے ریگستانوں اور افغانستان کے پہاڑوں میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات اس انتہا پسندی کی نفی ہی نہیں کرتیں بلکہ اس کی جڑ کاٹ دیتی ہیں، ان تعلیمات کے تحت انسان کو مذہبی اور فکری آزادی نصیب ہوتی ہے، اور سب سے بڑھ کر یہ تعلیمات وحدتِ آدم اور احترامِ آدم کی بنیادیں ہیں، وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ (۳) کی آواز پندرہ صدیوں سے عظمتِ انسان کا اعلان ہے۔ صدیوں کے خسران کے بعد انسانیت اب وحدتِ اقوام کی منزل تک آئی ہے، جب کہ اسلام وحدتِ آدم کا نقیب ہے، اس نکتے کو سمجھ لیا جائے تو ہر قسم کی انتہا پسندی اور تفریق ختم ہو جاتی ہے، اقبال کے الفاظ میں:

مکے نے دیا خاکِ جنیوا کو یہ پیغام
جمعیتِ اقوام کہ جمعیتِ آدم؟

خاکِ جنیوا کی جگہ جب نیو یارک نے لے لی تو جمعیتِ آدم کی منزل اور دور ہو گئی، لیکن بہرحال طوعاً کرہاً دنیا کو اپنے رب کی منشا کی طرف لوٹنا ہی پڑے گا۔ تعلیماتِ محمدی ﷺ اسی منشا کی تکمیل کا راستہ ہے۔

عدم برداشت کے رجحان کا اس سے بڑا مظہر اور کیا ہو سکتا ہے کہ جمہوریت کو قبول کرنے کے لیے ایک لاکھ سے زیادہ عراقیوں کو زمین کا پیوند بنا دیا گیا، اور جمہوریت کی صبحِ انتخابات کے موقع

پر شہروں میں کرفیو کے ساتھ طلوع ہوئی، ایک ہزار سے زیادہ امریکی سپاہیوں کا مارا جانا بظاہر ایک لاکھ عراقیوں کی موت کے سامنے معمولی نظر آتا ہے، لیکن یہ ارض فولاد میں زلزلے سے کم نہیں، اور یہ زلزلہ فکری ہے، جس سے عدم برداشت کے اس امریکی رجحان کا خاتمہ ممکن ہو سکے گا، جسے انسانیت کی فلاح قرار دیا جا رہا ہے۔ عجیب بات ہے کہ فوج کشی کو انسانیت کی فلاح قرار دیا گیا ہے، جمہوریت بھی ایک دین ہے، اور محمد عربی ﷺ کا پیغام ہے کہ: لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (۴) یہی پیغام عدم برداشت کا علاج ہے، عزیز الرحمٰن نے نہایت تفصیل اور منطقی ترتیب اور تاریخی تناظر کے ساتھ عدم برداشت کا علاج تعلیمات نبوی ﷺ کی روشنی میں پیش کیا ہے۔

ان مقالوں کے بعد جو دوسرے مقالے ہیں وہ صرف موجودہ مسائل سے متعلق نہیں، بلکہ انسانی معاشرے کی بنیادی ضروریات، انسانی شخصیت کے عناصر ترکیبی اور انسان کی رہنمائی سے متعلق ہیں، یہ مسائل عصری بھی ہیں اور آفاقی بھی، اس مجموعے کے باقی مضامین عصری ہوتے ہوئے بھی آفاقی ہیں، یہ تعمیر شخصیت، انسان کے مجموعی رویّے اور تعلیمی نظام کے بارے میں ہیں، شخصیت کی تعمیر کے لیے ایک مثال اور معیار کی ضرورت ہے۔ ایک ایسے نمونے کی جس کے مطابق انسان اپنے آپ کو ڈھال سکے، آج کی زبان میں رول ماڈل کہہ لیجیے، جب انبیائے کرام علیہم السلام کو ہر دور میں مسلم اول قرار دیا گیا، تو اس طرف اشارہ تھا کہ مسلم اول تمام مسلموں کے لیے رول ماڈل ہوگا، نبی اکرم ﷺ کا دورِ نبوی سے لے کر قیامِ قیامت تک کا دور ہے، اور اس طویل عرصے میں انسانوں کے لیے اطاعت رسول ﷺ کی عملی ضرورت ہے، یہ بات محض عقیدے تک محدود نہیں، بلکہ انسان کی ضرورت ہے، جسے دین کی اصطلاح میں یوں کہہ لیجیے کہ:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (۵)

یعنی رسول کی زندگی تمہارے لیے رول ماڈل ہے، اصطلاحات بدلتی جائیں گی، اصطلاحات کا غلبہ ہوتا جائے اور ان تمام اصطلاحات کے درمیان یہ دائمی اصطلاح قائم رہے گی، اسوۂ حسنہ۔

یہ کتاب ایک بڑی حقیقت کی امانت دار ہے، اور اسی سے انسانیت کی فلاح وابستہ ہے، جب انسانیت کا مستقبل سیرت طیبہ اور اسوۂ حسنہ سے وابستہ ہے تو ظاہر ہے کہ استحکام پاکستان کا رشتہ بھی اسی سے قائم ہے۔ آج پاکستان کی اجتماعی زندگی پر نظر ڈالیے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ ہمارا مسئلہ نہ سیاست ہے، نہ معیشت ہے، بلکہ کردار ہے۔ آج پوری قوم بلکہ دنیا بحران کردار سے گزر رہی ہے، ایک اخلاقی بحران جو کردار اور سیرت کے بحران سے پیدا ہوا ہے، اس کا علاج اس نظام تعلیم کے اجرا پر منحصر ہے، جو تعلیمات نبوی ﷺ کے مطابق ہو، وہ نظام تعلیم جو انسانوں میں خشیت الٰہی پیدا کرے، یہی خشیت الٰہی علم کی شناخت اور عالم کی پہچان ہے، اسی سے اشیا کا ادراک ہوتا ہے، ایک کلی ادراک، جس سے کائنات کی تفہیم بھی ہوتی ہے، مقصد تخلیق کائنات کی تفہیم بھی ہوتی ہے اور جس سے انسان کو کائنات میں اپنی حیثیت کا علم ہوتا ہے۔

اس کتاب میں یہی اہم مضامین سیرت کے حوالے سے آپ کی خدمت میں پیش کیے گئے ہیں، آپ یقیناً اس کتاب کو ایک خیال افروز اور خیال افزا کتاب پائیں گے۔ محمد مصطفیٰ ﷺ کا اسم گرامی اس صبح کی نوید اور اشارہ ہے، جس کی تقدیر میں غروب نہیں ہے۔

اللھم صلی علی محمد وال محمد

(''تعلیماتِ نبوی اور آج کے زندہ مسائل''، مئی ۲۰۰۵ء)

حواشی

(۱) الرعد:۴۱

(۲) المائدہ:۵۱

(۳) بنی اسرائیل:۷۰

(۴) البقرہ:۲۵۶

(۵) الاحزاب:۲۱

درسِ سیرت درسِ ایمان ہے

آج سے کوئی تیس پینتیس سال پہلے سینٹ مائیکل اسکول میں سیرت کا ایک جلسہ تھا۔ اسکول کے پرنسپل نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ آج پاکستان بنے تینتیس سال گزر گئے، اگر پاکستانی مسلمانوں نے ہر سال اپنے آقا رسول ﷺ کے اخلاق حسنہ میں سے کسی ایک اخلاق کو اپنایا ہوتا تو پاکستان کی وہ صورت نہ ہوتی جو آج ہے، اور یہ کہتے ہوئے اُس نے سیرت النبی سے نبی اکرم ﷺ کے اخلاق حسنہ کے عنوانات بتانا شروع کردیے۔ یہ گزرا ہوا واقعہ مجھے اکثر یاد آتا ہے، اور آج پاکستان کے برے حالات کو دیکھ کر میں یہی سوچنے لگتا ہوں۔

آج باتیں معاشی خوش حالی اور تجارت کے فروغ کی ہورہی ہیں، اوران سرگرمیوں پر میرا تبصرہ صرف اتنا ہے کہ:

زوال بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں

ہم اصل میں اخلاق کے بحران سے گزر رہے ہیں، ہمارے حالات کم وبیش ویسے ہی ہیں جیسے عہدِ مغلیہ کے زوال کے وقت تھے۔ باہمی اختلافات، قبر پرستی، نواہی ومنکرات کے ارتکاب پر افسردہ نہیں بلکہ بعض حالات میں فخر کا اظہار، اور یہ سب کچھ ہادیٔ برحق ﷺ کی سنت اور اخلاق سے دوری کا سبب ہے، میری ناچیز رائے میں یہ وقت اسلام پر دقیق علمی مباحث کا نہیں ہے، بلکہ ہمارے اہل قلم کو اس بات کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے کہ دلوں میں اخلاق محمد ﷺ کی جوت پیدا ہوسکے۔

ہمارے دل رسول اللہ ﷺ کے طریق حیات سے دوری کے سبب مرچکے ہیں اور اب احیائے فرد وملت کا ایک ہی راستہ ہے:

دل مردہ دل نہیں ہے، اسے زندہ کر دوبارہ
کہ یہی ہے اُمتوں کے مرضِ کہن کا چارہ

اقبالؔ

الحمدللہ، سید عزیز الرحمٰن نے نوعمری ہی میں اپنے ذہن، اپنی فکر اور اپنے قلم کو اذکارِ محمد ﷺ کے لیے وقف کر دیا ہے، یہ اُن کے ایمان کی شہادت بھی ہے، اور شجرۂ نسب کی دستاویز بھی۔

حضرت مولانا سید زوّار حسین شاہ کی تحریروں کی روح اتباعِ محمد ﷺ کی تلقین ہے۔ سید فضل الرحمٰن نے ''ہادیِ اعظم'' اور ''فرہنگِ سیرت'' کی صورت میں سیرت کے ادب میں نئی جہات پیدا کی ہیں، اور سید عزیز الرحمٰن نے آج کے محاورے اور زبان کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ذات و اخلاقِ محمد ﷺ کے کتنے ہی گوشوں کو پیش کیا ہے۔ خاندان اور بالخصوص عزیز الرحمٰن صاحب بجا طور کہہ سکتے ہیں:

تیری پشت ہے سرکارؐ کی مداحی میں

عصری زندگی میں سرکارِ دو عالم ﷺ کا ذکر اگرچہ زینتِ محراب و منبر کی محدود ہے، لیکن بعض تقریبات کا ایک فائدہ یہ ضرور ہوا ہے کہ سیرت کے ادب میں تنوع اور وسعت پیدا ہوتی جا رہی ہے۔ ان تقریبات میں قومی سیرت کانفرنس بھی شامل ہے، اس کانفرنس کے سالانہ اجلاسوں کے لیے عزیز الرحمٰن نے جو مقالات لکھے، اور جن پر انھیں اعزازات بھی ملے، وہ ''تعلیماتِ نبویؐ اور آج کے زندہ مسائل'' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ اب سے قیامت تک کا زمانہ عہدِ محمدی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام ہے:

تجھ سے پہلے کا جو ماضی تھا وہ لاکھوں کا سہی
اب سے تا حشر جو فردا ہے وہ تنہا تیرا

احمد ندیم قاسمی

عزیز الرحمٰن صاحب کے ان مضامین کا حوالہ ہم سب کی زندگی ہے، اور اُن سے یہ

ذکرِ نبی ﷺ اُردو ادب میں

معروف نقاد، محقق، مولف و مدوّن، نعت شناس، سیرت نگار اور معلّم پروفیسر ڈاکٹر سید محمد ابوالخیر کشفی (۱۹۳۲ء۔۲۰۰۸ء) کا شمار عہدِ حاضر کے ان اہلِ قلم اور اربابِ علم و فضل میں ہوتا ہے جو اردو ادب میں اپنی ایک جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں۔

''ذکرِ نبی ﷺ اردو ادب میں'' کشفی صاحب کی اُن تحریروں کا مجموعہ ہے جو اُنھوں نے مختلف نعتیہ مجموعوں، نعتیہ انتخابوں اور مختلف سیرت کی کتابوں پر پیش لفظ، مقدمے اور تقاریظ کے طور پر تحریر کیں۔ اس کے علاوہ اردو میں سیرت نگاری اور اسلامی معاشرے میں شاعری اور اردو میں نعت گوئی کی روایت اور رجحانات پر بھی مضامین اس میں شامل ہیں۔ یہ کتاب اپنے اسلوبِ بیان اور نقدِ نعت کا عمدہ نمونہ ہونے کے ساتھ ساتھ تحقیق و تنقید کی فکری و بصیرت افروز تحریروں کا مجموعہ ہے۔ مجموعی طور پر اس کتاب میں کشفی صاحب کی ۵۳ تحریریں ہیں جو کہ ۳۰۰ صفحات پر محیط ہیں۔ بقولِ کشفی صاحب ہی کہ ''اختصار ایک مشکل فن ہے اور یہ لفظوں کی قیمت شناسی سے پیدا ہوتا ہے''۔ لفظ کی قیمت شناسی کا یہ ہنر اس کتاب میں آپ جا بجا بکھرا ہوا پائیں گے۔

BOOKS GIVE US WINGS · NATIONAL BOOK FOUNDATION

Price: Rs.220/-

یہ کتاب مُلک بھر میں نیشنل بک فاؤنڈیشن کے درج ذیل 24 آفس / بک شاپس / آؤٹ لیٹس پر دستیاب ہے

- **اسلام آباد**
  - (1) این بی ایف صدر دفتر بک شاپ: 6۔ ماؤ ایریا، تعلیمی چوک، G-8/4، اسلام آباد فون: 051-9261125
  - (2) این بی ایف کلب بک شاپ: اسلام آباد کلب، نزد کشمیر چوک، مین مری روڈ، اسلام آباد فون: 051-9046242
  - (3) این بی ایف بک شاپ 'معیمر کتاب': F-7 مرکز، جناح سپر مارکیٹ، اسلام آباد فون: 051-2653677
- **راولپنڈی**
  - (4) این بی ایف ریلوے بک اسٹال: پلیٹ فارم نمبر 3، ریلوے اسٹیشن، راولپنڈی کینٹ فون: 0333-5756891
- **لاہور**
  - (5) این بی ایف ریجنل آفس و بک شاپ: بلڈنگ نمبر 1، لوئر گراؤنڈ فلور، ایوانِ اقبال کمپلیکس، ایجرٹن روڈ، لاہور
    فون: 5-042-99203863 فیکس نمبر: 042-99203866
  - (6) این بی ایف ٹریولرز بک کلب / شاپ: ڈومیسٹک ڈیپارچر لاؤنج، علامہ اقبال انٹرنیشنل ایئرپورٹ، لاہور
    فون: 042-36628545
  - (7) این بی ایف ریلوے بک اسٹال: پلیٹ فارم نمبر 4، ریلوے اسٹیشن، لاہور فون: 0305-4204202
- **واہ کینٹ**
  - (8) این بی ایف بک شاپ: سنٹرل لائبریری بلڈنگ، POF، واہ کینٹ (Premises) فون: 051-9314004
- **فیصل آباد**
  - (9) این بی ایف بک شاپ: دکان نمبر 10، ہاشمی ہال شاپنگ سنٹر، زرعی یونیورسٹی، فیصل آباد فون: 041-2648179
- **ملتان**
  - (10) این بی ایف آفس و بک شاپ: 6-5-4، ایم۔ ڈی۔ اے روڈ، نزد ملتان آرٹس کونسل، ملتان فون: 061-9201281
  - (11) این بی ایف ریلوے بک سٹال: پلیٹ فارم نمبر 3، ریلوے اسٹیشن، ملتان کینٹ فون: 0301-7556886
- **پشاور**
  - (12) این بی ایف ریجنل آفس و بک شاپ: پلاٹ نمبر 37-36، سیکٹر B-2، فیز 5، حیات آباد، پشاور
    فون: 091-9217273 فیکس نمبر: 091-5892744
- **ایبٹ آباد**
  - (13) این بی ایف بک شاپ: فرسٹ فلور، پبلک لائبریری، جلال بابا آڈیٹوریم، ایبٹ آباد فون: 0992-9310291
- **ڈیرہ اسمٰعیل خان**
  - (14) این بی ایف بک شاپ: گورنمنٹ اسلامیہ ہائر سیکنڈری سکول نمبر 2، سرکلر روڈ، ڈی آئی خان فون: 0336-7221016
- **کراچی**
  - (15) این بی ایف ریجنل آفس و بک شاپ: این بی ایف، بریل کمپلیکس بلڈنگ، نزد پی ٹی وی اسٹیشن، اسٹیڈیم روڈ، کراچی
    فون: 021-99231762 فیکس نمبر: 021-99231089
  - (16) این بی ایف ٹریولرز بک کلب / شاپ: ڈومیسٹک ڈیپارچر لاؤنج، جناح انٹرنیشنل ایئرپورٹ، کراچی فون: 021-99248432
  - (17) این بی ایف ریلوے بک اسٹال: پلیٹ فارم نمبر 7-8، کینٹ ریلوے اسٹیشن، کراچی فون: 0344-3102536
- **سکھر**
  - (18) این بی ایف بک شاپ: پبلک لائبریری، اولڈ سکھر فون: 071-9310892
  - (19) این بی ایف ریلوے بک سٹال: پلیٹ فارم نمبر 3-4، ریلوے اسٹیشن، روہڑی، ضلع سکھر فون: 0307-2952608
- **حیدرآباد**
  - (20) این بی ایف بک شاپ: یونیورسٹی آف سندھ (اولڈ کیمپس)، گاڑی کھاتہ، حیدرآباد فون: 022-9200251
- **خیرپور**
  - (21) این بی ایف بک شاپ: اسٹوڈنٹ سروس سنٹر، شاہ عبداللطیف یونیورسٹی، خیرپور فون: 0334-3277735
- **لاڑکانہ**
  - (22) این بی ایف بک شاپ: مین گیٹ، شہید محترمہ بے نظیر بھٹو میڈیکل یونیورسٹی، لاڑکانہ فون: 074-9410229
- **جیکب آباد**
  - (23) این بی ایف بک شاپ: ریڈ کریسنٹ بلڈنگ، ڈی سی او چوک، قائد اعظم روڈ، جیکب آباد فون: 0722-921045
- **کوئٹہ**
  - (24) این بی ایف ریجنل آفس و بک شاپ: مکان نمبر 9/9-3، نتھا سنگھ اسٹریٹ، کوئٹہ
    فون: 081-9201570 فیکس: 081-9201869

نیشنل بک فاؤنڈیشن
(حکومتِ پاکستان)

صدر دفتر: 6۔ ماؤ ایریا، تعلیمی چوک، G-8/4، اسلام آباد فون: 9261533، 051-2255572 فیکس نمبر: 051-2264283
ای میل: books@nbf.org.pk ویب سائٹ: www.nbf.org.pk